DEVELOPMENT OF AUTO-BIOGRAPHICAL LITERATURE IN ARABIC SINCE 1952 A.D

ABSTRACT

Thesis Submitted For the Degree of

Doctor of Philosophy

IN

ARABIC

BY

SAFDER SULTAN

T-4402

Under the Supervision of

Prof. Mohd. Rashid

DEPARTMENT OF ARABIC
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY
ALIGARH (INDIA)

1993

عربی زبان میں

خود نوشت سوانحی ادب کا ارتقاء

(۱۹۵۲ء کے بعد سے اب تک)

تلخیص مقالہ

برائے پی ایچ، ڈی

مقالہ نگار

صفدر سلطان

نگران

پروفیسر محمد راشد

شعبۂ عربی

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

۱۹۹۳ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم ٥

شکر ہے اس اللہ کا جس نے ہمیں پیدا کیا اور نطق و گویائی کی صلاحیت سے بہرہ ور کیا، درود و سلام ہو اس نبی آخر صلی اللہ علیہ وسلم پر جس کے ذریعہ ہم تک اللہ کا پیغام پہنچا، جو عربی مبین میں ہے اور جس میں ہمارے لئے تا قیامت رشد و ہدایت کا سامان ہے۔

وبعد! یہ مقالہ جسے میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ عربی میں پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لئے پیش کر رہا ہوں "عربی زبان میں خود نوشت سوانحی ادب کا ارتقاء سنہ ۱۹۵۲ء کے بعد" کے موضوع پر مشتمل ہے۔ اسمیں میں نے اپنی حد تک خود نوشت سوانح نگاری کے فن، عربی زبان کے قدیم سرمایے میں اس کے وجود اور اس کی شکلوں، انیسویں اور بیسویں صدی کے نصف اول میں اس کے ارتقائی مراحل، نمایاں خصوصیات اور آئندہ کے امکانات نیز سنہ ۱۹۵۲ء کے بعد مطبوعہ چند اہم عربی خود نوشت سوانح کا تفصیلی تعارف پیش کیا ہے۔ موضوع کافی وسیع، اہم اور تحقیق طلب تھا، اس لئے میری یہ کوشش محض میری حد تک اس لئے اطمینان بخش ہے کہ میں ہندوستان میں رہتے ہوئے اس موضوع سے متعلق جو کچھ مواد حاصل کر سکا تھا، اسے منظم اور مرتب انداز میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔ اس تحقیقی مقالے کو میں نے چار ابواب اور ان کی بعض ذیلی فصلوں میں تقسیم کیا ہے۔ ابتدا کے تین ابواب قدرے مختصر ہیں اور ان کی نوعیت موضوع تحقیق کے پس منظر کی ہیں۔ آخری باب جو مقالے کے کل صفحات کے نصف سے زیادہ پر مشتمل ہے اصل

موضوع سے متعلق ہے اور یہی اس مقالے کی روح ہے۔

اس کے پہلے باب میں فن خود نوشت سوانح عمری کی تعریف، محرکات، اہمیت فنی سانچہ اور اہم اجزائے ترکیبی پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ بتایا گیا ہے کہ فن خود نوشت ایک قدیم صنف سخن ہے، اس کا تعلق اظہار ذات کی ان کوششوں سے ہے جو انسان عرصۂ دراز سے اپنے جذبۂ نمود و نمائش کی تسکین کیلئے انجام دیتا رہا ہے۔ اس صنف کا نمایاں امتیاز یہ ہے کہ اس سے کسی فرد کی زندگی کے اہم مراحل خود اس کے قلم سے اس طرح واضح ہو جاتے ہیں کہ ان سے اس کی زندگی کے خارجی اور داخلی عکس بالکل صاف نظر آتے ہیں اور کسی حد تک اس عہد کی بھی تصویر جھلکتی نظر آتی ہے۔ اپنے بارے میں پیدا شدہ غلط فہمیوں کا ازالہ کرنا، اپنے کارناموں سے واقف کرنا، نئی نسل کے سامنے اپنے تجربات و مشاہدات کی تفصیل پیش کر کے انھیں صحیح سمت سفر کی طرف متوجہ کرنا اور اپنے سیاہ کارناموں کا اعتراف کر کے اپنے احساس ندامت کو کم کرنا، یہ کچھ اہم محرکات ہیں جو اپنی سوانح لکھنے کے لئے انسان کو مجبور کرتے ہیں۔ چونکہ خود نوشت سوانح عمری میں انسان کے تاثرات و محسوسات ایک دوسرے تک منتقل ہوتے ہیں، اس سے انسان کی پیچیدہ نفسیاتی گتھیوں کا حل معلوم ہوتا ہے اور یہ مصنف کے ذاتی احوال کے علاوہ اس کے زمانے کے حادثات و واقعات اور شخصیات و تحریکات کے بارے میں بھی مفید معلومات فراہم کرتی ہیں، اس لئے ان کی اہمیت و افادیت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ ایک بہترین خود نوشت سوانح عمری کے لئے ضروری ہے کہ وہ مصنف کی زندگی اور اس کی شخصیت کی صحیح عکاسی کرے اس کا انداز پیشکش خوبصورت اور زبان و بیان شیریں ہو اور اسمیں سچائی اور فن کے لحاظ سے کوئی کمی نہ پائی جاتی ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک مشکل کام ہے، لیکن جرأت و ہمت اور عزم و حوصلہ

سے اگر اسے انجام دینے کی کوشش کیجائے تو ناممکن نہیں ہے۔

پہلے باب میں یہ حقیقت بھی واضح کی گئی ہے کہ سوانح نگاری کا فن، خودنوشت سوانح نگاری سے پہلے وجود میں آیا ہے اس لئے اس پر اس کے گہرے اثرات و نقوش ہیں اور اس کے بہت سے اصول و ضوابط اس سے ماخوذ اور مستفاد ہیں لیکن اس کے باوجود صداقت، اظہار ذات اور بعض دوسرے پہلوؤں سے دونوں میں نمایاں فرق ہے اور اس فرق کی وجہ سے دونوں کی افادیت اور اہمیت بھی ایک دوسرے سے الگ اور مختلف ہے۔ اس باب میں یہ بھی بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ خودنوشت سوانح حیات فن کا ایک اہم حصہ اور ادبی کارنامہ ہے۔ فن اظہار ذات کا دوسرا نام ہے اور چونکہ خودنوشت سوانح حیات کا انسان کے داخلی جذبات سے بڑا گہرا تعلق ہوتا ہے اس لئے اسے فن کی اعلیٰ اقدار میں شامل کیا جاتا ہے۔ ایک بہترین آپ بیتی کیلئے یہ ضروری ہے کہ اسمیں حقائق کا جامع اور مختصر انداز میں تحلیل و تجزیہ کیا گیا ہو اور اس کے ساتھ ہی خیالات و تصورات کی دنیا میں بقدر ضرورت سیر کی گئی ہو۔ خودنوشت کیلئے یہ مناسب ہے کہ اسے اس وقت تحریر کیا جائے جب مصنف کے تجربات ہر لحاظ سے مکمل اور پختہ ہو جائیں اور ان کی وجہ سے اس کے اندر ایک طرح کا فنی اضطراب پیدا ہو جائے۔ اس کے لئے صفحات، طرز تحریر، ضمائر کے استعمال اور طول وغیرہ کی کوئی قید نہیں ہے۔ جو چیز اصل مطلوب ہے وہ یہ ہے کہ مصنف اپنی داخلی زندگی کی اس طرح سے تصویر کشی کر دے کہ خارجی زندگی کی جھلکیاں بھی اسمیں صاف طور سے نظر آتی ہوں۔ دنیا کی تمام زبانوں میں خودنوشت کے علاوہ بھی اظہار ذات کی بعض دوسری اصناف سخن ہیں ان میں روزنامچہ مکتوب نگاری، سفرنامہ، سرگزشت نگاری اور رپورتاژ نگاری خاص طور سے اہم ہیں۔ خودنوشت سوانح عمریاں اپنے موضوع اور مواد کے اعتبار سے کئی طرح کی ہوتی ہیں۔ ان میں اہم مذہبی، علمی، ادبی، سیاسی

سماجی خود نوشت سوانح عمریاں ہیں۔ ان کے علاوہ بھی بعض دوسرے پہلوؤں سے ان کی تقسیم کی جاتی ہے۔

اس مقالے کے دوسرے باب میں قدیم عربی خود نوشت سوانح عمریوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے سوانح اور خود نوشت سوانح کیلئے عربی زبان میں مستعمل لفظ "السیرۃ"، "الترجمۃ"، "السیرۃ الذاتیۃ"، اور "الترجمۃ الذاتیۃ" کی تاریخ، پس منظر اور ان کے لغوی و اصطلاحی معانی و مفاہیم کے تعین کی کوشش کی گئی ہے۔ پھر یہ ثابت کیا گیا ہے کہ عربوں کی اس صنف سے واقفیت فارسی اور یونانی آداب سے آگہی کے بعد ہوئی۔ ان دونوں آداب میں پہلے سے سیرت نگاری کا چلن عام تھا۔ عربوں میں پہلے سیرت رسول ؐ اور پھر سیرت صحابہ و تابعین وغیرہ کے لکھنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ بہت ہی جلد یہ سلسلہ دوسرے لوگوں کی زندگیوں پر محیط ہوتا گیا۔ یہی روایت جب اور آگے بڑھی تو بعض مصنفین، ادباء یا مؤرخین اپنی تصانیف کے شروع یا اخیر میں اپنے مختصر احوال قلمبند کرنے لگے۔ پھر چوتھی، پانچویں صدی ہجری تک باضابطہ اور مستقل خود نوشت سوانح لکھنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ قدیم عرب خود نوشتیں زیادہ تر مدافعت، معذرت، روحانی کشمکش کی تعبیر، معاشرتی رسوم و رواج کے خلاف احتجاج، اپنی مثالی زندگی کی تصویر کشی اور اپنے تجربات زیست محفوظ کر لینے کی خواہش کے تحت لکھی گئی ہیں۔ قدیم عربی خود نوشت کے تعلق سے خاص بات یہ ہے کہ وہاں وہ سب کچھ موجود ہے جسے آج ہم یومیات، مذکرات اور اعترافات کے نام سے جانتے ہیں۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس زمانے میں یہ اصطلاحات رائج نہیں تھیں۔ البتہ صفات اور خوبیوں کے لحاظ سے جدید و قدیم کے درمیان واضح فرق ہے۔ جدید خود نوشتوں میں پرجوش انقلابیت، معاشرے سے اعلان بغاوت اور معاشرتی روایات

واقعات کا کھلے عام استہزاء و تمسخر کا جو انداز پایا جاتا ہے قدیم خود نوشتوں سے یہ باتیں ابھر کر سامنے نہیں آسکی ہیں۔ یہاں بالعموم خوانگی اور خود سپردگی کا رنگ غالب ہے۔ گویا وہ قضا و قدر کے فیصلوں پر انحصار کرنے کی طرف زیادہ راغب ہیں اور کشمکش و تصادم کے اس احساس سے جو بڑی حد تک فن کی تخلیق کا باعث ہوتا ہے، تقریباً خالی ہیں۔ لیکن ان کے علاوہ بعض دوسری صفات مثلاً اعتراف، صراحت اور نفس کشائی جدید خود نوشتوں کی طرح قدیم میں بھی موجود ہیں۔ البتہ اپنی مخصوص خود داری، غیرت و حمیت نیز اپنے مضبوط دینی پس منظر کی وجہ سے ڈھٹائی، بے غیرتی اور عیب کشائی کی وہ مقدار عربوں میں بہرحال موجود نہیں ہے جو آج کی جدید مغربی خود نوشت سوانح عمریوں کا طرۂ امتیاز ہے۔ فنی لحاظ سے عہد ماضی کی بیشتر عربی خود نوشت سوانح عمریوں میں وہ تمام عناصر اور خوبیاں پائی جاتی ہیں جو انھیں جدید اسلوبیوں سے قریب کر دیتی ہیں۔ بالعموم ان کا اسلوب واضح، عبارتیں شیریں، پیشکش خوبصورت اور انداز بیان افسانوی ہوتا ہے۔ ان سے ماضی کی تمام یادیں تازہ ہو جاتی ہیں اور ان کے مطالعہ سے جذبات میں حرکت اور حرارت پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن ان سب کے باوجود عہد جدید میں فن کی جو متعین تعریف کی گئی ہے اور فنی اصناف میں سختی سے جن عناصر کے اتباع کی تاکید کی جاتی ہے اس کی رو سے اگر قدیم عربی خود نوشت سوانح عمریوں کا جائزہ لیا جائے تو بہت کم سوانح اس پر پوری اتریں گی۔

یوں تو قدیم عربی سرمایے میں ایسی بہت سی کتابیں ہیں جن میں ان کے مصنفین نے اپنے ذاتی احوال بیان کئے ہیں۔ لیکن جو سوانح عمریاں کسی حد تک مکمل اور مستقل بالذات تصنیفات کی حیثیت رکھتی ہیں ان میں ابن حزم کی "طوق الحمامۃ فی الالفۃ والالاف"، المؤید فی الدین کی "السیرۃ المؤیدۃ"، علامہ ابن خلدون کی "التعریف بابن خلدون ورحلتہ غرباً

و مشرقاً ،، اسامہ بن منقذ کی ،، کتاب الاعتبار ،، امام غزالی کی ،، المنقذ من الضلال ،، اور امیر عبداللہ کی ،، مذکرات الامیر عبداللہ ،، خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ان کتابوں کا اس مقالہ میں مختصر تعارف موجود ہے۔

اسی باب کی دوسری فصل میں انیسویں صدی عیسوی کے اندر خود نوشت سوانحی ادب کے ارتقاء پر الگ سے گفتگو کی گئی ہے۔ متعدد اسباب کی بنیاد پر چونکہ اس صدی میں تمام اصناف ادب کی طرح خود نوشت نگاری میں بھی نمایاں پیش رفت ہوئی تھی اس لئے اس کا الگ سے تذکرہ کرنا مناسب معلوم ہوا۔ جدید عربی ادب کا ارتقاء فی الواقع مغربی علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کا مرہون منت ہے۔ انیسویں صدی کے آغاز میں مغرب سے رابطہ کے جس سلسلے کا آغاز ہوا وہ دن بدن مضبوط تر ہوتا گیا۔ بہت سے عرب علماء اور مدبرین نے یورپ کا سفر کیا اور وہاں کے تہذیبی و تمدنی اور علمی و ادبی ماحول کا بذات خود مشاہدہ کیا پھر انھوں نے اپنے ممالک میں واپس آکر اپنے ہم وطنوں کو اپنے تجربات و مشاہدات سے باخبر کیا اور ان سے اخذ و استفادہ کیطرف انھیں راغب کیا۔ ان میں رفاعہ طہطاوی، فارس شدیاق اور علی مبارک کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ان کے بعد اور بہت سے لوگ اسی سمت پر آگے بڑھے یہاں تک کہ جدید و قدیم سے استفادہ کی دعوت مصری سماج اور تمام عرب معاشرے کی سب سے پسندیدہ آواز بن گئی۔ اس کے اثرات ہر سطح پر مرتب ہوئے۔ عربی ادب بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ چنانچہ صحافت، ڈرامہ نگاری اور افسانہ نویسی میں نمایاں تبدیلیاں محسوس کی گئیں۔ عربی خود نوشت نگاری کی جو شکلیں اس زمانے میں سامنے آئی ہیں ان میں مغرب کی صدائے بازگشت صاف طور سے سنائی دیتی ہے۔ بلکہ ایک لحاظ سے یہ مغرب کی طرف متوجہ کرنے

کے بہترین ذرائع ہیں ۔ جن ادباء اور مفکرین کی سوانح عمریوں کا اس فصل میں تعارف پیش کیا گیا
ان میں شیخ محمد عباد طنطاوی، علی مبارک، شیخ محمد عبدہٗ، احمد فارس شدیاق اور رفاعہ طہطاوی کے
نام قابل ذکر ہیں ۔ چونکہ یہ خود نوشت سوانح عمریاں انیسویں صدی کی پیداوار ہیں اس لئے اس
وقت کے تغیر پذیر حالات کی یہ صحیح طور سے ترجمانی کرتی ہیں ۔ فنی اعتبار سے یہ گرچہ بہت
سی کمیاں لئے ہوئے ہیں لیکن ان سے اس وقت کے عرب معاشرے کی وہ کیفیت بہرحال واضح ہو جاتی
ہے جن سے صاف عیاں ہوتا ہے کہ وہ ارتقاء کی طرف ایک جست بہت جلد لگانے والا ہے
یہ سوانح عمریاں بعد کی تبدیلیوں اور تغیرات کیلئے بہت بنیادی اہمیت کی حامل ثابت ہوئیں ۔

اس مقالے کے تیسرے باب میں بیسویں صدی عیسوی کے اندر عربی خود نوشت
نگاری کا تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے ۔ سب سے پہلے ان اسباب کی نشاندہی کی گئی ہے جن کی وجہ
سے اس صدی میں اس صنف ادب کو غیر معمولی ارتقا نصیب ہوا ۔ ان اسباب میں جدید علوم و
فنون اور جدید افکار و نظریات خاص طور سے اس لئے قابل ذکر ہیں کہ ان سے انسان کو اپنی حقیقت
اور ماہیت سے آگاہ ہونے کا شوق پیدا ہوا ۔ اس کے نتیجے میں علم الانسان شناسی اور علم
نفسیات کا وجود عمل میں آیا ۔ پھر عربوں کے مخصوص سیاسی اور سماجی حالات نے ان کے اندر
اپنے تشخص کی بقا اور حفاظت کے تعلق سے طرح طرح کے خدشات پیدا کر دیئے ۔ ان سب کی
وجہ سے انھوں نے اپنے افکار و خیالات کو اپنی مخصوص زبان میں ادا کرنا ضروری سمجھا ۔ ظاہر
ہے اس کے لئے سب سے بہترین ذریعہ خود نوشت سوانح حیات ہی ہو سکتا تھا ۔ ان سوانح عمریوں
کا نمایاں وصف یہ ہے کہ یہ اپنے مصنفین کے ذاتی اور انفرادی احساسات کے ساتھ ساتھ
دوسرے لوگوں کے جذبات کی بھی بھرپور عکاسی کرتی ہے ۔ ان میں قدیم عربی ادب اور جدید

عربی ادب کی بہترین آمیزش ہے، یہ اپنی بعض خصوصیات (مثلاً معاشرے سے بیزاری، قدیم افکار کے خلاف اظہار بغاوت، بعض اخلاقی معایب کا صاف اعتراف وغیرہ) کی وجہ سے قدیم خود نوشت سوانح عمریوں سے منفرد اور ممتاز ہیں۔ جدید دور میں آپ بیتی سے ملتی جلتی بعض اقسام مثلاً مذکرات، ذکریات اور اعترافات کا رواج بھی پہلے کے بالمقابل بہت زیادہ عام ہوا ہے۔ پھر اسلوبی انداز میں بھی اپنی قلبی کیفیات کی ادائیگی کی طرف پہلے سے زیادہ توجہ دی گئی ہے۔

جدید عربی خود نوشت سوانح عمریوں کو ان کے مقاصد، طریقہ کار اور محرکات کی روشنی میں دیکھنے اور پرکھنے کی کوشش کی جائے تو یہ معلوم ہوتا کہ ان میں سے بعض فکری نوعیت کی ہیں، اسطرح بعض اسلوبی انداز کی ہیں تو بعض زندگی کے صرف ایک گوشہ پر روشنی ڈالتی ہیں۔ فکری نوعیت کی سوانح عمریوں میں میخائیل نعیمہ کی "السبعون"، اور سلامہ موسیٰ کی "مذکرات سلامہ موسیٰ"، سیاسی نوعیت کی سوانح عمریوں میں احمد لطفی السید کی "قصۃ حیاتی"، اور عبدالعزیز فہمی کی "حصادی حیاتی"، اسلوبی طرز کی سوانح عمریوں میں ابراہیم عبدالقادر المازنی کی "ابراہیم الکاتب"، اور ابراہیم الثانی، عقادی "مساراۃ"، اور توفیق الحکیم کی "عودۃ الروح"، اسطرح کسی ایک گوشہ زندگی پر روشنی ڈالنے والی سوانح عمریوں میں جرجی زیدان کی "مذکرات"، یوسف وھبی اور فاطمہ رشدی کی "مذکرات" اور حسین فوزی کی "سندباد فی رحلۃ الحیاۃ"، خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

جدید و قدیم عربی خود نوشت سوانح عمریوں کے تقابلی مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قدیم کے بالمقابل جدید سوانح عمریوں میں عرب معاشرے کی دیرینہ روایات کا

بہت کم پاس و لحاظ رکھا گیا ہے، بلکہ معاصر افکار و خیالات سے متأثر ہو کر ان سے گریز کی راہ اختیار کی گئی ہے۔ یہاں صرف اپنے معاشرے سے لاتعلقی کا اظہار ہی نہیں بلکہ ان سے بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے ان کے بالمقابل مغرب سے درآمد شدہ افکار و نظریات کی پرزور وکالت کی گئی ہے۔ مواد کے علاوہ اگر ہیئت کے اعتبار سے دیکھا جائے تو یہاں بھی ایک نمایاں فرق یہ معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ خود نوشت سوانح عمریاں اپنی شکل و صورت کے اعتبار سے مشکل اور متعین ہو گئی ہیں اور مختلف مقاصد کے لئے تحریر کردہ سوانح عمریوں کے لئے الگ الگ اصطلاحیں وضع کر لی گئیں ہیں۔ عرب ادباء بالعموم ان اصطلاحوں کے حدود و قیود کا پاس و لحاظ رکھتے ہیں۔

مقالے کے اسی باب میں بہت تفصیل سے ان خوبیوں اور اوصاف پر نظر ڈالی گئی ہے جو بڑی حد تک صرف جدید خود نوشت سوانح عمریوں کے ساتھ مخصوص ہیں۔ ان نمایاں اوصاف میں اسلوب تعبیر کا ادباء و مفکرین کی شخصیات سے ہم آہنگ ہونا، تالیف کتاب کی غرض و غایت کی مکمل وضاحت کرنا، وراثت اور ماحول کے اثرات کو علیحدہ علیحدہ بیان کرنا، عہد طفولیت کی تصویر کشی کرنا، دوران تصنیف سچائی، معروضیت اور صاف گوئی سے کام لینا، اندرونی تصادم اور کشمکش کی تفصیلات بہت صراحت سے پیش کرنا اور حسب ضرورت و حسب موقع تصویری، تحلیلی یا افسانوی طرز بیان میں اپنے مافی الضمیر کو ادا کرنا، خاص طور سے قابل توجہ اور لائق مطالعہ ہیں۔ ان تمام اوصاف کی وضاحت کے لئے اس مقالے میں جدید خود نوشت سوانح عمریوں کا تقابلی مطالعہ کیا گیا ہے اور اس کی روشنی میں سب کی صفات متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مقالے کے چوتھے باب میں جدید خود نوشت سوانح عمریوں میں سے بعض کو منتخب کر کے ان کے فکر و فن پر اس انداز میں گفتگو کی گئی ہے کہ ان کے مطالعہ کے بغیر ہی ان کے حسن و قبح سے واقفیت بہم پہنچائی جا سکے۔ اس کا طریقہ یہ اختیار کیا گیا ہے کہ ۱۹۵۲ء سے پہلے کی منتخب سوانح پر گفتگو قدرے مختصر ہے کیونکہ یہ میرے موضوع سے براہِ راست متعلق نہیں تھیں البتہ ۱۹۵۲ء کے بعد کی چھ منتخب خود نوشت سوانح عمریوں پر بہت تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ ان کے مشمولات و محتویات کا جائزہ لیا گیا اور پھر ان کے فکر و فن پر الگ سے ایک تجزیاتی نظر ڈالی گئی ہے۔ اس طرح گویا یہ باب دو فصلوں پر مبنی ہے پہلی فصل ماقبل ۱۹۵۲ء اور دوسری فصل مابعد ۱۹۵۲ء کی مطبوعہ خود نوشت سوانح عمریوں سے متعلق ہے۔

۱۹۵۲ء سے پہلے مطبوعہ جن خود نوشت سوانح عمریوں کا مختصر تعارف پیش کیا گیا ہے ان میں طٰہٰ حسین کی "الایام"، احمد امین کی "حیاتی"، حسین ہیکل کی "مذکرات فی السیاسۃ المصریۃ"، کرد علی کی "مذکرات"، اور سلامہ موسیٰ کی "تربیۃ سلامہ موسیٰ" ہیں۔ یہ پانچوں تصنیفات بیسویں صدی کے نصف اول کی نمائندہ تصانیف ہیں اور ان کے مطالعہ سے اس زمانے کی فکری، سیاسی اور سماجی حالات بخوبی معلوم ہو جاتے ہیں۔ ان میں طٰہٰ حسین کی "الایام" اور احمد امین کی "حیاتی" خود نوشت سوانح عمریوں کے طرز سرمایہ میں اپنی مثال آپ ہیں۔ طٰہٰ حسین کا جری اور بے باک قلم اور احمد امین کا علمی و تاریخی اسلوب ان تصنیفات میں اپنی تمام فنی و ادبی خوبیوں کے ساتھ جلوہ افروز ہے۔ ان کے حسین و جمیل انداز بیان اور خوبصورت اسلوب سے یہ دونوں کتابیں قارئین کے قلوب کو مسحور اور نگاہوں کو خیرہ کر دیتی ہیں۔

۱۹۵۲ء کے بعد کی مطبوعہ خود نوشت سوانح عمریوں میں سے جن کا انتخاب کیا گیا ہے ان میں میخائیل نعیمہ کی "السبعون"، عباس محمود العقاد کی "أنا"، أحمد لطفی السید کی "قصۃ حیاتی"، عبد العزیز فہمی کی "حدیث حیاتی"، ڈاکٹر شوقی ضیف کی "سعی" اور شیخ علی طنطاوی کی "ذکریات" شامل ہیں۔ ان میں سے پہلی دو کی حیثیت فکری اور ادبی ہے جبکہ دوسری دو کی حیثیت علمی اور سیاسی ہے اور آخری دو کی حیثیت علمی، سماجی و ثقافتی ہے۔ ان کے انتخاب میں ایک حسین وصف یہ بھی مضمر ہے کہ یہ ان تین عرب ممالک کی نمائندگی کرتی ہیں جو اس صدی میں ادبی و علمی سرگرمیوں کے مرکز رہے ہیں۔ میری مراد مصر، شام اور لبنان سے ہے۔ چونکہ ان سرگرمیوں میں مصر کا حصہ سب سے نمایاں ہے اس لئے فطری طور سے وہاں کی مطبوعہ آپ بیتیوں کی تعداد بھی زیادہ ہے۔ منتخب شدہ یہ آپ بیتیاں بعض نمایاں اوصاف اور خصائص کی مالک ہیں۔ اس مقالے میں حتی الوسع انھیں اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان کا ایک انتہائی مختصر تعارف ذیل کی سطروں میں پیش کیا جا رہا ہے۔

میخائیل نعیمہ کی "السبعون" ان کے ستر سالہ تجربات و مشاہدات پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب کل تین حصوں میں ہے۔ اپنے موضوع پر یہ عربی ادب میں ایک شاہکار تصنیف ہے لبنان سے لیکر دیارِ مغرب تک مصنف نے روحانی، جسمانی، علمی اور ادبی اعتبار سے جو منزلیں بھی طے کی تھیں ان کی تمام تفصیلات اس کتاب میں آگئی ہیں۔ باوجود اس کے کہ وہ تصوف کی طرف مائل تھے لیکن انھوں نے پوری جرأت اور سچائی سے اپنے تمام اخلاقی عیوب اور جرائم کا اعتراف کیا ہے۔ اس خود نوشت کا ایک اہم وصف یہ ہے کہ یہ ایک خاص فکر

(نظریہ وحدت الوجود) کے گرد گردش کرتی ہے۔ اسمیں فن ناول نگاری، ڈرامہ نگاری اور مقالہ نگاری سے بیک وقت مدد لی گئی ہے اور مختلف واقعات و حادثات کے پیش کرنے میں تدریج اور ترتیب کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ نفس کی داخلی کشمکش اور اندرونی تصادم کے پیش کرنے میں عربی زبان میں اس کا اس کا نمایاں مقام ہے اسمیں مناظر فطرت کی تصویر کشی بھی بہت اچھے انداز میں کی گئی ہے۔ مہجری ادب کے مطالعہ اور اس کی واقفیت حاصل کرنے کے لئے یہ ایک مفید کتاب ہے۔

عباس محمود العقاد کی کتاب "انا" عصر حاضر کی ان چند خود نوشت سوانح عمریوں میں سے ایک ہے جس کے مطالعہ سے اس عہد کی ادبی، سیاسی اور علمی رجحانات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ یہ خود نوشت ان کی باضابطہ تصنیف نہیں ہے بلکہ ان کے مقالات کا مجموعہ ہے۔ عقاد کا مخصوص فکری اور فلسفیانہ مزاج اسمیں پوری طرح نمایاں ہے۔ ان کی شخصیت چونکہ بہت پیچیدہ اور گوناگوں پہلوؤں کی مالک تھی اس لئے اس کی تفہیم میں اس کتاب کی مدد انتہائی ضروری ہے۔ اس کے اندر کل نو فصلیں ہیں اور ہر فصل کے ذیل میں کئی ایک چھوٹے چھوٹے مقالات ہیں۔ اس کتاب کے مطالعہ سے یہ حقیقت بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ یہ ایک ایسے جستجو پسند اور باکمال فنکار کی تحریر ہے جسے علمی، فکری اور فنی مسائل میں غور و فکر کی عادت ہے اور جس کی جولانگاہ ادب، فلسفہ، علم النفس تربیت اور علم الحیات کے مسائل رہے ہیں۔ کتاب کا اسلوب تجزیاتی ہے۔ مصنف نے اسمیں اپنی ذات سے غیر معمولی شغف اور دلچسپی کا اظہار کیا ہے۔

احمد لطفی السید کی کتاب "قصۃ حیاتی" ان کے نوّے سالہ تجربات کی آئینہ دار ہے۔ اسمیں انھوں نے اپنے فکری، سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی افکار و خیالات کی ایک زندہ تصویر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کتاب کی بنیاد مضبوط علمی فلسفے پر قائم ہے۔ مصنف نے اس میں اپنی ذاتی زندگی کے علاوہ بیسویں صدی عیسوی کی ابتدا میں مصر کی عمومی حالت پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ سیاست، فکر اور معاشرت کے میدان میں مصر کی تعمیر نو کیلئے ان کی سعی و جہد کی نوعیت کیا تھی اور اس کے بنیادی اصول و ضوابط کہاں سے ماخوذ تھے۔ اس کتاب میں مصنف نے اپنے افکار و خیالات سے ہمیں واقف کیا ہے۔ وہ اسلامی فلسفہ، یونانی فلسفہ اور یورپی فلسفہ سے ماخوذ و مستعار ہیں۔ وہ یونانی فلسفہ میں ارسطو سے خاص طور سے متاثر ہیں۔ اس کتاب کا اسلوب تحلیلی اور تفسیری ہے۔ اس پر مقالہ نگاری کا رنگ غالب ہے۔ چونکہ فکر و فلسفہ کی باتیں اس کتاب میں بہت زیادہ ہیں اس لئے فنی و ادبی اعتبار سے یہ کوئی اہم مقام نہیں حاصل کر سکی۔

عبدالعزیز فہمی کی کتاب "ھذہ حیاتی" مصر کی سیاسی تاریخ میں ان کے کردار کی وضاحت کرتی ہے۔ اس کے مطالعہ سے جدید مصری تاریخ کے بہت سے اہم گوشے نمایاں ہوتے ہیں۔ عبدالعزیز فہمی مصری قوم کے ایک عظیم مصلح، مدبر اور مخلص رہنما تھے۔ اس لئے یہ کتاب ان کی اصلاحی خدمات کا بہترین تعارف پیش کرتی ہے۔ اس میں جگہ جگہ ایسی مثالیں موجود ہیں جن سے صاحب کتاب کی جرأت و بہادری اور حق گوئی و بیباکی کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ وہ گرچہ ایک مخصوص سیاسی پس منظر رکھتے تھے لیکن ان کے بیانات سے کہیں بھی تعصب یا جانبداری کا مظاہرہ نہیں ہوتا ہے۔ اس کتاب کا اسلوب علمی اور تقریری

ہے۔ مکالمہ نگاری میں اس کا ایک نمایاں مقام ہے۔ مصنف کی طویل عدالتی اور قانونی زندگی کی وجہ سے اس کتاب پر جرح و تعدیل اور بحث و مناقشہ کا رنگ غالب ہے۔

شوقی ضیف کی "مصر" ان کی زندگی کے محض ابتدائی حصے کا تعارف پیش کرتی ہے۔ اسمیں ان کی تعلیمی زندگی کے تجربات و مشاہدات کا احاطہ کیا جا سکا ہے۔ لیکن اس کی اس لحاظ سے بڑی اہمیت ہے۔ اسمیں مصر کے تعلیمی نظام بیسویں صدی کے نصف اول میں دارالعلوم، جامعہ مصریہ اور جامعہ ازہر کے علاوہ مختلف دوسرے ثانوی درجات تک کے کالجز کے تعلیمی ماحول اور ان میں رائج تعلیمی نصاب پر جامع اور مدلل گفتگو کی گئی ہے۔ اس سے مصر کی دیہاتی زندگی اور وہاں کے رسوم و رواج کے بارے میں بھی مفید باتیں معلوم ہو جاتی ہیں مصنف ایک بہترین ادیب اور ناقد تھے۔ اس لئے ان کے ادبی اور تنقیدی خیالات کی ایک جھلک بھی یہ کتاب پیش کرتی ہے۔ اس کا انداز بیان صاف، واضح اور سلیس ہے۔

شیخ علی طنطاوی کی کتاب "ذکریات" باضابطہ خودنوشت سوانح حیات نہیں ہے بلکہ یہ ان کی منتشر یادوں کا مجموعہ ہے۔ یہ کتاب کل چار جلدوں میں ہے اور بہت زیادہ معلومات اپنے دامن میں چھپائے ہوئے ہے۔ مصنف عصر حاضر کے ایک معروف اسلام پسند ادیب ہیں۔ ان کی اسلام پسندی کا اس کتاب میں جگہ جگہ مظاہرہ ہوا ہے۔ اس کے مطالعہ سے دمشق اور شام کی تاریخ کے بہت سے اہم باب واضح ہو جاتے ہیں۔ "استطراد" اس سوانح کا خاص وصف ہے۔ مصنف نے نہ صرف یہ کہ اس کا اعتراف کیا ہے بلکہ اسے جاحظ کی سنت بتاتے ہوئے اسے سہل پیرا ہونے کا جواز بھی فراہم کیا ہے۔ فطری مناظر کی تصویر کشی میں یہ عصر حاضر کی خودنوشت سوانح عمریوں کے درمیان ایک ممتاز مقام پانے کی مستحق ہے۔ اسمیں جدید و قدیم اسالیب بیان سے مدد لی گئی ہے۔ فصیح عربی زبان میں تحریر شدہ اس کتاب میں جدید یورپی زبانوں اور شام کی مقامی زبان کے بہت سے الفاظ موجود ہیں۔

DEVELOPMENT OF AUTO-BIOGRAPHICAL LITERATURE IN ARABIC SINCE 1952 A.D

Thesis Submitted For the Degree of

Doctor of Philosophy

IN

ARABIC

BY

SAFDER SULTAN

Under the Supervision of

Prof. Mohd. Rashid

DEPARTMENT OF ARABIC
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY
ALIGARH (INDIA)

1993

عربی زبان میں

خود نوشت سوانحی ادب کا ارتقا

(۱۹۵۲ء کے بعد سے اب تک)

مقالہ

برائے پی ایچ، ڈی

مقالہ نگار

صفدر سلطان

نگران

پروفیسر محمد راشد

شعبۂ عربی

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

۱۹۹۳ء

T4402

ACC No.
T4402

30 JUN 1994

Prof. Mohd. Rashid
COORDINATOR

Phones [External : 27162
Internal : 8234

SPECIAL ASSISTANCE PROGRAMME
DEPARTMENT OF ARABIC
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY
ALIGARH—202002 (India)

Dated 7.8.93

This is to certify that Mr. Safder Sultan has done his research work entitled "Development of Auto-biographical Literature in Arabic since 1952 A.D. " under my supervision and has completed his work successfully. This is an original contribution and entirely his own.

(Prof. Mohd. Rashid)
Supervisor

انتساب

اپنے مشفق اساتذہ

کے

نام

جن کی نوازشیں، دُعائیں اور کرم فرمائیاں

میرے علمی سفر کا

سب سے قیمتی سرمایہ ہیں۔

فہرست مضامین

انتساب

مقدمہ ـــــــ

مقدمه

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۰

الحمد للہ رب العلمین والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ الکریم وعلی آلہ وصحبہ أجمعین الی یوم الدین ۔

وبعد! جدید عربی ادب کے سرمایے پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اس میں صرف عصر عباسی تک کی قدیم ادبی سرگرمیوں کا احیاء ہی نہیں ہوا ہے بلکہ اپنے وسیع تر مفہوم میں ایک زبردست تغیر اور ارتقاء واقع ہوا ہے۔ اس کا آغاز انیسویں صدی کی ابتداء میں کلاسیکی عربی زبان کے احیاء کی ایک مسلسل تحریک سے ہوا تھا جس کا مقصد عربی زبان کو اس کے گزشتہ صدیوں کے انحطاط سے نجات دلانا اور کلاسیکی ادب کی میراث کو دوبارہ واپس لانا تھا۔ بلاشبہ مغربی اقوام سے ربط و تعلق اور باہمی لین دین کے رشتے سے جہاں عربوں کی عسکری اور سماجی ضروریات کی تکمیل ہوئی وہیں ان کی علمی و ادبی زندگی میں ایک نئی روح پیدا ہو گئی۔ مغربی ادب اور مغربی خیالات سے استفادہ کے بعد عربوں کو اپنی معاشرتی اور سیاسی زبوں حالی کیساتھ اپنی تہذیبی اور لسانی کم مائیگی کا بھی شدت سے احساس ہوا تھا۔ چنانچہ انھوں نے تیزی کے ساتھ اپنی تصانیف میں مغربی مواد کو شامل کرنا شروع کیا۔ عربی ادب میں ان کی حیثیت گرچہ ایسے اضافات کی تھی جن کا قدیم سرمائے سے کوئی خاص تال میل نہیں تھا لیکن بہرحال ان کی یہ کوششیں جدید عربی ادب کے اندر ایک نئی بنا ڈالنے اور اس کے اندر ایک نیا تجربہ کرنے کا پیش خیمہ ثابت ہوئیں۔ اس سلسلے میں خاص طور سے ان تصانیف کو سراہا جانا چاہیئے جو مغربی زبانوں

سے عربی زبان میں منتقل کی گئی تھیں۔ یہ کتابیں ادبی معیار پر پورا نہ اترنے کے باوجود جدید عربی ادب کی موجودہ شکل وھیئت کی اصل ذمہ دار ہیں۔ انھوں نے عربی زبان کے اندازِ بیان کو وسعت دینے کے لئے منشیوں ہی کا نہیں بلکہ نمونوں کا بھی کام دیا۔

انیسویں صدی عیسوی کے برعکس جو بحیثیت مجموعی جدید عربی نثر میں تجربے اور تقلید کی صدی تھی، بیسویں صدی کے بالکل آغاز ہی سے ایک ایسے نئے اور طبع زاد عربی ادب کی شروعات دیکھنے میں آتی ہے جو عرب اقوام کی معاشرتی اور ذہنی دلچسپیوں کی بہت زیادہ صحیح عکاسی کرتا ہے، اس ترقی میں مصری مصنفین کے آزاد خیال گروہ نے نمایاں حصہ لیا۔ ان کی ادبی تخلیقات میں سے بیشتر میں ان کی دیہی زندگی کی تصویر کشی ہے اور ان میں معاصر زندگی کے حقائق پیش کئے گئے ہیں۔ ان تخلیقات میں دن بدن نکھار آتا گیا اور ان میں موجود کمیوں پر قابو پانے کی کوششیں کامیاب ہوتی گئیں۔ چنانچہ عربی زبان کو بہت جلد ایسے اساطین علم وفن میسر آگئے جن کی نگارشات، مضمون اور اسلوب دونوں کے اعتبار سے مکمل اور اچھوتی تھیں۔ ان لوگوں کا مقصد صرف کلاسیکی عربی اور جدید مغربی ادب دونوں کا ناقدانہ جائزہ ہی نہیں تھا بلکہ اپنے معاشرہ پر تنقید وتبصرہ بھی کرنا تھا تاکہ زمانے کے جدید تقاضوں کے پیش نظر عربی ثقافتی روایت کی اس سے وسیع تر مفہوم میں قدر وقیمت کا تعین ہو سکے، اور اسکی حوصلہ افزائی کی جا سکے۔ ان کوششوں سے رفتہ رفتہ ادبی اور معاشرتی تنقید کا ایک ایسا ترقی یافتہ ادب وجود میں آیا جس کا بیشتر رجحان علمی تھا۔

جدید عربی ادب کی موجودہ شکل وھیئت کی تعیین وتشکیل میں عالم عرب کے سیاسی وسماجی حالات کا خاص طور سے دخل ہے۔ یہ حالات انیسویں صدی عیسوی ہی سے ایک طرح

کی غیر یقینی کیفیت سے دوچار تھے لیکن بیسویں صدی میں پے در پے بعض ایسے واقعات پیش آئے جن کی وجہ سے عربوں کے اندر اپنے تشخص اور انفرادیت کے بقا و تحفظ کی فکر شدید سے شدید تر ہوتی گئی ان میں جنگ عظیم اول کے بعد عالم عرب پر مغربی طاقتوں کا تسلط، عرب ممالک کی مختلف چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم، عرب عوام کی بنیادی انسانی حقوق سے محرومی اور ہر آخیر میں ارض فلسطین پر یہودیوں کا غاصبانہ قبضہ، یہ وہ اہم واقعات ہیں جن کے نتیجے میں ان کے عوام و خواص ادباء و مصنفین اور شعراء و سیاستدان سب ہی میں سامراج کے خلاف غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ ان حالات و واقعات کے بعد عربوں کی تحریروں میں جوش آزادی، اپنی قدیم تاریخ سے محبت، غلامی سے نجات اور عوامی فلاح و بہبود کا جذبہ، پہلے کے بالمقابل زیادہ واضح اور نمایاں طور سے نظر آنے لگا۔ ان میں عرب سماج کی صحیح عکاسی ہونے لگی اور لوگوں کو معاشرے کی تعمیر و تشکیل کی طرف متوجہ کیا جانے لگا۔ عرب ادباء میں سے چند کے علاوہ بیشتر مسلمانوں کی تہذیبی اقدار کو بلند دیکھنا چاہتے تھے اور اس مقصد کی خاطر اپنی تمام کاوشوں اور مصروفیات کو صرف کئے ہوئے تھے۔

جدید دور میں حقائق پر مبنی جن تحریروں کا سب سے پہلے عربی زبان میں رواج عام ہوا ان میں سے زیادہ تر ناول نگاری، ڈرامہ نگاری اور مقالہ نگاری سے متعلق تھیں۔ عربی صحافت نے خاص طور سے فن مقالہ نگاری کو ایک بلند مقام عطا کیا۔ مختلف نوعیت کے مسائل پر اظہار خیال کی وجہ سے عربی زبان میں ایک طرح کی لچک پیدا ہوئی اور الفاظ و تراکیب کا ایک وسیع ذخیرہ ہاتھ آگیا۔ چنانچہ یہ آج معاصر زندگی اور فکر کے جملہ پہلوؤں

کو خوبصورتی اور صحت کے ساتھ ادا کر سکنے کے لائق ہو گئی ہے۔ زبان، اسلوب اور فکر کے ان متغیر اور ترقی یافتہ حالات میں دیگر اصناف سخن کیساتھ ساتھ فن خود نوشت کو بھی غیر معمولی فروغ حاصل ہوا۔ بلکہ چونکہ یہ صنف انسان کی قلبی کیفیات، رجحانات اور احساسات کی ترجمانی کا مؤثر ذریعہ ہے اس لئے موجودہ حالات میں اسے آگے بڑھنے اور مقبول عام ہونے کے کافی مواقع میسر آئے۔

خود نوشت سوانح نگاری ادب کی ایک ایسی معروف اور مفید صنف ہے جس سے بنی نوع انسان ایک دوسرے کے تجربات و مشاہدات اور احوال و کوائف سے آگاہ ہوتی ہے اس صنف کا آغاز و ارتقا صدیوں پر محیط ہے انسان ابتداء سے اپنی ذات اور تجربات کے اظہار کے لئے نت نئے طریقے اختیار کرتا رہا ہے۔ یہ فی الواقع انسان کے اس جذبۂ تجسس کی مظہر ہے جس کے باعث وہ اپنے گرد و پیش کو جاننے اور سمجھنے کی سعی کرتا ہے۔ کائنات کے بے پناہ مسائل اور اسرار و رموز سے واقفیت رکھنے والے شخص کی یہ فطری خواہش ہوگی کہ وہ اپنے دوسرے بھائیوں سے تجربات و مشاہدات اور حقائق و معلومات کا تبادلہ کرے۔ اس سے وہ صرف ایک دوسرے کے تجربات سے آگاہ ہی نہیں ہوتا بلکہ خود کو ذہنی آسودگی اور سکون فراہم کرتا ہے کیونکہ اپنی ذات تک پہنچنے کا اس کے پاس یہی واحد راستہ ہے۔

دوسری زبانوں کی طرح عربی زبان میں بھی خود نوشت نگاری کی صنف بہت پہلے سے موجود ہے۔ یوں تو دور جاہلی میں بھی اظہار ذات کی بعض شکلوں کا سراغ لگتا ہے لیکن دوسری صدی ہجری میں یونانی اور فارسی تہذیب و تمدن سے متاثر ہونے کے بعد عربوں

میں اس کا باضابطہ رواج بہت تیزی سے عام ہوا۔ ابتدا میں عرب حکماء اور اطباء نے یونانی فلاسفہ کی تقلید کرتے ہوئے اپنی تصانیف کے شروع یا اخیر میں اپنے ذاتی احوال قلمبند کرنے کی روایت کا آغاز کیا۔ پھر یہیں سے یہ روایت صوفیاء تک منتقل ہوئی۔ دوسرے علماء و ادباء نے اس کا آغاز بہت تاخیر سے کیا۔ ان سب کی مشترکہ کوششوں سے قدیم عربی ادب میں خود نوشت سوانح کی مختلف انواع و اقسام کا وجود عمل میں آیا۔ ان سب کی مشترکہ کوششوں سے قدیم عربی ادب میں خود نوشت سوانح کی مختلف انواع و اقسام کا وجود عمل میں آیا۔ ان کے مقاصد اور محرکات بھی کم و بیش وہی ہیں جو آج اس صنف کے لئے ضروری قرار دیئے گئے ہیں۔ البتہ اس میں پرجوش انقلابیت، معاشرے کے خلاف اعلانِ بغاوت اور روایات و اقدار کے خلاف استہزاء و تمسخر کا وہ انداز نہیں پایا جاتا ہے جو آج کی سوانح عمریوں کے ساتھ مخصوص ہے۔ قدیم خود نوشت سوانح عمریوں میں بالعموم خوانگی اور خود سپردگی کا رنگ غالب ہے، صوفیاء کے یہاں مذہبی اور روحانی مقاصد کے تحت اعتراف، صراحت اور نفس کشائی کے کچھ عناصر ضرور پائے جاتے ہیں لیکن اندرونی کشمکش اور تصادم کا وہ احساس جو فن کی تخلیق کا باعث ہوتا ہے، قدیم عربی خود نوشتوں میں بہت ہی کمزور ہے۔ اس کے متعدد اسباب میں سے شرم و حیا کا وہ جذبہ بھی ہے جو عربوں میں خاص طور سے ودیعت کیا گیا تھا۔ پھر عربوں کا مذہبی پس منظر بھی اس راہ میں ایک رکاوٹ ثابت ہوا۔ ان سب کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ قدیم عربی خود نوشت سوانح میں فکر و فن کی وہ مقدار بہرحال موجود تھی جو دورِ حاضر کی ترقیات کے لئے خشتِ اولیں ثابت ہوئیں۔

بیسویں صدی عیسوی میں مختلف اسباب و علل کی وجہ سے خود نوشت سوانح عمری کو غیر معمولی ترقی ہوئی ۔ یہ ترقی بھی ہمہ جہتی ہے ۔ ان اسباب میں وہ جدید افکار و نظریات اور علوم و فنون خاص طور سے قابل ذکر ہیں جو انسانی نفسیات، مزاج اور طبائع سے بحث کرتے تھے ۔ پھر عربوں کے سیاسی و سماجی حالات بھی ان کے لئے اپنی ذات اور شخصیت کا گہرا جائزہ لینے کا اہم سبب بنے ۔ اس کام میں وہاں کے متوسط طبقہ نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کیونکہ یہ طبقہ حریت، استقلال، جمہوریت اور دستور کا دوسروں کے بالمقابل کچھ زیادہ ہی ضرورت مند تھا ۔ چنانچہ انھوں نے اپنے ذاتی اور انفرادی احساس کے تحت جو کچھ لکھا ان میں لوگوں کے جذبات کی بھرپور عکاسی تھی ۔ ان میں ضرورت کے مطابق مغربی مواد سے بھی استفادہ کیا گیا تھا، اس طرح ان میں کچھ ایسے اوصاف اور خصائص ابھر کر سامنے آئے جو قدیم عربی خود نوشتوں میں زیادہ نمایاں نہیں ہو سکے تھے ۔

قدیم و جدید عربی سرمایے میں خود نوشت سوانح عمریوں کا ایک قابل لحاظ حصہ موجود ہونے کے باوجود یہ امر باعث تعجب ہے کہ دور حاضر کے عرب محققین نے ادب کی دوسری اصناف مثلاً شاعری، افسانہ اور ڈرامہ نگاری پر جسقدر توجہ دی ہے خود نوشت سوانح نگاری کے درس و مطالعہ پر وہ اسقدر توجہ نہیں دے سکے ہیں ۔ اور یہ آج تک ہماری توجہ کی اصل محتاج ہے ۔ اس اہم ادبی صنف سے یہ غفلت اور بے توجہی فی الواقع اس موضوع کے انتخاب کا ایک اہم سبب بنی ۔ بلاشبہ یہ ایک مشکل کام تھا ۔ عربی زبان میں اس موضوع سے متعلق جو کچھ مواد موجود ہے وہ حد سے زیادہ ناکافی ہے ۔ اس میں بھی عمیق بحث و تحقیق

کے بجائے حد سے زیادہ اختصار اور عجلت سے کام لیتے ہوئے صرف عمومی مسائل سے تعرض کیا گیا ہے۔ زیادہ تر مصنفین نے اس صنف کا فنی تعارف پیش کرنے کے بجائے اس کے تاریخی پہلو کی وضاحت پر اپنا وقت صرف کیا ہے۔

عصر حاضر میں اس صنف پر سب سے پہلے دو مستشرق محققین "روزنتال" اور "بروکلمان کارل" نے اپنے الگ الگ مقالات میں روشنی ڈالی ہے۔ "روزنتال" کا مقالہ عبدالرحمان بدوی کی کتاب "الموت والعبقریۃ" میں اور "کارل بروکلمان" کا مقالہ ان کی تصنیف "المنتقی من دراسات المستشرق" میں موجود ہے۔ ان دونوں مقالات میں قدیم وجدید عربی ادب میں اس صنف کی مختلف شکلوں کا جائزہ لیا گیا ہے لیکن ان کا انداز خالصۃً تاریخی ہے۔ بعد میں اسی طرز پر مشہور مصری ادیب اور محقق ڈاکٹر شوقی ضیف نے "الترجمۃ الشخصیۃ" کے عنوان سے ایک رسالہ تحریر کیا۔ اس کے فوراً بعد اس موضوع سے متعلق بعض مفید کوششیں سامنے آئیں۔ ان میں ڈاکٹر احسان عباس کی "فن السیرۃ"، ڈاکٹر عبدالمحسن طٰہٰ بدر کی "تطور الروایۃ العربیۃ الحدیثۃ فی مصر" اور ڈاکٹر ماہر حسن فہمی کی "السیرۃ فن وتاریخ" خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ بلاشبہ یہ اپنے موضوع سے متعلق بہترین کاوشیں ہیں لیکن چونکہ فن خود نوشت کے علاوہ عمومی سیرت نگاری اور ناول نگاری سے بحث کرتی ہیں اس لئے وہ اس صنف کے لئے زیادہ صفحات مخصوص نہیں کر سکے تاہم انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ عملی وتحقیقی نوعیت کا ہے اور اسمیں فن سے متعلق بیشتر مسائل کا احاطہ کیا گیا ہے۔ ادھر کچھ عرصہ پہلے ڈاکٹر یحییٰ ابراہیم عبدالدائم کی طرف سے "الترجمۃ الذاتیۃ فی الادب الحدیث" کے نام سے ایک انتہائی مفید اور تحقیقی

کتاب منظر عام پر آئی ہے اس میں انھوں نے موجود اور دستیاب عربی و مغربی ذرائع سے کام لیا ہے۔ ان کا خاص وصف یہ ہے کہ انھوں نے عربی خود نوشت نگاری کی ادبی و فنی حیثیت پر زیادہ وضاحت سے کلام کیا ہے۔ اسطرح عربی زبان میں یہ کتاب اپنے موضوع سے متعلق ایک منفرد کاوش قرار دی جا سکتی ہے۔

میں نے اس مقالے کی تکمیل میں مذکورہ تمام کتابوں سے مدد لی ہے۔ ان کے علاوہ عربی ادب اور اس کے فنون سے متعلق بعض کتابیں بھی میرے لئے مفید ثابت ہوئی ہیں۔ لیکن میرے سامنے سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ میرا موضوع ۱۹۵۲ء کے بعد کی مطبوعہ خود نوشت سوانح عمریوں سے متعلق تھا۔ جبکہ مذکورہ کتابوں میں بیشتر کی سن طباعت ۱۹۵۲ء کے آس پاس ہے۔ ایک یا دو کتابیں گرچہ بعد میں شائع ہوئی ہیں لیکن ان میں بھی میرے موضوع سے متعلق بہت کم مواد موجود ہے، حتی کہ ڈاکٹر یحیی ابراہیم کی مذکورہ کتاب جو میرے تحقیقی کام میں ایک اہم معاون ستون کی حیثیت رکھتی ہے، کا زیادہ تر حصہ ۱۹۵۲ء سے قبل کی مطبوعہ خود نوشت سوانح عمریوں کے بحث و تجزیہ پر مشتمل ہے۔ اس طرح میں نے اپنے مقالہ میں بعض ایسی کتابوں کا احاطہ کیا ہے جن پر شاید عربی زبان میں بھی کوئی بحث موجود نہیں ہے۔ یہ محض اللہ کے فضل و کرم کا نتیجہ ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ میرے مقالہ کے عنوان میں ۱۹۵۲ء کی تحدید کیوں کی گئی ہے۔ اس سے پہلے کی مطبوعہ خود نوشت سوانح عمریوں کو کس بنیاد پر نظر انداز کر دیا گیا ہے؟ اس کا مختصر اور صحیح جواب تو یہ ہے کہ مجھ سے پہلے میرے شعبہ کے ایک سینئر رفیق تحقیق ڈاکٹر مؤید عبد الستار عراقی صاحب نے ۱۹۵۲ء سے پہلے کی مطبوعہ خود نوشت سوانح عمریوں پر

اپنا تحقیقی مقالہ پیش کر کے پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔ یہ مقالہ استاذ محترم پروفیسر محمد راشد ندوی صاحب کی زیر نگرانی تحریر کیا گیا تھا۔ بعد میں اسی ایک مفید تلخیص استاذ محترم کی زیر ادارت شائع ہونے والے ہندوستان کے سب سے مؤقر اور تحقیقی مقالہ "المجمع العلمی الھندی" کی حالیہ اشاعتوں میں علمی حلقوں کے سامنے آئی ہے۔ میں نے فی الواقع ڈاکٹر موصوف کی تحقیق کو آگے بڑھایا ہے۔ میرا یہ کام ڈاکٹر موصوف کے کام سے بہر حال کمتر اور فروتر ہے لیکن سن و ماہ کے اختلاف کی وجہ سے اس کی اپنی ایک الگ شناخت ہے۔ اس کا اعتراف مختصراً غور و فکر کے بعد بآسانی کیا جا سکتا ہے لیکن ۱۹۵۲ء کی تحدید کی ایک دوسری دلیل بھی پیش کی جا سکتی ہے وہ یہ کہ ۱۹۵۲ء مصری تاریخ کا ایک اہم سن ہے۔ اس سال مصری فوج نے شاہ فاروق کا تختہ الٹ کر مصر سے شہنشاہیت کا ہمیشہ کیلئے خاتمہ کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی مصری سیاست میں برطانوی سلطنت کا بچا کھچا اثر بھی جاتا رہا۔ اسی کے آس پاس دوسرے عرب ممالک بھی سامراجیت کے شکنجے سے باہر آ گئے۔ اب تقریباً ہر جگہ اپنوں کی حکومت تھی۔ ان سب حالات کا عربی ادب پر بڑا خوشگوار اثر مرتب ہوا۔ ادب میں جمہوری افکار و نظریات کا فروغ ہوا اور یہ پہلے کے بالمقابل زیادہ آزادی کے ساتھ قوم کے افکار و مسائل کی ترجمانی کرنے لگا۔ اسمیں ایک طرف ماضی کے حالات و واقعات سے نصیحت و عبرت حاصل کرنے کی ترغیب ہوتی تھی تو دوسری طرف سیاسی و معاشرتی تبدیلیوں کے باعث مختلف معاشرتی مشکلات پر غور و فکر کی دعوت ہوتی تھی اور پھر تیسری طرف عرب قوم کی تاریخی روایات، اصول زندگی اور ہمعصر مغربی ادب میں ربط قائم کرنے کی شعوری کوشش بھی ہوتی تھی۔ دوسری اصناف ادب کی طرح خود نوشت نگاری پر بھی ان حالات کا اثر پڑا۔ چنانچہ اس وقت کی

تحریر کردہ تمام سوانح حیات میں ان تمام سیاسی اور معاشرتی مسائل کا تذکرہ ہے اور ان سے نبرد آزما ہونے کی شکلوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔

یہ مقالہ کل چار ابواب اور ان کی بعض ذیلی فصلوں پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں خود نوشت سوانحی ادب کا تاریخی پس منظر، خود نوشت کی تعریف، اسکی تالیف کے محرکات، اہم اغراض و مقاصد بنیادی اجزائے ترکیبی، مشابہ اقسام اور اس سے متعلق بعض دوسرے فنی مسائل پر گفتگو کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں عربی، اردو اور انگریزی زبانوں میں موجود مصادر و مآخذ سے ممکن حد تک استفادہ کیا گیا ہے۔ اس کے دوسرے باب میں قدیم عربی سرمایے میں اس فن کے وجود، اسکی ابتدائی شکلوں، اہم خصوصیات اور اس سے متعلق بعض اہم کتابوں کا مختصر تعارف پیش کیا گیا ہے۔ اس کی دوسری فصل میں انیسویں صدی کے اندر اس فن کے ارتقاء کے اسباب، اسمیں کارفرما اہم عوامل، اس صدی میں شائع شدہ بعض خود نوشت سوانح اور ان کی امتیازی خصوصیات کا اختصار مگر جامعیت سے تذکرہ ہوا ہے۔ اس کے تیسرے باب میں بیسویں صدی کے اندر عربی خود نوشت کا اس انداز سے جائزہ لیا گیا ہے کہ اس سے ان اسباب کی نشاندہی ہو سکے جسکی وجہ سے اس صدی میں اس صنف ادب کو غیر معمولی ارتقا نصیب ہوا ہے ساتھ ہی اس کی موجودہ شکل، ہیئت، مواد، اسلوب، اغراض و مقاصد، طریقۂ کار اور محرکات پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ اس مقصد کے تحت اس صدی کی بہت سی آپ بیتیوں کا تقابلی جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کے چوتھے باب کی پہلی فصل میں ۱۹۵۲ء سے پہلے کی مطبوعہ چند اہم خود نوشت سوانح کا مختصر تعارف اور اس کی دوسری فصل میں ۱۹۵۲ء کے بعد کی مطبوعہ چند مشہور

سوانح کا تفصیلی تعارف پیش کیا گیا ۔ یہ باب مقالے کے کل صفحات کے نصف سے زیادہ پر مشتمل ہے اور یہی اس مقالے کی روح ہے ۔ اس میں ۱۹۵۲ء سے پہلے کی جن خود نوشت سوانح کا تعارف ہوا ہے ان میں طٰہٰ حسین کی "الأیام"، أحمد امین کی "حیاتی"، محمد حسین ہیکل کی "مذکرات فی السیاسۃ المصریۃ"، کرد علی کی "مذکرات"، اور سلامہ موسیٰ کی "تربیۃ سلامہ موسیٰ" شامل ہیں ۔ جب کہ ۱۹۵۲ء کے بعد کی مطبوعہ خود نوشت میں سے میخائیل نعیمہ کی "السبعون"، عباس محمود العقاد کی "أنا"، أحمد لطفی السید کی "قصۃ حیاتی"، عبد العزیز فہمی کی "ھذہ حیاتی"، شوقی ضیف کی "معی"، اور علی الطنطاوی کی "ذکریات" پر تفصیل سے نظر ڈالتے ہوئے ان کی تلخیص اور ان پر مختصر تبصرہ کیا گیا ہے ۔

عصر جدید میں عربی خود نوشت سوانحی ادب پر کام کرنا میرے لئے باعث فخر ضرور تھا لیکن ہندوستان میں رہتے ہوئے اس فن سے متعلق تمام معلومات حاصل کرنا کافی دشوار ثابت ہوا ۔ اس موضوع کی ایک، دو کتابوں کا حصول تو تقریباً ناممکن تھا، میں محترمی ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی (استاذ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ) کا جسقدر شکریہ ادا کروں کم ہے کہ انھوں نے نہ صرف یہ کہ میری حوصلہ افزائی فرمائی اور اپنے مفید علمی مشوروں سے نوازا بلکہ میرے موضوع میں ذاتی دلچسپی لیتے ہوئے اپنے ذرائع و وسائل کو استعمال کرکے میرے لئے بعض کتابوں کی فراہمی کو آسان بنایا ۔ ان کتابوں سے مجھے بڑی توانائی ملی ۔ اللہ تعالیٰ انھیں ان کے احسانات کا اجر جزیل عطا کرے ۔

اس موضوع سے متعلق بعض دوسری تصانیف جو علی گڑھ میں موجود نہیں تھیں، میں نے

ہندوستان کی بعض دوسری لائبریریوں سے حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ اس سلسلے میں جن لائبریریوں سے میں بطور خاص مستفید ہوا ان میں جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی، جواہر لال نہرو یونیورسٹی نئی دہلی، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد، ریسرچ سنٹر ان انگلش اینڈ فارن لینگویجز حیدرآباد، کالی کٹ یونیورسٹی کیرالا، ندوۃ العلماء لکھنؤ، دارالسلفیہ بنارس اور مدرسۃ الاصلاح سرائمیر اعظم گڈھ کے کتبخانے اور تحقیقی مراکز خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ میں یہ دعویٰ تو نہیں کرسکتا کہ میں نے موضوع کا حق ادا کر دیا ہے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ اپنی حد تک متعلقہ مسائل کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ بہرحال ایک طالب علمانہ کاوش ہے۔ اس میں بہت سی کمیاں اور خامیاں ہوں گی تاہم میں اللہ رب العزت کا شکر گذار ہوں کہ اس نے مجھے اپنی بساط بھر اسے خوب سے خوب تر بنانے کی توفیق عطا کی۔

آخر میں میں اپنے دل کی گہرائیوں سے ان تمام حضرات کی خدمت میں تشکر اور امتنان کے کلمات پیش کرنا اپنا خوشگوار فریضہ سمجھتا ہوں جنہوں نے اس مقالے کی تکمیل اور تدوین میں میری کسی طرح کی مدد کی۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے میں اس حقیقت کا اعتراف انتہائی ضروری سمجھتا ہوں کہ اس مقالے میں جو کچھ بھی علمی و ادبی مواد ہے، وہ استاذ محترم پروفیسر محمد راشد ندوی مدظلہ العالی کی بے پناہ شفقتوں، محبتوں اور علمی سرپرستی کا نتیجہ ہے۔ میں نے جب بھی کسی علمی اور تحقیقی مسئلے میں ان کی طرف رجوع کیا انھوں نے اپنی بے انتہا مصروفیات کے باوجود کبھی مایوس نہیں ہونے دیا بلکہ ہمیشہ ہی پدرانہ شفقت اور خندہ پیشانی سے استقبال کیا اور اپنے گرانقدر مشوروں سے نوازا، اور پھر آخیر میں انھوں نے میرے مقالے کا ایک ایک

خود پڑھ کر اس میں مناسب اصلاح، ترمیم اور تبدیلی کی۔ یہ میرے لئے عظیم سعادت ہے کہ مجھے آپ کی فوق آور علمی شخصیت سے استفادہ کا موقع ملا۔ میں رب ذوالجلال سے دست بدعا ہوں کہ مستقبل کے ہر موڑ پر ان کی کرم فرمائیاں میرے شامل حال رہیں۔

میں شعبۂ عربی کے سربراہ اور مشفق استاذ پروفیسر عبدالباری صاحب کا بھی ممنون کرم ہوں، انھوں نے تحقیق کے مشکل سفر کے دوران میری رہنمائی میں کسی قسم کا دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ ان کی باتیں اور مشورے میرے لئے نقوش راہ ثابت ہوئے۔ مجھے ان سے خاص طور سے تحقیق کے اصول و مبادی کی فہم و تفہیم میں کافی مدد ملی۔ میں شعبۂ عربی کے تمام اساتذہ خاص طور سے ڈاکٹر سید کفیل احمد قاسمی صاحب، ڈاکٹر محمد صلاح الدین عمری صاحب اور ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی صاحب کا مشکور ہوں۔ مقالے کے سلسلے میں یہ لوگ میری حوصلہ افزائی کرتے رہے اور تحقیق کی مشکلات میں ثبات قدمی کی تلقین کرتے رہے۔ مؤخر الذکر کا میرے اوپر یہ خصوصی احسان ہے کہ انھوں نے ہمیشہ اس مقالے کو جلد از جلد مکمل کرنے کی تلقین کی اور اس سلسلے میں اپنا ہر ممکن تعاون پیش کیا۔

یونیورسٹی کے دیگر اساتذہ میں سے میں ڈاکٹر اشتیاق احمد ظلی صاحب، پروفیسر وسیم احمد صاحب اور ڈاکٹر ظفر الاسلام صاحب اصلاحی کا تہہ دل سے مشکور ہوں۔ مجھے اس یونیورسٹی میں ان کی سرپرستی اور رہنمائی کا شرف پہلے دن سے حاصل رہا ہے۔ اس مقالے کی تکمیل میں ان بزرگوں کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ ان کی ہمت افزائی اور مشوروں سے مجھے بڑی توانائی ملی۔ ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی صاحب نے تو مشوروں سے بڑھ کر عملی تعاون میں بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ خدا انھیں اس کا بہترین اجر عطا کرے۔

میں اپنے احباب اور عزیزوں میں ابوطلحہ اصلاحی، سکندر علی اصلاحی، محمد راشد اعظمی اور محمد اسلم کا خاص طور سے احسان مند ہوں۔ ان سے مجھے اپنے کام کی تکمیل میں مختلف طرح کی مدد ملی۔ اس موقعے پر میں شعبۂ عربی و اسلامیات کی مشترک لائبریری کے ذمہ داران بالخصوص یوسف علی خان صاحب اور کبیر احمد صاحب کا شکریہ ادا کرنا اپنا اخلاقی فریضہ سمجھتا ہوں کہ انھوں نے موضوع سے متعلق تمام مصادر و مراجع سے استفادہ کی شکلوں کو میرے لئے آسان بنایا۔

میں اس مقالے کے آخیر میں اپنے والدین کی خدمت میں چند کلمات پیش کرنا چاہتا تھا لیکن صحیح بات یہ ہے کہ الفاظ میرے جذبات کی ادائیگی سے قاصر ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنی تمام آسائشوں اور راحتوں کو قربان کر کے میرے لئے حصولِ علم کو ممکن بنایا، اور مجھے ہر طرح کی ذمہ داریوں سے آزاد رکھ کر تحقیق کیلئے مطلوبہ یکسوئی عطا کی۔ حالات کی ستم ظریفی دیکھئے کہ اس وقت جب کہ میں اپنے کام سے فارغ ہو رہا تھا، وہ دونوں صاحب فراش ہیں۔ میں اس وقت صرف یہ دعا کر سکتا ہوں کہ اے میرے رب! تو انھیں صحت و سلامتی کی دولت سے نواز دے اور مجھ پر ان کا سایہ تادیر قائم رکھ۔

رب ارحمھما کما ربیانی صغیراً ٥

صفدر سلطان اصلاحی

۲۴ر جولائی سنہ ۱۹۹۳ء

بابِ اوّل

خود نوشت سوانح نگاری

ایک فنی تجزیہ

تاریخی پس منظر:- نسل انسانی نے اپنی نمود و بقا کیلئے مادی اور روحانی سطح پر طرح طرح کے ذرائع ابلاغ و اظہار وضع کیے ہیں۔ اظہار ذات کا یہ ترکہ نسلاً بعد نسلٍ قوموں کے تاریخی تناظر میں مختلف مراحل سے گزرتا رہا یہاں تک کہ مہذب قوموں نے فنونِ لطیفہ کو اپنی ذات اور اس کے متعلقات کے اظہار کا موثر ترین ذریعہ بنا لیا، چنانچہ اگر کسی بھی فن لطیف کا تحلیل و تجزیہ کیا جائے تو اس کے پس پشت انسان کی اپنی خواہش نمود اور خود اظہاریت کا جذبہ ہی کارفرما نظر آئے گا۔ سر دست تمام فنون سے صرف نظر کر کے صرف یہ دیکھنا ہے کہ فن خود نوشت کے ذریعہ انسان کے مذکورہ جذبہ اور خواہش کی کس حد تک تکمیل ہو سکی؟

خود نوشت سوانح نگاری کا آغاز اور ارتقاء صدیوں پر محیط ہے۔ انسان نے اپنی ذات اور اپنی انا کا اظہار نت نئے پیرایوں میں کیا ہے۔ اس کا یہ عمل اس کے اس جذبۂ تجسس کی دلیل ہے جس کے باعث اسے اپنے گرد و پیش کو جاننے اور سمجھنے کا بے پناہ شوق ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ کائنات کے اسرار و رموز کو دریافت کرنے کی سعی کرتا ہے۔ فی الواقع یہی سعی و کوشش اسکی عظمت اور اسکی بقا کا ضامن ہے۔ کائنات کے بے پناہ مسائل اور رازہائے سربستہ کیساتھ اپنی ذات سے متعلق بھی بہت سے سوالات اس کے ذہن میں پیدا ہوتے رہتے ہیں، اس کا جواب اسے اپنے ہی پاس سے تلاش کرنا ہوتا ہے۔ انسانی زندگی، متنوع اور گوناگوں تجربات سے مرکب ہے۔ ہر سانس میں اس کا نیا

رنگ اور ہر دن نیا عالم ہے۔ انسان زندگی کی اس متغیر صورتحال کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے اور پھر اپنے تجربات و محسوسات کو دوسروں تک منتقل کرنا چاہتا ہے۔ یہ انسانی جبلت ہے اور آرٹ بھی ہے، کیونکہ احساسات کے اظہار کا دوسرا نام ہی فن ہے۔ اس اظہار سے فن کار کی داخلی بےچینی ختم ہوتی ہے۔ وہ صرف دوسروں کو آگاہ ہی نہیں کرتا بلکہ خود کو بھی تسکین دیتا ہے، کیونکہ اپنی ذات بے کنار تک پہنچنے کا اس کے پاس یہی ایک راستہ ہے۔ پس اظہار ذات اگر فن ہے تو خود نوشت فن کی ایک اعلیٰ اور خالص صورت۔ نفسیاتی اعتبار سے یہ فنکار کے ان بنیادی تقاضوں کی تکمیل کرتی ہے جو اس کی ذات کی تہوں کے اندر پوشیدہ ہیں اور خود ہی فن کا سرچشمہ ہیں، تاریخی اعتبار سے حقیقت سے قریب ہونے کی وجہ سے یہ ان لوازمات پر پوری اترتی ہے جو ایک اچھی تاریخ کیلئے ضروری ہیں۔

تعریف

لفظی اعتبار سے خود نوشت سوانح حیات میں اپنی کہانی خود لکھنے کی شرط ہے۔ "Oxford Dixtionary" میں "Autobiography" کے ضمن میں درج ہے "کسی شخص کی کہانی خود اس کی لکھی ہوئی۔ اصل الفاظ یہ ہیں "The Story of one ss life written by himself"[1] عربی زبان کی تمام لغات میں خود نوشت سوانح حیات کیلئے مستعمل لفظ "السیرۃ الذاتیۃ" کا معنی یہی بتایا گیا ہے یعنی "کتابۃ احد من ادباء حیاتہ بقلمہ"

جہاں تک خود نوشت سوانح نگاری کے اصطلاحی مفہوم کا سوال ہے تو اس سلسلے میں سب سے پہلی حقیقت یہ ہے کہ باوجود کافی توجہ کے علماء مغرب و مشرق

---

[1] The Oxford English Dictionary Page 801 / 1984
IInd Edition Volume 1 Clarendon Press Oxford

اس ادبی صنف کے کسی ایک جامع اور معتبر مفہوم پر متفق نہیں ہوئے ہیں تاہم ان کی طرف سے جو مختلف تعریفیں پیش کی گئی ہیں ان کی روشنی میں اس ادبی اصطلاح کے خدوخال بڑی حد تک ابھر کر سامنے آ جاتے ہیں، چنانچہ "Encyclopedia Britannica" میں اس کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

"خود نوشت سوانح نگاری کا سوانح نگاری سے بہت قریبی تعلق ہے یا یہ کہ خود نوشت نگاری سوانحی ادب کی ایک خاص شکل ہے۔ یہ ایک شخص کے حالاتِ زندگی پر مشتمل ہوتی ہے جو اس نے خود قلم بند کئے ہوں۔ اس لئے یہ پوری نہیں ہوتی"[1]

مذکورہ بالا بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ خود نوشت نگاری کا تعلق سوانح نگاری سے بہت گہرا ہے۔ گویا سوانح نگاری کی بعض خصوصیات خود نوشت سوانح نگاری میں پائی جاتی ہیں۔ اس تعریف میں خود نوشت سوانح نگاری کو سوانحی ادب کی ایک خاص شکل قرار دیا گیا ہے، اس میں یہ نکتہ پنہاں ہے کہ خود نوشت سوانح حیات سوانح نگاری کے دائرے میں شامل ہے لیکن اپنا آزاد، منفرد اور ممتاز مقام بھی رکھتی ہے۔

یوں تو خود نوشت ایک شخص کے حالاتِ زندگی پر مشتمل ہوتی ہے لیکن ظاہر ہے اسمیں ساری زندگی کو دہرایا نہیں جا سکتا۔ بلکہ وہ خاص خاص ادوار اور واقعات ہی اس میں شامل کئے جا سکتے ہیں جن سے مصنف کی شخصیت نمایاں ہو کر سامنے آ جائے۔ اس سلسلے میں رائے لیسکال کا یہ خیال کافی وزنی معلوم ہوتا ہے۔

"خود نوشت سوانح میں زندگی کے کسی حصہ کو ان حقیقی حالات کے تحت دہرایا جاتا ہے جن میں ان واقعات نے جنم لیا۔۔۔۔ خود نوشت نگار کی ذات ہی اس کا محور ہوتی ہے

---

[1] The Encyclopeedia Britannica v.2 Edi 15th Page 1010 University of Chicago

خارجی دنیا بھی اس میں نظر آتی ہے۔ اس میں روزمرہ کے کاروبار اور اس کے ماحول کی وہ جھلک نظر آتی ہے جس میں مصنف کی شخصیت کی تشکیل ہوتی ہے[1]"

اس کا مطلب یہ ہوا کہ خودنوشت نگاری کی ذات ہی اس کی تصنیف کا محور ہوتی ہے۔ باقی حالات یا حادثات اس محور کے گرد گردش کرتے رہتے ہیں۔ اس میں خارجی دنیا محض اس لئے نظر آتی ہے کہ روزمرہ کے کاروبار اور اشخاص سے تعلقات میں صاحب خودنوشت کی شخصیت بنتی ہے۔

بہرحال مصنف کی دلچسپی شعوری اور غیر شعوری طور پر اپنی تصویر کشی پر ہونا، خودنوشت کا اصل جوہر ہے۔ یہ عنصر تقریباً ہر تعریف میں پایا جاتا ہے، لیکن یہ تصویر کشی کوئی آسان کام نہیں ہے۔ ایک کامیاب خودنوشت کی ایک اہم شرط یہ ہوتی ہے کہ اس میں ان یادوں اور واقعات کی وہ ساری تفصیلات بھی درج ہوں جنہیں عام حالات میں انسان ظاہر کرنا پسند نہیں کرتا۔ بعض حقائق کے اظہار میں اس کی انا، اس کی تہذیبی قدریں ماحول اور بعض دوسرے عوامل اسے ایسا کرنے سے باز رکھنے کی کوشش کرتے ہیں، دوسری طرف اس کا ضمیر راست بازی پر اسے مجبور کرتا ہے اور یہیں سے اس کی ذات سے تصادم شروع ہوتا ہے۔ اسی بات کو ڈرنکن باؤن نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے۔

"خودنوشت کیا ہے؟ کسی مرد یا عورت کا اپنی ذات سے تصادم کا نام ہے[2]"

مشرقی دانشوروں نے بھی خودنوشت کو اسی انداز سے پرکھا ہے اور اس کی تعریفیں کی ہیں۔ عربی زبان کے مشہور ادیب اور نقاد ڈاکٹر احسان عباس نے اپنے مخصوص انداز میں اس کی تعریف پیش کی ہے، وہ لکھتے ہیں:۔

---

[1] بحوالہ اردو خودنوشت ــــ وہاج الدین مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی ۱۹۸۹ء ص ۳۳۰-۳۳۱

[2] " " " ص ۳۶

"خود نوشت سوانح نگار کیلئے یہ مناسب ہے کہ وہ اپنی سیرت فطری انداز میں پیش کرے اور قاری پر بلاوجہ کی چیزیں جبراً مسلط نہ کرے کیونکہ تمام امور کا محض روکھے پھیکے انداز میں تذکرہ کر دینے سے حقیقتوں کا ثبات یا نقیض نہیں ہوتی ہے[1]"

"میری رائے یہ ہے کہ خود نوشتیں بقا و دوام کے اسی قدر حصے سے بہرہ ور ہوتی ہیں جتنا خود نوشت سوانح نگار اپنی داخلی اور خارجی کشمکش کو پیش کرنے میں کامیابی حاصل کرے[2]"

اردو زبان کی ایک معروف علمی و ادبی شخصیت طفیل احمد اسکی تعریف اس طرح کرتے ہیں۔

"مختصر الفاظ میں آپ بیتی کسی انسان کی زندگی کے تجربات و مشاہدات، محسوسات و نظریات کی مربوط داستان ہوتی ہے جو اس نے سچائی کے ساتھ بے کم و کاست قلم بند کر دی ہو جس کو پڑھ کر اس کی زندگی کے نشیب و فراز معلوم ہوں۔ اس کے نہاں خانوں کے پردے اٹھ جائیں اور ہم اس کی خارجی زندگی کی روشنی میں پرکھ سکیں[3]"

مذکورہ بالا تعریف خود نوشت سوانح کی مکمل اور بھرپور تعریف ہے۔ خود نوشت انسان کی زندگی کے واقعات، مشاہدات، نظریات اور محسوسات کی داستان ہوتی اور یہ سچی داستان ہوتی ہے۔ مگر مذکورہ تعریف میں بے کم و کاست کی شرط غیر مناسب معلوم ہوتی ہے کیونکہ مختلف وجوہ کے باعث کوئی شخص اپنی زندگی بے کم و کاست نہیں لکھ سکتا ہے۔

خود نوشت سوانح حیات کی تمام تعریفوں کو سامنے رکھ کر یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ خود نوشت سوانح حیات ادب کی وہ تخلیقی صنف ہے جو کسی فرد واحد کی زندگی کے اہم ادوار پر محیط ہوتی ہے اور اس کے قلم کی رہین منت ہوتی ہے جس کے آئینہ میں اس فرد کی داخلی اور خارجی زندگی کا عکس براہ راست نظر آتا ہے اور اس کا مہذب جلوہ گر ہوتا ہے۔

---

[1] فن السیرۃ ـــ احسان عباس دار بیروت للطباعۃ والنشر بیروت ۱۹۵۶ء ص ۱۰۲

[2] " ص ۱۰۶ [3] نقوش ـ آپ بیتی نمبر ج ۱ ر ۳۲ ۱۹۶۲ء لاہور پاکستان

محرکات:- خودنوشت سوانح نگاری کے تعلق سے ایک بحث یہ کی جاتی ہے کہ اس کی تالیف کے کیا محرکات ہوتے ہیں یوں تو یہ محرکات بہت سے ہو سکتے ہیں لیکن بعض عام اور اہم محرکات درج ذیل ہیں۔

۱۔ اپنے حالات سے دوسروں کو واقف کرنا، ۲۔ اپنی شخصیت اور کردار کی اصلیت کا مرقع پیش کرنا، ۳۔ اپنے سلسلے میں پائی جانے والی غلط فہمیوں کا ازالہ کرنا، ۴۔ اپنی محنت سے حاصل کردہ ترقیات کا ذکر کر کے دوسروں کو راغب کرنا، ۵۔ اپنے زمانے کے حالات اپنے نقطہ نظر سے پیش کر کے اپنے اصولوں کی تبلیغ کرنا، ۶۔ اپنے معاصرین سے اپنے تعلق کی وضاحت کرنا اور ان کے اعمال پر تنقید کرنا۔ معاشرتی رسوم کے خلاف آواز بلند کرنا۔

خودنوشت کے محرکات کے بارے میں انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں بڑی تفصیل ہے:۔

"اس کے اسباب مختلف ہوتے ہیں منجملہ دیگر باتوں کے اخلاقی اصلاح کیلئے اپنے آپ کو پرکھنا، حسین یادوں اور پرانی باتوں کو تر و تازہ کرنا، یہ عقیدہ کہ ممکن ہے کہ اپنے تجربات دوسروں کیلئے مفید ہوں، الجھی دنیا میں اپنی ذات کی واضح سمت متعین کرنے کی کوشش، فن کارانہ اظہار کی تمنا یا شہرت و رتبہ بڑھانے کی خالصتہً کاروباری کوشش"[1]

مذکورہ محرکات میں سے سب سے زیادہ عام محرک واقعات و حادثات کی اپنے انداز میں پیشکش ہے۔ اس سلسلے میں ولیم میتھوس (William Mathews) لکھتے ہیں:۔

"بعض خودنوشت سوانح عمریوں کا آغاز نسب کے تذکرہ اور خاندان کی تاریخ سے ہوا ہے لیکن خودنوشت نگاری میں سب سے زیادہ اہم چیز ادیب کا اپنے زمانے کی تاریخ مرتب کرنا ہے۔ اس طور سے کہ اس تاریخ میں اس کا اپنا رول نمایاں ہو جائے، روزنامچوں اور خودنوشت

---

[1] The New Encyclopaedia Britannica Page No. 1009-1010

سوانح عمریوں کا یہ سب سے عام محرک ہے[1]۔"

ان محرکات کے علاوہ بھی بعض دوسرے محرکات خود نوشت کی تالیف کا سبب بنتے ہیں۔ عربی زبان کے ایک معروف ادیب اور مؤرخ "انور الجندی" نے ان میں سے بعض کا اس طرح تذکرہ کیا ہے۔

۱۔ کسی نفسیاتی الجھن کو دور کرنا، ۲۔ عمر کے ڈھل جانے کے بعد ایام شباب کی باتیں محفوظ کرنے کی خواہش، ۳۔ عشقی اور سیاسی مسائل پر تھک جانے کے بعد ہلکی تحریر لکھنے کی خواہش[2]۔"

---

[1] William Mathews and Ralph W. Rader Autobiography, Biography and Novel (P. 5)

[2] انور الجندی ـ أضواء على الأدب العربي المعاصر ص ٦٨ مكتبة دار الكاتب العربي القاهرة ١٩٦٩ م

خودنوشت سوانح عمری کی اہمیت

انسان کو حیوان ظریف اور حیوان متجسس کہا گیا ہے۔ اسے کائنات کے اسرار و رموز کو دریافت کرنے کا بیحد شوق ہوتا ہے، انسان خود اس کائنات کا اہم جزو ہے۔ اس لئے اپنی ذات سے متعلق مختلف سوالات اس کے ذہن میں اٹھتے رہتے ہیں اور ان کا جواب اسے خود دینا ہوتا ہے۔

خودنوشت سوانح نگاری کا سب سے نمایاں وصف یہی ہے کہ اس سے انسان کی ایک اہم جستجو اور طلب کی تکمیل ہوتی ہے۔ انسان اس کے ذریعہ اپنے محسوسات و تاثرات دوسروں تک پہنچاتا ہے، اس سے مصنف کی تیوریاں، اس کا تبسم زیر لب، سوچنے کا انداز اور دل کے دھڑکنے کی آواز بھی سنی جا سکتی ہے بقول غلام رسول مہر "نفس معلومات صحیحہ کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو آپ بیتی کو ہر دوسرے ذخیرۂ تاریخی اور بنائے عبرت پر ترجیح حاصل ہے"[1]۔

خودنوشت کا دوسرا نمایاں وصف یہ ہے کہ اس سے ان خیالات کی ادائیگی میں مدد ملتی ہے جو انسان کو بیحد عزیز ہوتے ہیں، انسانی خیالات کی وسعت، کثرت اور ہمہ گیری مسلم ہے تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کے باوجود وہ اظہار کی مزید راہیں تلاش کرتا رہتا ہے، خودنوشت اس کا ایک اچھا وسیلہ ہوتی ہے۔ کامیاب خودنوشت وہی ہے جسمیں انسان کی اندرونی زندگی کے تغیرات کا بیان ہو۔ اس کی مثال St. Augustine سینٹ آگسٹائن کی Confession سے دی جا سکتی ہے۔

خودنوشت کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ یہ زندگی میں ایک بار لکھی جاتی ہے اور دوسری اصناف ادب بار بار۔ اسکی وجہ سے اس بات کا قوی امکان ہوتا ہے کہ مصنف اپنی تمام تحریروں کا محاسبہ کرے اور ان کے سلسلے میں کوئی حتمی اور آخری فیصلہ صادر کرے۔ خاص طور سے یہ خودنوشت اگر کسی بڑی شخصیت کی ہوتی ہے تو اس کے بارے میں لوگوں کا تجسس اور زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ عربی

---

[1] غلام رسول مہر ۔ نقوش، آپ بیتی نمبر ۔ آپ بیتیوں کی اہمیت ص ۳۰۸

میں اسکی مثال عقاد اور احمد امین کی سوانح سے دی جا سکتی ہے ۔

خود نوشت سے مصنف کے حالات اور تجربات سے تعارف تو ہوتا ہی ہے لیکن اس سے اس کی طبیعت، ذہنیت، دبی ہوئی خواہشات اور چھپی ہوئی ذہنی الجھنوں کا بصیرت آمیز ذہنی تجزیہ کرنے کا موقع بھی ملتا ہے ۔ گویا اس سے مصنف کی نفسیات سمجھنے میں مدد ملتی ہے ۔ وہ اپنی زندگی کے سارے راز بیان کر دیتا ہے اب قاری کی صلاحیت، ذہانت اور عقل سلیم کا امتحان ہے کہ وہ کس بات کو کس نظر سے دیکھے ۔ بلاشبہ اسے صرف سطور ہی کا نہیں بلکہ بین السطور کا بھی مطالعہ کرنا چاہئے ۔ اسے مصنف کے اصلی خدوخال سمجھنے کے لئے علم نفسیات سے واقف ہونا بھی ضروری ہے اکثر کہی ہوئی باتوں سے زیادہ ان کہی باتیں بولتی ہیں ۔ لکھنے والا خود نہیں جانتا کہ وہ کسی بات کو اس مخصوص انداز میں کیوں پیش کر رہا ہے، اس کا تجزیہ وہ خود بھی نہیں کر پاتا لیکن پڑھنے والا جب اس کو اس کے حالات کے پس منظر میں پڑھتا ہے اس وقت اسے لکھنے والے کی نفسیات کا اندازہ ہوتا ہے ۔ کبھی کبھی کسی بات کی پردہ داری خود اس بات کیلئے پردہ دری بن جاتی ہے اس کا ادراک نفسیاتی اعتبار سے کیا جا سکتا ہے ۔ اس مسئلے پر اظہار خیال کرتے ہوئے انور الجندی لکھتے ہیں :-

"تمام خود نوشت سوانح عمریوں میں متفقہ طور سے بچپن اور جوانی کے احوال قلمبند کئے جاتے ہیں لیکن ہر انشا پرداز کا اپنا مزاج اور طبیعت پوری خود نوشت کے اندر غالب رہتی ہے وہ اپنے منفرد انداز سے چیزوں کو پیش کرتا ہے اور اپنے بارے میں گفتگو اپنی خواہش کے مطابق کم یا زیادہ کرتا ہے[1] ۔

" زیادہ تر خود نوشت سوانح عمریاں حزن و ملال، فقر و فاقہ اور الم و انقباض کی تصویر کشی کرتی ہیں ۔ اس کے لکھنے والوں کی پرورش غریب ماحول میں ہوئی ۔ وہ اس ماحول سے تنگ آ گئے تھے"[2] ۔ ان کے اندر اس ماحول سے بھاگ کر تعلیم یافتہ اور متمول ماحول میں جانے کی خواہش

---

[1] انور الجندی ۔ اضواء علی الادب العربی المعاصر ص ۶۹

[2] ص ۶۹

شدید تھی۔ اسمیں انھیں کسی حد تک کامیابی ملی لیکن وہاں دوسرے چیلنجز اور معرکہ آرائیاں تھیں۔"[1]

نفسیاتی اعتبار سے خود نوشت سوانحعمری کی اہمیت کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے، وہ یہ کہ اس میں مصنف اپنے ہر عمل کی نفسیاتی توجیہہ پیش کرتا ہے بلکہ اس سے بڑھ کر زندگی میں گزرنے والے قابل ذکر لمحات کی ایسی رپورٹ پیش کرتا ہے جس میں فخر و پشیمانی، افسوس و سرخوشی اور امید و ناامیدی کی پوری دنیا سمٹ آتی ہے اور پڑھنے والے کو نفسیاتی اعتبار سے مصنف کو جانچنے کا موقع ملتا ہے وہ اس کے پسندیدہ و ناپسندیدہ واقعات کے پیش کرنے کے انداز سے اس کی کمزوریاں خود پالیتا ہے۔

خود نوشت کی تاریخی اہمیت بھی مسلم ہے۔ کہنے کو تو خود نوشت فرد واحد کی آپ بیتی ہوتی ہے لیکن چونکہ وہ دوسروں سے غیر متعلق نہیں رہتا اور اس پر حالات کے اثرات بھی مرتب ہوتے ہیں اس لئے دانستہ یا نادانستہ طور پر اس کی اپنی تاریخ، اس عہد کی تاریخ بن جاتی ہے۔ تاریخ کی عام کتابوں سے ہمارے سامنے اس عہد کی مخصوص زاویہ سے بنائی ہوئی تصویر آجاتی ہے لیکن اس عہد کی روح نہیں آپاتی۔ کیونکہ ہر عہد کی روح اس کی عوام ہوتے ہیں اور ہماری تاریخوں میں عوام کے بجائے بادشاہوں کی داستانیں ہوتی ہیں۔ یا کچھ دوسری باتیں جن کا عوام سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ہے۔ یہ صرف آپ بیتی ہے جو عوام کا طرز زندگی، رسوم و رواج اور دلچسپی کے سازوسامان کا تذکرہ کرتی ہے۔ خود نوشت کا یہ پہلو اپنے اندر بے انتہا افادیت رکھتا ہے۔[2]

یہ ممکن ہے کہ کچھ آپ بیتیوں میں زمانے کا ذکر کم ہو لیکن عموماً آپ بیتیاں اپنے عہد کے حالات سے بے نیاز نہیں ہوتی ہیں۔ اگر ان کو یکجا کرلیا جائے تو بہترین نتائج اخذ کئے جاسکتے ہیں قدیم ادب میں تقریباً ہر تاریخ اور تذکرے میں مصنف کے احوال زندگی اس کے قلم سے موجود ہیں اگر ان کو یکجا کرلیا جائے تو بہترین نتائج اخذ کیے جاسکتے ہیں۔[3] اگر تاریخ کی کتابوں کے ساتھ جنہیں

---

[1] انور الجندی — اضواء علی الادب العربی المعاصر ص ۶۹

[2] انیس المقدسی — الفنون الادبیۃ ص ۵۵۱-۵۵۵ دار الکتاب العربی بیروت ۱۹۶۲م

[3] شوقی ضیف — السیرۃ الشخصیۃ ص ۵-۶ دار المعارف القاہرۃ ۱۹۵۶م

واقعات کی کھتونی کہا جاتا ہے ان زمانوں کی اُتر پتیاں ملالی جائیں تو وہ چیز بخوبی تیار ہو سکتی ہے جسے عوام کی سرگرمیوں کی تاریخ کہا جاتا ہے اور جس پر اہل مغرب کو ناز ہے۔ غالباً خود نوشت کی اسی اہمیت کے پیش نظر اسے "فرد کی زندگی کا تاریخی مطالعہ" قرار دیا گیا ہے اور ان چیزوں کو اس سے خارج کر دیا گیا ہے جو "تاریخی صداقت" کی حامل نہ ہوں۔[1]

مواد، ہیئت اور اسلوب

خود نوشت چونکہ اظہار ذات کی سب سے اصلی اور مکمل شکل ہے اس لئے اس کو فن کی بھی ایک اصلی صنف تصور کیا جاتا ہے، یہاں صرف اس پر غور کرنا ہے فن کے جو مطالبات اور تقاضے ہوتے ہیں، خود نوشت انھیں کس حد تک پورا کرتی ہے، اس سلسلے میں سب سے پہلی بحث خود نوشت کے موضوع اور مواد کی آتی ہے۔ فن کی مختلف شکلوں میں مواد کی صورت کا اختلاف ہے۔ یوں بھی مواد کوئی ایسی چیز نہیں ہے جسے ریاضی کے اصولوں پر پرکھا جائے۔ بلاشبہ خود نوشت نگار کا مواد اس کی اپنی ذات ہوتی ہے۔ اس کے سامنے تاثرات، جذبات اور مشاہدات کا لامتناہی سلسلہ ہوتا ہے۔ خود نوشت نگار کو ان ہی کی مدد سے اپنی کتاب کی تالیف کرنی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس سے مصنف کے ذہنی ارتقا اور طرز فکر کا اظہار ہوتا ہے اور کہیں کہیں تاریخی واقعات، تہذیبی اقدار اور نئی پرانی روایات کا ٹکراؤ بھی نظر آتا ہے۔ مختصر یہ کہ چونکہ خود نوشت سوانح نگار کی زندگی اس کا موضوع ہوتی ہے اور اس کے یہاں اس کی شخصیت ہی کو بنیادی اور مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ اس لئے خود نوشت میں لکھنے والے کی زندگی کے اہم ادوار، واقعات اور حالات ہی اس کا مواد ہوتے ہیں جن کی ترتیب اور انتخاب سے اس کا طرز فکر اور نقطۂ نگاہ بھی جھلکتا ہے۔[2]

---

[1] Oxford Dictionary Oxford Press Page 801

[2] احسان عباس ۔ فن السیرۃ ص ۱۰۶

فن کے تعلق سے خود نوشت سوانح کے باب میں ایک اہم بحث ہیئت کی کی جاتی ہے۔ دوسری نثری اظہار کی طرح خود نوشت کی ہیئت بھی سیال ہوتی ہے اس کی بہت سی خارجی شکلیں ہو سکتی ہیں مگر اس سیال حالت سے چند اصول ضرور وضع کئے جا سکتے ہیں۔ یہ بات واضح رہے کہ ادبی ہیئت میں ہیئت کا اطلاق محض ظاہری شکل پر نہیں ہوتا ہے بلکہ اس میں فن پارے کی داخلی ساخت، معانی اور خصوصیات بھی شامل ہوتی ہیں۔ ہیئت کے دائرے میں جذبات و تاثرات کے علاوہ اس کا انداز پیشکش، زبان و بیان کی نزاکتیں، مواد کو الفاظ کے پیکر میں ڈھالنے کے تمام طریقے، الغرض سب کچھ شامل ہیں[1]۔ خود نوشت کا مصنف اپنے مخصوص اسلوب اور موزوں ہیئت میں اپنی زندگی کی داستان کو دہراتا ہے۔ اس کی سوانح حیات ایک ایسا سیال ہے جو ہر شکل میں ڈھل سکتا ہے، خود نوشت کے مصنف کو مواد کیلئے ہیئت کی تلاش نہیں کرنی پڑتی بلکہ یہ مواد لچکدار ہوتا ہے اور خود بخود اپنی فطری ہیئت میں ڈھل جاتا ہے۔ بہرحال خود نوشت کی ایک واضح اور مکمل ہیئت ہونا ضروری ہے۔ اگر مصنف اسے پیش نظر رکھ کر اپنی منطقی و شعوری صلاحیتوں کا استعمال کرے تو ہم اس کی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے واقف ہو سکیں گے اور ہمیں اس میں کمال، وحدت اور مقصدیت نظر آئے گی۔

اسی سے متعلق ایک بحث اسلوب کی بھی ہے۔ اسلوب کا انگریزی ترجمہ اسٹائل "Style" ہے۔ ادبی اصطلاح میں اس لفظ کا معنی قلم کے ذریعہ ادبی نقوش کو اجاگر کرنا ہے۔ لغت میں اس کا معنی روش، راستہ اور ڈھنگ درج ہے۔ مصنف مواد کو جس طریقے سے پیش کرتا ہے وہی اس کا اسلوب ہوتا ہے۔ ہر شخص کا اسلوب، اپنی نوعیت کا منفرد اسلوب ہوتا ہے ممکن ہے کہ کہیں کہیں یکسانیت ہو لیکن بالکل ایک ہونا ناممکن ہے[2]۔ خود نوشت

---

[1] ڈاکٹر وہاج الدین ــــ اردو خود نوشت ص ۵۳ - ۵۲

[2] یحیی ابراہیم عبدالکریم ــــ الشخصیۃ الذاتیۃ ص ۵۴ - ۱۵۳ دار احیاء التراث العربی بیروت

کیلئے نثری پیرایۂ بیان زیادہ مناسب مانا گیا ہے اور نثری اسلوب کیلئے سادگی، سلاست، اختصار، جامعیت اور وضاحت ضروری خصوصیات ہیں۔ پس خود نوشت کیلئے بھی یہ ساری خصوصیات ضروری ہیں البتہ موضوع، مقصد اور مخاطب کے فرق سے ان کے تناسب میں کمی و بیشی ہو سکتی ہے۔ خود نوشت میں بول چال کی زبان، ادبی زبان، تخلیقی زبان اور علمی زبان ہر ایک سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے مگر یہ مصنف کے مخصوص اسلوب میں گھل مل کر محض خام مواد کے طور پر کام میں آتی ہے۔ چونکہ زندگی کے بہت سے واقعات اور جذبات ایسے ہوتے ہیں جن کا اظہار ایک مخصوص اسلوب میں ہی ممکن ہوتا ہے ایسی صورت میں خود نوشت کا مصنف وہی زبان استعمال کرتا ہے جو اس موقعہ کیلئے ناگزیر ہوتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ بعض اوقات ایک ہی خود نوشت میں اسالیب کا تنوع پایا جاتا ہے جو فن خود نوشت کا تقاضہ بھی ہے۔

چونکہ اسلوب مصنف کی شخصیت کا جز ہوتا ہے اس لئے ہر آپ بیتی اپنی نوعیت کے اعتبار سے مصنف کی شخصیت کی تابع ہوتی ہے۔ وہ اتنی نئی اور غیر متوقع ہو سکتی ہے جتنی کہ ایک اجنبی شخصیت۔ یہ صحیح ہے کہ کسی خود نوشت کی آب و تاب کا انحصار اس کے حسن بیان اور طرز ادا کے اچھوتے پن پر ہوتا ہے۔ یہ کام ایک منجھا ہوا ادیب ہی کر سکتا ہے۔[1]

ہمارے پاس موجودہ خود نوشت سوانح عمریوں میں جو اسالیب بہت زیادہ عام اور متداول ہیں، ان میں بیانیہ اسلوب، علمی و تحقیقی اسلوب اور ناولی و افسانوی اسلوب خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

---

[1] النور الجندی ـــــ اضواء علی الادب العربی المعاصر ص ۶۹

اہم اجزائے ترکیبی:۔ خود نوشت سوانح حیات کے موضوع، مواد، اسلوب اور ہیئت پر گفتگو کرنے کے بعد ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کی دوسری خصوصیات کا تعین کیا جائے۔ یوں تو اس طرح کی خصوصیات کئی ایک ہو سکتی ہیں لیکن غور کرنے کے بعد تین شرطوں کی ضرورت اور اہمیت کا احساس اور زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ یہ وہ عناصر ہیں جن کی تلاش کسی جامع خود نوشت سوانح حیات کے قاری کو لازماً ہوتی ہے۔

۱۔ سچائی ۲۔ شخصیت ۳۔ فن

سچائی:۔ سچائی اور حقیقت نگاری شخصی تحریر کیلئے سب سے زیادہ ضروری ہے۔ دراصل سچائی ہی وہ عروج ہے جسکی بدولت خود نوشت کے صفحات میں ہماری زندگی دوبارہ متحرک ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ خود نوشت کی دوسری شرائط کے مقابلے میں اس شرط سے عہدہ برآ ہونا سب سے زیادہ مشکل ہے۔ اپنے گزرے ہوئے شب و روز کو ذہن کے پردوں پر مجسم کر یکجا کرنا، بچپن کی عکاسی کیلئے وہی بے لوث سادگی اور بے طرز معصومیت طاری کر لینا اور جوانی کی تصویر کشی کیلئے جذبات اور احساسات میں حرارت اور تازگی پیدا کر لینا آسان کام نہیں ہے۔ ایک اچھی خود نوشت کیلئے سب سے بڑی رکاوٹ اسکی ٹرنا ہے کوئی بھی نہیں چاہتا کہ وہ اپنے اعترافات کے ذریعہ اپنی اہمیت کم کرے اس لئے انانیت پرست اور شخصیت پرست کبھی اچھی سوانح حیات نہیں لکھ سکتا۔ جیسا کہ گوانٹن نے اپنی خود نوشت میں لکھا ہے "انسانی فطرت میں جو بزرگ اور اپنی زندگی کیساتھ جو محبت ہے اس کے لئے بڑا دشوار ہے کہ وہ اپنی سرگزشت کا تجزیہ کرے اور اپنی خامیوں اور غلطیوں کو یکجا کرے"[1]۔

---

[1] بحوالہ، ڈاکٹر صبیحہ انور ــ اردو میں خود نوشت سوانح حیات ص ۲۴ لکھنؤ ناشر پریس ۱۹۸۲ء

عربی زبان کے مشہور مہجری ادیب اور ناقد میخائیل نعیمہ اپنی خود نوشت میں لکھتے ہیں :-

"جو کچھ میری سوانح حیات میں سے تمہارے سامنے منکشف ہو چکا ہے وہی میری کل زندگی نہیں ہے، پھر جو کچھ واضح بھی ہوا ہے اس میں سب کچھ اصلی نہیں ہے۔ دکھاوے کے غیر حقیقی اجزاء زیادہ ہیں"[1]۔

سچائی کی راہ میں انسان کی قوت یادداشت بھی حائل ہوتی ہے۔ انسان بعض چیزوں کو بھول جاتا ہے اور بعض چیزوں کو بالکل غلط طور سے یاد کر لیتا ہے، اور بعض چیزوں کو وہ قصداً بھول جانے کی خواہش کرتا ہے۔ فی الواقع انسان کی قوت یادداشت ہمہ وقت تحلیل و تجزیہ کے عمل میں مصروف رہتی ہے۔ اس تجزیاتی عمل میں نئے واقعات پرانے واقعات کی جگہ لے لیتے ہیں خاص طور سے غم و اندوہ اور حزن و ملال کے مواقع اور اسی طرح خوشی و شادمانی کے مواقع ایک دوسرے کی یادوں میں باہمی اشتراک اور تبادلہ کر لیتے ہیں۔ اس وجہ سے خود نوشت میں خالصتہً سچائی کی تلاش ایک سعی لاحاصل ہے بعض خود نوشت نگاروں نے اپنی خود نوشت میں سائنٹفک نقطۂ نظر سے کام لینے کا تہیہ کیا لیکن انہیں بہت جلد اعتراف کرنا پڑا کہ ان کے بچپن کی یادیں گنتی کی ہیں اور ان کی حیثیت بھی محض تاثرات کی ہے[2]۔

سچائی کی راہ میں دوسری رکاوٹوں میں خود یہ بات ہے کہ زندگی حقیقت اور خیال سے مرکب ہے، خود ہماری زندگی کے بعض افکار، خیال کی وحی سے وجود میں آتے ہیں پس خود نوشت میں یہ خیالات بھی چپکے سے داخل ہو جاتے ہیں۔ دوسری خود نوشت نگاری کی یہ کوشش کہ وہ بعض امور پر پردے ڈال دے اور بعض کو خوب بڑھا چڑھا کر پیش کرے اس طرح

---

[1] میخائیل نعیمہ ــ السبعون، المرحلۃ الثالثۃ ص ۲۳۱ دار صادر دار بیروت ۱۹۵۹ء

[2] إحسان عباس ــ فن السیرۃ ص ۱۱۳

وہ اپنی پسندیدہ تصویر لوگوں کے سامنے پیش کرے اسی لئے اعتراضات کو بھی حقیقت کے نظریے سے خارج کیا گیا ہے کیونکہ یہاں صاف گوئی اور بے باکی کے پردے میں طے شدہ مقاصد کی تکمیل کی جاتی ہے۔

ان اسباب کی بنا پر خود نوشت میں مکمل سچائی کا پایا جانا ممکن نہیں اسی لئے گوئٹے نے اپنی خود نوشت کے مقدمے میں لکھا ہے :۔

"میں نے اپنے علم کے مطابق کسی چیز کو تبدیل نہیں کیا ہے تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ میری لاعلمی میں بہت سی چیزیں تبدیل ہو گئی ہیں"[1]۔

یہاں یہ بات واضح رہے کہ خود نوشت میں سچائی سے مراد مصنف کا اپنے واقعات کے تدریجی ارتقاء، ان کی سچی ترجمانی اور پیشکش کا پابند ہونا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اسمیں تخلیقی رنگ نہیں ہو سکتا ہے۔ تخلیقی رنگ تو ہوگا ہی، البتہ مبالغہ آمیزی نہیں ہوگی۔ خود نوشت میں خیالات سے مدد لینا بیحد ضروری ہے لیکن اس طرح کہ حقیقت متاثر نہ ہو۔ خود نوشت میں سچائی اور شاعری کے امتزاج کی وجہ سے گوئٹے نے اپنی خود نوشت کا نام "شاعری اور حقیقت" رکھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خود نوشت میں ادب کی چاشنی اور زبان کا ذائقہ بیحد ضروری ہے۔ یہاں خیالات کو رمزی شکل میں پیش کرنا ہوتا ہے کیونکہ اس کے بغیر مقصد میں کامیابی ناممکن ہے۔

صحیح بات یہ ہے کہ ہم خود نوشت نگار سے یہ توقع نہیں کر سکتے کہ وہ ہمیں وہ سارے واقعات بتائے جو کچھ اسکی زندگی میں پیش آئے۔ ہم یہ مطالبہ ضرور کر سکتے ہیں کہ جو کچھ پیش کرے وہ سچی تصویر ہو۔ بقول احمد امین :۔

---

[1] یحیی ابراہیم عبد الدائم ـــــ السیرۃ الذاتیۃ ص ۶

"مجھے ہر بات یاد نہیں رہ گئی ہے لیکن میں نے حق بات کے علاوہ کوئی دوسری بات یاد بھی نہیں رکھی ہے جب ہم اپنے جسم کو عریاں کرنا پسند نہیں کرتے تو پھر اپنے نفس کو کیسے عریاں کر سکتے ہیں"[1]؟

خودنوشت میں سچائی کا عنصر پیدا کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ خودنوشت نگار زیادہ سے زیادہ صاف گو اور بہادر ہو تاکہ وہ اپنے دل کی تمام باتیں بیان کر سکے اور کسی کا ڈر یا خوف اسے سچ گوئی سے منحرف نہ کرے۔ سچ گوئی کی ضرورت خاص طور سے عاطفی اور جنسی واقعات کے بیان کرنے میں ہوتی ہے اسی طرح عزیز و اقارب سے متعلق باتیں بھی بڑی مشکل سے سامنے آپاتی ہیں خودنوشت نگار ان کا پاس و لحاظ کرتا ہے اور صاف گوئی میں حرج محسوس کرتا ہے[2]۔ پھر خودنوشت کا فنی سانچہ بھی صاف گوئی کی راہ میں حائل ہو جایا کرتا ہے۔ مصنف خواہ کتنا ہی بہادر اور صاف گو ہو لیکن اسے اپنی زندگی شروع سے آخیر تک منظم اور مربوط شکل میں پیش کرنی ہے اس لئے ایسے واقعات سے احتراز کرتا ہے جو اس کی خودنوشت کی فنی حیثیت کو مجروح کرتے ہوں یا اس کی شخصیت میں تناقض اور دورنگی پیدا کرتے ہوں۔

شخصیت: خودنوشت میں شخصیت کو مرکزی اہمیت حاصل ہے۔ خودنوشت نگار حیات اور کائنات کی ہر چیز کو اپنی ذات کے آئینہ میں دیکھتا ہے اور جو چیز اسے جیسی نظر آتی ہے اسے دوسروں کو دکھاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اسمیں اس کا میلان اور مزاج صاف طور سے جھلکتا ہے۔ آپ بیتی بنیادی طور پر داخلی خصوصیات اور واردات کو اپنے جلو میں لے کر نکلتی ہے۔ اس کی کامیابی اور ناکامی کا انحصار خود مصنف کے قلم پر ہوتا ہے۔ ایک اچھی خودنوشت ہمارے سامنے شخصیت کا بڑا دلچسپ روپ پیش کرتی ہے جسمیں زندگی بے حجاب اور فطری انداز میں آکھڑی ہوتی ہے یہی سادہ اور معصوم انداز فی الواقع حسن ہے اور یہ حسن زندگی کی ایک بڑی حقیقت ہے[2]۔

---

[1] أحمد أمين ـــ مقدمہ حیاتی، مقدمہ ص ح مکتبۃ الآداب القاھرۃ ۱۹۵۲م

[2] مؤید بلبد الشار ـــ المجمع العلمی الھندی ص ۲۳ اکتوبر ۱۹۹۰م

بلیزنگ نے بہت صحیح بات کہی کہ خود نوشت سے انسان دوبارہ زندہ ہوتا ہے[1]۔
اس کا بچپن، اس کا لڑکپن، جوانی اور بڑھاپا، زندگی کے خاص خاص واقعات اور اس کے معاشقے، الغرض سبھی کچھ از سر نو تخلیق ہوتے ہیں۔ خود نوشت صحیح معنوں میں اپنی ذات کا پرتو ہے۔ اسی لئے وہ خود نوشت ادبی دیانت کا نتیجہ نہیں کہی جا سکتی جو ہم عصروں پر فوقیت جتانے کے لئے لکھی گئی ہو۔ عمدہ سوانح میں احوالِ زیست اس تدریج سے بیان کر دیئے جاتے ہیں جیسے کہ وہ پیش آئے ہوتے ہیں۔ زندگی چونکہ بڑی طویل واقع ہوئی ہے اور واقعات کے وقوع اور ان کی تحریر کے مابین فصل زمانی حائل ہوتا ہے، اسی لئے زندگی کا پورا احاطہ مشکل ہے۔ اس لئے مصنف کو ان کے بارے میں ایک ایسا طرز اپنانا چاہئے جو قارئین کیلئے بار نہ ہو اور کوئی ضروری بات لکھنے سے بھی نہ رہ جائے۔ بعض خود نوشتوں کے مطالعہ سے قاری اکتاہٹ اور بے کیفی محسوس کرتا ہے، اس کی ذمہ داری خود نوشت نگار کے سر ہے، کیونکہ جب وہ اپنی ذات کے حوالے سے گفتگو کرتا ہے تو اس کی خواہش ہوتی ہے کہ اپنی پوری زندگی کے ایک ایک لمحے کا حساب کر ڈالے اور کوئی بات خواہ وہ دوسروں کیلئے بالکل غیر اہم ہو اس کے احاطۂ تحریر سے باہر نہ رہ سکے۔ حالانکہ یہ عملاً اس کے لئے ممکن بھی نہیں ہے[2] لیکن اس چکر میں بہت کچھ ضائع کر چکا ہوتا ہے اور اس کے نتیجہ میں اس کی خود نوشت جگ بیتی بن کر رہ جاتی ہے، اس میں آپ بیتی کا ذاتی حسن ختم ہو جاتا ہے۔

خود نوشت میں شخصیت نگاری کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ خود نوشت عموماً بڑھاپے کی عمر میں لکھی جاتی ہے۔ یہ زمانہ پختگی کا ہوتا ہے اور اس میں کسی تبدیلی کا امکان کم ہوتا ہے۔ اس طرح اس کی روشنی میں مصنف کی شخصیت کی پختہ اور مکمل شکل ملاحظہ کی جا سکتی

---

[1] بحوالہ ڈاکٹر وہاج الدین ـــــ اردو خود نوشت ص ۳۷

[2] مؤید محمد الشار ـــــ المجمع العلمی الھندی ص ۲۱-۲۰ اکتوبر ۱۹۹۰ء

ہے اور اس کی زندگی میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ بعض بوڑھے بھی شوخ طبیعت کے مالک ہوتے ہیں، وہ بڑھاپے میں بھی اپنی تلون مزاجی کو باقی رکھتے ہیں۔

آپ بیتی کے اندر جگ بیتی کتنی ہو؟ اس کے لئے کوئی قاعدہ کلیہ نہیں بنایا جا سکتا۔ اس کا فیصلہ خود مصنف کو کرنا ہے۔ خود نوشت کا مفہوم واضح ہے، بس اس کی رعایت کرنی چاہئے۔ مصنف کو اپنی شخصیت کے اس گوشے کی خاص طور سے وضاحت کرنی چاہئے جو لوگوں کے درمیان نمایاں اور عام ہو، کیونکہ لوگوں کو اسے جاننے کی فکر زیادہ ہوتی ہے[1]۔

خود نوشت نگار اپنی شخصیت سے متعلق خواہ کتنی ہی وضاحت اور صاف گوئی سے کام لے اس کا مکمل ادراک اور تصویر کشی ایک مشکل امر ہے۔ صرف دوسروں کے لئے ہی نہیں بلکہ خود اس شخص کے لئے بھی۔ انسانی شعور کسی میکانکی عمل سے مختلف سانچوں میں نہیں ڈھالے جا سکتے وہ میراث، ماحول، تربیت، صحبت اور تعلیم وغیرہ کا مجموعہ ہوتے ہیں۔ نفسیاتی رد و قبول اور تحت الشعور کی پیچیدگیاں اسے قریب قریب ایک عقدہ لاینحل بنا دیتی ہیں، جسے ہم ایک شخصیت کہتے ہیں وہ فی الواقع کئی متضاد اور متناقض شخصیتوں کا مجموعہ ہوتی ہے۔ اس حقیقت کی طرف انور الجندی نے اس طرح اشارہ کیا۔

"محققین کا اس امر پر اتفاق ہے کہ کوئی شخص اپنی زندگی کی مکمل تصویر کشی نہیں کر سکتا ہے وہ فطری طور سے اپنی زندگی، خواہشات اور خطاؤں کے عام کرنے سے گریز کرتا ہے۔ اگر وہ کچھ باتوں کا اعلان کرتا بھی ہے تو اس کا مقصد صرف اپنا دفاع ہوتا ہے ....

نفس کی مختلف صورتوں کا یاد رکھنا اور ان کے عوامل کو ذہن نشین رکھنا بھی ممکن نہیں ہے۔ انسان کے احوال اگر تبدیل ہو جائیں تو اس کے اثرات بھی اسکی

---

[1] الدکتور عز الدین ـــــ الأدب وفنونه ص ۲۱۱-۲۱۰ دار الفکر العربی القاهرة ۱۹۸۳م

یادداشت پر مرتب ہوتے ہیں خاص طور سے غم اور محرومی کی کیفیتیں زمانے کے گزرنے کیساتھ ساتھ تبدیل ہوتی رہتی ہیں اور ایک ایسا انداز اختیار کر لیتی ہیں جسمیں پہلے والی حدت باقی نہیں رہتی ہے"[1] ۔

سوانح نگاری اور خودنوشت سوانح نگاری

چونکہ تاریخی اعتبار سے سوانح نگاری کا فن پہلے وجود میں آیا اور خودنوشت نگاری کا فن بعد میں، اس لیے خودنوشت نگاری پر سوانح نگاری کے اثرات گہرے ہیں اور اس کے اصول وضوابط سوانح نگاری سے ماخوذ ہیں لیکن اس کے باوجود خودنوشت اپنا آزاد، منفرد اور ممتاز مقام رکھتی ہے۔ خودنوشت نگار کا قلم اپنے احساسات، جذبات اور مشاہدات لوگوں تک پہنچانے میں بے باک اور آزاد ہوتا ہے وہ اپنے متعلق نہ صرف خود لکھتا ہے بلکہ اپنے زاویہ نگاہ سے لکھتا ہے وہ اس بات پر نظر رکھتا ہے کہ دنیا کے سامنے اس کی کیا تصویر بننے جا رہی ہے؟ جب کہ سوانح نگار یہ دیکھتا ہے کہ کسی شخص کو لوگ کیا سمجھتے ہیں؟ وہ اس بات کو اپنے نقطۂ نظر سے پیش کرتا ہے۔ خودنوشت میں مرکزی کردار منتخب اور متعین فرد ہوتا ہے۔ اس میں مصنف اپنا ہیرو آپ ہوتا ہے اور اس میں ہیرو مصنف کی مرغوب اور محبوب ہستی ہوتی ہے۔ خودنوشت میں روشنی کا دائرہ مصنف کی ذات کو گھیرے میں رکھتا ہے جبکہ سوانح میں مصنف اپنی ذات کو نظر انداز کر کے دوسروں کی ذات کو روشنی کے گھیرے میں رکھتا ہے، خودنوشت میں آپ اپنا محاسبہ ہوتا ہے جبکہ یہاں دوسروں کا محاسبہ ہوتا ہے۔ سوانح عمری میں دوسرے ذرائع پر اعتماد کر کے معلومات فراہم کی جاتی ہیں، خودنوشت میں اسکی ضرورت نہیں ہوتی[2]۔ سوانح عمری میں معاصرین کے تذکرے معاون

---

[1] اضواء علی الادب العربی المعاصر ـــــ ص ۶۸

[2] الدکتور اسماعیل عزالدین ـــــ الادب وفنونہ ص ۲۰۲-۲۱۱

ہوتے ہیں اسمیں نہیں۔ کیونکہ اس کا مصنف خود الگ اپنی دنیا آباد کرتا ہے جہاں کسی کا قدم نہیں پہونچا ہوتا ہے۔ سوانح عمری حرف آخر نہیں ہوتی کیونکہ ہیرو کے بارے میں تازہ معلومات کا ذخیرہ کبھی ختم نہیں ہوتا ہے۔ اسی لئے عظیم شخصیتوں کے حالات پر نظر ثانی کی جاتی رہتی ہے، جبکہ خود نوشت ایک طرح سے پتھر کی لکیر ہوتی ہے اسمیں مصنف کی حد تک کوئی تبدیلی کا امکان نہیں ہوتا۔ سوانح عمری میں درج معلومات دوسرے ذرائع سے بھی معلوم کی جا سکتی ہیں جبکہ خود نوشت کی معلومات کا اس سے بہتر کوئی دوسرا ذریعہ نہیں۔ سوانح عمری میں زندگی کی تمام تفصیلات یعنی مہد سے لحد تک کا تذکرہ ہوتا ہے جبکہ خود نوشت میں صرف اسکی تالیف کے زمانے تک کی باتیں درج ہوتی ہیں۔ سوانح حیات صاحب سوانح کی ایک ایسی تصویر ہوتی ہے جسے وہ خود نہیں دیکھ سکتا جب کہ خود نوشت نگار خود ہی تماشا ہوتا ہے اور خود ہی تماشائی۔ اسکی تالیف میں اسکی شخصیت کا پورا جمال و جلال ہوتا ہے۔ ہر چند کہ اسمیں خارجی احوال کا تذکرہ ہوتا ہے لیکن یہ ساری چیزیں مصنف اپنی ذات کے آئینے میں دیکھتا اور دکھاتا ہے گویا ان کی حیثیت مصنف کی اصل تصویر کے سامنے ذیلی اور ضمنی ہوتی ہے۔ خود نوشت کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ زیادہ تر واحد متکلم کے صیغے میں لکھی جاتی ہے جبکہ سوانح حیات کا مصنف واحد غائب کا صیغہ استعمال کرتا ہے۔ اس سے صاحب سوانح کی شرکت اور موجودگی کا پتہ چلتا ہے[1]۔

انسان کی ذاتی تعبیر پیش کرنے کے اعتبار سے بھی سوانح عمری اور خود نوشت سوانح عمری میں فرق ہے، خود نوشت کا سوانح حیات کے بالمقابل انسان سے زیادہ گہرا اور قریبی تعلق ہوتا ہے کیونکہ سوانح عمری کے بالمقابل اسمیں اندرونی ذرائع پر زیادہ اعتماد کیا جاتا ہے انسان زندگی کے مختلف پہلوؤں کو پیش کرتے ہوئے سوانح نگار کی حیثیت صرف گواہ کی ہوتی

---

[1] احسان عباس — فن السیرۃ ص ۱۱۲-۱۱۰،

صبیحہ انور — اردو میں خود نوشت سوانح حیات ص ۴۲

ہے جبکہ خود نوشت سوانح نگار قاضی اور شاہد دونوں ہوتا ہے۔ پس عمومی سوانح نگار کے لئے یہ مناسب نہیں کہ وہ اپنے ہیرو کے بارے میں کوئی متعین رائے پہلے سے قائم کرے، اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ پیچھے ہٹ کر وہ تصویر دیکھے جو معاصرین میں معروف ہے اس طرح کی پابندی خود نوشت نگار پر نہیں لگائی جا سکتی۔ پس وہ جو کچھ کہے گا اپنی طرف سے کہے گا۔

مذکورہ بالا اختلافی صورتوں کے باوجود ایک حقیقت ہے کہ دونوں اصناف کے بہت سے عناصر اور مظاہر میں اتحاد پایا جاتا ہے اور اگر سوانح نگاری کے فن کو مزید ترقی دی جائے تو یہ اتحاد اور زیادہ بڑھ جائیگا۔

خودنوشت سوانح نگاری۔ بحیثیت فن

خودنوشت سوانح حیات محض ایک یادداشت نہیں بلکہ فن کا حصہ بھی ہے ایک اچھی خودنوشت محض تاریخی نہیں بلکہ ادبی کارنامہ بھی ہوتی ہے، کہانیوں اور افسانوں میں خیالات کو حقیقت کا جامہ پہنایا جاتا ہے اور یہاں حقیقت خوبصورت الفاظ میں ملبوس ہو کر سامنے آتی ہے۔ فن اظہار ذات کا دوسرا نام ہے، چونکہ اس صنف کا ہمارے داخلی جذبات سے تعلق ہے اس لئے اسے فن کی اعلیٰ اقدار میں شامل کیا جائیگا۔ ادب میں خودنوشت کو ایک فن کی حیثیت سے ہمیشہ تسلیم کیا گیا ہے، یہ الگ بات ہے کہ اسمیں فن کی مقدار کم یا زیادہ ہونے کے اعتبار سے کمتر اور بہتر کی درجہ بندی کرلی جائے۔ ظاہر ہے کہ ہر آدمی فن کا کامل نمونہ پیش نہیں کرسکتا۔ اس کے لئے ایک نمایاں ادبی شخصیت کا ہونا ضروری ہے۔ یوں تو نثر میں شاعری کی طرح حدود و قیود نہیں ہیں تاہم یہ بھی اپنے لکھنے والے سے دقت اور مہارت کا مطالبہ کرتی ہے۔ زبان پر قدرت رکھنے والا شخص ہی اپنے حالات زیست بیان کرکے اپنی ذات اور اسمیں موجزن خیالات سے دنیا کو روشناس کرا سکتا ہے[1]۔ سوال یہ ہے کہ خودنوشت کو زیادہ سے زیادہ فن کا نمونہ کیسے بنایا جائے اس کا جواب ایک انگریزی رسائیکو پیڈیا میں اس طرح دیا گیا ہے۔

آپ بیتی لکھنے والا اگر اپنی کہانی کو فن پارہ سمجھنے کا خواہش مند ہے تو حالیاتی اسباب کی بنا پر کئی حقائق کو حذف کرنے پر خود کو مجبور پاتا ہے۔ خودنوشت کے مصنف کیلئے لازم ہے کہ اپنی روزمرہ کی روکھی پھیکی باتوں کو ضرورۃً دہرائے اور اپنی توجہ رغبت رکھنے والے قصوں، کاموں اور خصوصیات پر مرکوز رکھے اور اگر وہ ایسا نہ کرے تو کئی کئی جلدوں والے

---

[1] التراجم والسیر، لجنۃ من ادباء العرب ص ۲۲-۲۳

وسیع سلسلے پڑھنے کے لائق نہیں رہ سکیں گے"۔[1]

خود نوشت کی فنی ضرورت کے پیش نظر جس طرح کچھ چیزوں کا حذف کرنا ضروری ہے اسی طرح کچھ چیزوں کو شامل کرنا بھی ضروری ہے۔ یہ چیزیں فرضی اور ناقابل یقین ہوں گی بلکہ تخیل رنگ آمیزی کی قبیل ہوں گی۔ کسی صنف کو فنی مرتبے سے ہمکنار کرنے کے لئے یہ تخیلاتی رنگ آمیزی انتہائی ناگزیر ہے۔ چونکہ خود نوشت کی حیثیت ایک ایسی تخلیق کی ہوتی ہے جو اپنے خالق کی شخصیت مزاج، عادات، افکار اور نچوڑ ہوتی ہے اس لئے اسمیں جہاں ایک طرف حقیقی واقعات و حوادث کا ذکر ہوتا ہے وہیں دوسری طرف ان کے تعلق سے انشاء پرداز کی اندرونی کیفیات، جذبات و عواطف کا ظہور بھی ہوتا ہے۔ اسی طرح خود نوشت نگار دو انتہائی مشکل کاموں سے بیک وقت دوچار ہوتا ہے۔ وہ حقائق کا تحلیل و تجزیہ کرتا ہے لیکن اسی کے ساتھ اپنی فنی اور تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر خیالات اور تصورات کی دنیا میں بھی سیر کرتا ہے، گویا خود نوشت میں تخلیقی رنگ اور افسانوی اسلوب سے کام لینا اسکی فنی تعمیر کیلئے ضروری ہے۔ غالباً اسی لئے بلینزنگ نے بہت آگے بڑھ کر یہ بات کہہ دی:۔

"خود نوشت حقیقت میں گزری ہوئی زندگی کو کہانی کے طور پر پیش کرنا ہے"[2]

اس مسئلے کی وضاحت کیلئے ایک عرب محقق کا ایک معتدل پیراگراف پیش کیا جا رہا ہے

"فنی خود نوشت وہ ہوتی ہے جسے ایک مربوط شکل میں پیش کیا گیا ہو۔ اسکی ایک حیثیت ہو اور ایک ادبی اسلوب ہو۔ ایسا ادبی اسلوب جو اس کی بھرپور اور مقصد زندگی کی تاریخ کو مختصر انداز میں پیش کر سکے۔ اس کے لئے ضروری ہوگا کہ پیشکش خوبصورت انداز میں ہوئی ہو، تقسیم بہترین ہو، عبارت میں چاشنی ہو، واقعات و شخصیات کی تصویر کشی میں زندگی اور حرارت

---

[1] Cassell's Encyclopaedia of Literature By S.H. Steinberg. London, (1953)

[2] بحوالہ ڈاکٹر وہاج الدین ـــ اردو خود نوشت ص ۳۹-۲۰

نظر آرہی ہو۔ مکالمات کی پیشکش میں ربط کیلئے خیالات سے مدد لی گئی ہو۔ ان شرائط کی تکمیل کے بعد ہی خود نوشت مکمل ہوگی تاہم اسے خیالات کی دنیا میں اپنے سے روکنا ہوگا ورنہ وہ خود نوشت کے دائرہ سے خارج ہو جائیگی خاص طور سے جب ناول یا افسانہ کے طرز پر خود نوشت لکھی جارہی ہو۔[1]

خود نوشت سوانح کے بعض مسائل

خود نوشت سوانح حیات کے تعلق سے بہت سے اہم مسائل کا تذکرہ پچھلے مباحث میں آچکا ہے البتہ بعض ذیلی اور ضمنی مسائل پر گفتگو ابھی باقی ہے۔ سطور ذیل میں ان ہی میں سے کچھ کا اجمالی تعارف مقصود ہے۔

ایک مسئلہ یہ ہے کہ انشاء پرداز اپنی خود نوشت کب لکھے؟ اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ چونکہ آپ بیتی فرد کے ذاتی تجربات کا نام ہے اس لئے جب ایک فرد کے تجربات ہر لحاظ سے مکمل ہو جائیں اور اس کے اندر ایک طرح کا فنی اضطراب پیدا کر دیں، اس وقت اسے اپنی آپ بیتی قلم بند کرنی چاہیئے۔ گویا انشاء پرداز کیلئے خود نوشت لکھنے کا کوئی متعین وقت اور عمر نہیں ہے۔ طٰہٰ حسین[2] نے اپنی خود نوشت اپنی جوانی ہی میں لکھ دی جبکہ سلامہ موسیٰ[3] نے ساٹھ سال کی عمر میں اور احمد امین نے اس سے بھی زیادہ عمر میں[4]۔ لیکن ابتداء عمر میں خود نوشت لکھنے کا ایک نقصان ضرور ہے وہ یہ کہ اس اقدام سے بہت سی اہم چیزیں تحریر میں آنے سے رہ جاتی ہیں۔ قبل اس کے کہ مصنف کی زندگی کی واضح سمت متعین ہو اور اسکی زندگی میں کچھ اصول و ضوابط کا تعین ہو وہ اپنی زندگی کی تصویر کشی کا عزم کر لیتا ہے یہاں ایک دوسرا

---

[1] الدکتور یحیی ابراہیم عبداللہ — الترجمۃ الذاتیۃ ص ۱۰-۱۱ [2] طٰہٰ حسین، الأیام ص مصر ۱۹۶۵ء
[3] سلامہ موسیٰ — تربیۃ سلامہ موسیٰ مؤسسۃ الخانجی قاہرہ ۱۹۵۹ء [4] احمد امین — حیاتی، قاہرہ ۱۹۵۲ء

خطرہ بھی ہے وہ یہ کہ خود نوشت نگار بیک وقت اپنے وہ تمام تجربات اور احساسات بیان کر جاتا ہے جن سے ممکن تھا کہ وہ اپنی دوسری تحریروں میں فائدہ اٹھاتا اور ان سے بعض مفید ادبی تخلیقات سامنے آتی۔ ان دونوں امور کو سامنے رکھ کر یہ بات آسانی سمجھ میں آجاتی ہے کہ خود نوشت نگار کیلئے تجربات میں پختہ ہونے کے ساتھ ساتھ عمر میں بھی پختہ ہونا چاہئے۔ بقیہ عمر کے ڈھلنے سے یادوں کے محو ہو جانے کا جو اندیشہ درپیش رہتا ہے اس کا ازالہ یادداشتوں کی تدوین اور بزرگوں سے استفادہ کے ذریعہ کیا جا سکتا ہے۔ البتہ اگر کسی شخص کیلئے فصل زمانی کے باعث اپنے جذبات و احساسات کی ترجمانی ناممکن نظر آرہی ہو تو اسے فوراً یہ کام شروع کر دینا چاہئے کیونکہ خود نوشت حقائق کے تدوین ہی کا نہیں بلکہ ان کے ساتھ جذبات کی آمیزش کا بھی تقاضہ کرتی ہے[1]۔

ایک دوسرا مسئلہ خود نوشت کی زبان سے متعلق ہے یعنی یہ کہ وہ نثر میں ہو یا نظم میں، اس سلسلے میں اصولی بات تو یہی ہے کہ خود نوشت کو کسی مخصوص ہیئت کا پابند نہیں کرنا چاہئے۔ اظہار ذات جہاں اور جس شکل میں ہو اس پر خود نوشت کا اطلاق ہو سکتا ہے، لیکن یہ بات ضرور ہے کہ دنیا کی تمام زبانوں میں خود نوشتوں کا بیشتر سرمایہ نثری خود نوشتوں پر مشتمل ہے۔ عربی زبان کی تمام اعلیٰ درجے کی خود نوشتیں نثری اسلوب میں ہیں۔ پھر منظوم خود نوشتوں میں شعری محاسن تو ہو سکتے ہیں لیکن وہ بہاؤ، تسلسل اور جامعیت نہیں ہو سکتی جو نثری خود نوشتوں کا امتیاز ہے۔ اس لئے ایک اچھی خود نوشت کو نثر کا جامہ ہی زیب دیتا ہے۔ نثر کی وضاحت اور وسعت خود نوشت کے مواد کے لئے زیادہ موزوں اور مناسب ہے اس لئے آپ بیتی کا نام آتے ہی ذہن نثر کی طرف منتقل ہو جاتا ہے لیکن جیسا کہ بتایا گیا ہے

---

[1] احسان عباس ـــ فن السیرۃ ص ۱۰۹-۱۰۸

نثر کوئی بنیادی شرط نہیں ہے۔ سہولت کے پیش نظر سب یہی رائج اور معروف ہو گئی ہے۔

ایک مسئلہ خود نوشت میں ذاتی اور خارجی عناصر کی تعداد کا ہے یعنی اس میں کس قدر ذاتی عناصر ہوں اور کتنا خارجی عناصر۔ یہ بات تو طے ہے کہ خود نوشت ایک ایسا فن ہے جس کا موضوع فنکار کی ذات ہوتی ہے اس کا مرکز داخلی بلکہ شدید داخلی ہوتا ہے اس میں فنکار کی خارجی زندگی کی جھلکیاں تو موجود ہوتی ہیں لیکن محور داخلی ہوتا ہے۔ بہرحال ذاتی عناصر کی اصل موجودگی کے باوجود خارجی عناصر سے گریز ناممکن ہے ورنہ اگر صرف ذاتی احساسات و تصورات پر توجہ مرکوز کی گئی تو خود نوشت ڈائری بننے کے بجائے افسانہ اور ناول کے قبیل کی چیز بن جائے گی۔ خود نوشت کو اگر طرز اور اسلوب کے اعتبار سے کہانی سے تعبیر کیا گیا ہے تو حقائق کے اعتبار سے اسے صداقت کا مجسم نمونہ قرار دیا گیا ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ ایک خود نوشت کی بقا کا انحصار ہی اس بات پر ہوتا ہے کہ وہ خارجی اور داخلی کشمکش کی صحیح تعبیر پیش کر لے جائے[1] اور اسمیں دونوں میں سے کسی سے یکسر غفلت نہ برتی گئی ہو۔ اس مسئلے کے بارے میں پروفیسر احسان عباس اس طرح سے رقم طراز ہیں۔

"ایک کامیاب انشا پرداز اپنے درمیان اور قارئین کے درمیان جذباتی ہم آہنگی پیدا کرنا چاہتا ہے اگر اس کی خود نوشت فنی بنیاد پر قائم ہو، اسمیں اسلوب کی قدر و قیمت سے غفلت نہ برتی گئی ہو اور وہ اپنی زندگی کی داخلی کیفیات اور خارجی انعکاسات کی تصویر گری میں ربط پیدا کرنے پر قادر ہو تو اس وقت اسکی خود نوشت مکمل ہوتی ہے اور اس کی مقبولیت کے عام ہونے میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوتی۔ راجب انشا پرداز اپنی یادداشتوں

---

[1] عادل غضبان ـــــ فن التراجم، مجلۃ الکتاب ج ۷ ص ۵۰۲ ۱۹۴۹ء

یا روزنامچوں کو جمع کرنے پر اکتفا کرے یا اپنی کتاب میں اپنی ذات سے زیادہ حوادث و واقعات کو بیان کرے تو اس وقت اس کی کتاب خود نوشت کے مفہوم سے قریب تر ہوگی لیکن وہ خود نوشت نہیں ہوگی[1]

ان مسائل کے علاوہ خود نوشت کے صفحات، طریقہ کار اور درمیان تحریر ضمائر کے استعمال سے متعلق بھی بعض سوالات ذہنوں میں اٹھتے ہیں۔ ان سب کے بارے میں پہلی بات تو یہ واضح کرنی ہے کہ ان کے سلسلے میں کوئی قطعی فیصلہ صادر نہیں کیا جا سکتا ہے۔ آپ بیتی کے لئے صفحات کی تعداد یا مخصوص طریقہ کار کی کوئی قید نہیں ہے۔ یہ خواہ مختصر ہو یا طویل، آپ بیتی ہی کہی جائیگی۔ ہاں البتہ معنوی اعتبار سے خود نوشت سوانح حیات بالعموم ایک مفصل کتاب ہوتی ہے اور طریقہ کار کا تعین پہلے سے نہ سہی لیکن دوران تالیف اس کے واضح خدوخال نمایاں ہو جاتے ہیں چنانچہ ہر خود نوشت نگار کا اپنا مخصوص طرز اور منفرد انداز ہوتا ہے۔ جہاں تک ضمائر کے استعمال کی بات ہے تو بالعموم یہ تصور کیا جاتا ہے کہ اس کے لئے واحد متکلم کا استعمال زیادہ مناسب ہے، لیکن صحیح بات یہ ہے کہ عربی زبان میں واحد متکلم اور واحد غائب دونوں کا استعمال پایا جاتا ہے۔ جیسے طٰہٰ حسین اور فارس شدیاق نے ضمیر غائب کا استعمال کیا ہے اور احمد امین اور سلامہ موسیٰ نے ضمیر متکلم کا استعمال کیا ہے ان دونوں ضمیروں کے استعمال سے بعض فائدے بھی ہوتے ہیں مثلاً واحد غائب کی ضمیر کے استعمال سے جھجک کا خاتمہ ہوتا ہے اور آدمی اپنی تفصیلات پیش کرنے میں ایک طرح کا تعاون پاتا ہے، اسی طرح متکلم کی ضمیر سے صداقت کے عنصر کو تقویت ملتی ہے اور مصنف کی جرأت و شجاعت اور بے باکی میں اضافہ ہوتا ہے۔

---

[1] احسان عباس ـــــ من السیرۃ ص ۱۰۷

بعض مشابہ اقسام

فنکار اپنی بے پناہ شخصیت کے اظہار کیلئے مختلف ذریعے تلاش کرتا رہتا ہے اور اپنے احساسات و تاثرات کو ہر طرح سے لوگوں کے سامنے رکھتا ہے اور اپنے اندر کی فنکارانہ کشمکش کو مطمئن کرنے کے لئے کوشاں رہتا ہے۔ کبھی کبھی وہ نادانستہ ایسی باتیں بیان کر جاتا ہے جنہیں وہ عموماً دانستہ طور سے بیان کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔ خود نوشت اوں تو اپنی کہانی اپنی زبانی ہی سنانے کا نام ہے لیکن ادب میں بہت سی اصناف ایسی ہیں جو مصنف کی ذات اور اسکی خواہشات کو چپکے سے بے نقاب کر دیتی ہیں۔ وہ تحریریں جن سے فنکار کی ذات باہر جھلکتی ہے اور باوجود ہزار پردہ پوشی کے پردہ دری ہو ہی جاتی ہے وہ روزنامچے، خطوط، سفرنامے، شخصی تاثرات اور زندگی کے کسی مخصوص دور کی مختصر روداد ہیں۔ ان میں بعض متداول اور معروف اصناف کا مختصراً تعارف پیش کیا جا رہا ہے۔

روزنامچہ:۔ انگریزی ادب میں روزنامچوں کیلئے لفظ ڈائری اور جرنل کا استعمال ہوا ہے اور عربی زبان میں اس کے لئے "یومیات" کا لفظ استعمال ہوتا ہے[1]۔ یہ بھی ایک قدیم صنف ادب ہے۔ مذکورہ بالا تمام اقسام کے بالمقابل یہ آپ سے بیحد قریب صنف ہے۔ اسے ایک حد تک غیر مدون خود نوشت کا خاکہ کہا جا سکتا ہے۔ دونوں کے محرکات میں بھی مماثلت ہے دونوں میں حالات اپنے ذاتی نقطۂ نظر سے قلمبند کئے جاتے ہیں۔ دونوں تحلیل نفسی میں مدد ملتی ہے۔ دونوں کا ماخذ بھی ایک ہے البتہ دونوں میں بعض اختلافات بھی ہیں۔ روزنامچے روزمرہ کے واقعات کے وقوع پذیر ہونے کے فوراً بعد لکھے جاتے ہیں جبکہ خود نوشت ان کے وقوع کے کافی عرصہ بعد لکھی جاتی ہے۔ جزئیات کے احاطہ میں روزنامچہ خود نوشت سے بہت آگے ہے۔ روزانہ کی حرکات اور واقعات کو ان کی تازگی

---

[1] مؤید عبد الستار ـــــ المجمع العلمی الھندی ص ۲۶-۲۵

ختم ہونے سے پہلے بطور نعمت غیر مترقبہ محفوظ کر لیا جاتا ہے اور بعد کے تجربات کی روشنی میں ان کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ دونوں میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ آپ بیتی بغرض اشاعت لکھی جاتی ہے جس کی وجہ سے خلوص کی کمی اور تکلف کی درآمد ہو جاتی ہے جبکہ روزنامچے کی حیثیت محض ذاتی ہوتی ہے۔ ایک فرق یہ بھی ہے کہ روزنامچے میں بھولنے کا امکان کم رہتا ہے جبکہ خود نوشت میں زیادہ، اس لئے وہ خود نوشت جو روزنامچہ کو بنیاد بنا کر لکھی جاتی ہے کامیاب قرار پاتی ہے۔

روزنامچے کا زندگی سے قریبی تعلق ہوتا ہے اس میں وہ سارے واقعات قلم بند ہوتے ہیں جو پردۂ روز و شب پر نمودار ہوتے ہیں، البتہ اسمیں واقعات کے نشیب و فراز اور تسلسل و بے ربطی کا پاس و لحاظ نہیں رکھا جاتا، اسطرح یہ خود نوشت نگار کیلئے ایک خام مواد اور میٹیریل ضرور فراہم کر دیتا ہے لیکن انتخاب و اختیار، ردو قبول اور ایک مضبوط منصوبہ بندی کی شرط کے ساتھ۔ خود نوشت صرف ان ہی واقعات کو روشنی میں لاتا ہے جن کا تعلق اس کی ذات سے ہو۔ البتہ دوسرے اشخاص و واقعات محض ضمنی ہوتے ہیں یا زیب داستان کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مختصراً کہا جا سکتا ہے کہ روزنامچہ روزانہ کے واقعات کی دستاویز ہوتا ہے جبکہ خود نوشت واقعات کی کھتونی نہیں ہوتی البتہ اس کے محرکات میں اظہار ذات بھی شامل ہے لیکن اظہار ذات کی گہرائی میں بھی بیحد تفاوت ہے[1]۔

مکتوب نگاری:۔ مکتوب نگاری عہد قدیم سے رائج ہے۔ مکتوب ترسیل خیال کا ایک وسیلہ ہے، اس سے پیغام رسانی کا کام لیا جاتا ہے۔ یہ عموماً صیغۂ متکلم میں ہوتے ہیں۔ ان میں روزمرہ کی چھوٹی چھوٹی باتیں لکھی جاتی ہیں جن کا تعلق یا تو مکتوب نگار کی ذات سے ہوتا ہے یا پھر مکتوب الیہ سے۔ ان میں واقعات کا تسلسل نہیں ہوتا۔ کچھ بے ربط قسم کی ذاتی اور بعض سماجی

---

[1] الدکتور عبدالرحمن بدوی ـــــ الموت والعبقریۃ ص ۱۳۵-۱۲۸ مکتبۃ النھضۃ المصریۃ ۱۹۲۵ء

سیاسی اور تہذیبی اشارے ملتے ہیں، لیکن ان ہی چھوٹی چھوٹی باتوں اور بے ربط اشاروں سے شخصیت کی ایسی تہیں کھلتی ہیں جنہیں کوئی انسان شعوری طور پر افشاں نہیں کرنا چاہتا۔ ایک عمدہ خط کی کامیابی ہی یہی ہے کہ وہ "نصف ملاقات" بن جائے لیکن اپنی بے ریائی اور سادگی کی وجہ سے کہیں تو ملاقات سے بھی بازی لے جاتے ہیں۔ بعض خطوط کے ذریعہ وہ باتیں کہی جاتی ہیں جو یوں کہنا بہت مشکل ہوتی ہیں یہی وجوہ ہیں جو خطوط کو سوانحی ادب میں شامل کرنے پر دلالت کرتے ہیں۔ خطوط کے مناصر بڑی حد تک سرگزشت سے مماثلت رکھتے ہیں اگرچہ کچھ خطوط ایسے بھی ہیں جنہیں یکجا کرنے سے مکتوب نگاری کا صیغہ تیار ہو جاتا ہے لیکن صرف صیغہ ہی تیار ہوتا ہے۔ کوئی واضح اور متعین تصویر نہیں بنتی۔ خطوط میں خیال کی ہم آہنگی اور تسلسل کا ہونا ضروری نہیں جب کہ خود نوشت میں یہ چیزیں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ تاہم خطوط کی مدد سے جو تصویر تیار ہوتی ہے وہ بڑی قیمتی اور اوریجنل ہوتی ہے، چونکہ خطوط کا مقصد اشاعت نہیں ہوتا ہے اس لئے ان میں وہ باتیں بھی در آتی ہیں جن کا تعلق مصنف کی بالکل ذاتی زندگی سے ہوتا ہے، جن کو وہ خود نوشت لکھتے وقت نظر انداز بھی کر سکتا ہے۔ اس طرح خطوط کے ذریعہ منظر عام پر آنے والی شبیہ متعلق فرد کی اصلی شبیہ ہوگی جبکہ خود نوشت کے ذریعہ اسکی پسندیدہ شبیہ سامنے آئے گی، یہ خوبیاں خود نوشت کو سوانحی ادب میں ضرور شامل کرتی ہیں لیکن اس کی دوسری کمزوریاں۔ عدم تسلسل، بے ربطی، غیر شعوری اظہار، منتشر اور متنوع انداز پیشکش وغیرہ۔ اسے سوانح سے الگ ایک صنف قرار دیتی ہے[1]۔

سفرنامہ:- سفرنامے کا وجود بھی بہت ہی قدیم زمانے سے پایا جاتا ہے۔ ابتدا میں ان سے کمزوروں کے سفر کی مشکلات کو سمجھنے میں مدد لی جاتی تھی۔ پھر سفرناموں کے عہد بہ عہد ارتقا نے اسے ایک فن مرتبہ دیا۔ اب یہ صرف معلومات کا ذریعہ نہیں بلکہ ایک منظم معلوماتی اور دلائق اعتنا و دستاویز ہے

---

[1] یحییٰ ابراہیم عبدالدائم ـــ الترجمۃ الذاتیۃ ص ۸۱ ، مؤید عبدالستار ـــ المجمع العلمی الھندی ص ۲۶-۲۷

جن میں فنکارانہ چابکدستی اور تخلیقی قوت سے صفحۂ قرطاس پر سفر کے تاثرات و تجربات کو پیش کیا جاتا ہے۔ سفرناموں کے مواد اور مضمون پر غور کرنے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سفرنامے خودنوشت کی شکل میں ہوتے ہوئے تاریخ سے بہت قریب ہیں، اسی لئے ان سے تاریخ کی ترتیب و پیشکش میں کافی مدد ملی ہے[1]۔ اس طرح سفرنامہ نگار کی حیثیت عام طور پر مؤرخ کی سی ہوتی ہے، خودنوشت کا مصنف مؤرخ نہیں ہوتا۔ وہ دوسری چیزوں کا ذکر محض اس لئے کرتا ہے تاکہ اس کی شخصیت ابھر کر سامنے آئے۔ ان کے ذکر کا مقصد منظر کشی اور واقعہ نگاری میں جان پیدا کرنا ہوتا ہے۔ یہ واقعہ نگاری خودنوشت میں مقصود بالذات نہیں ہوتی ہے جبکہ سفرناموں میں یہ بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ سفرنامے زندگی کے ایک چھوٹے سے حصے پر مشتمل ہوتے ہیں جبکہ خودنوشت زندگی کے اہم ادوار پر محیط ہوتی ہے۔

خودنوشت سے سفرنامے کی قربت کا انحصار زیادہ تر مصنف یا سیاح پر ہوتا ہے۔ اس کے انداز تحریر اور انداز مشاہدہ سے وہ دلچسپ یا بدمزہ دلچسپ بن سکتا ہے۔ اصل میں دیکھنے کی چیز یہ ہوتی ہے کہ سیاح نے سفرنامے میں مختلف چیزوں کا ذکر بالکل سپاٹ انداز میں کیا ہے یا اپنا کردار ابھار کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ دور جدید میں سفرنامے لکھنے کا رواج بہت زیادہ بڑھ گیا ہے۔ اسمیں اور خوبیوں کے علاوہ مصنف اپنی پسند و ناپسند کا اظہار کرکے اپنی ذات کی تصویر کشی بھی کرتا ہے، اس طرح آج کے سفرنامے مشاہدات و واقعات کے ساتھ ساتھ مصنف کے ذاتی رجحانات کے آئینہ دار ہوتے ہیں اور یوں خودنوشت سے قربت بڑھتی جارہی ہے۔

مذکورہ بالا تین اقسام کے علاوہ بعض دوسری اقسام ہیں جو خودنوشت سے مماثلت رکھتی ہیں جن میں رپورتاژ نگاری اور سرگزشت نگاری کافی اہم ہیں۔ سرگزشت نگاری کے تو بعض

---

[1] احسان عباس ـــــ فن السیرۃ ص ۱۲۶

اجزاء خود نوشت نگاری سے بہت زیادہ ملتے ہیں۔ دونوں میں ایک شخص کے واقعات خود اس کے قلم سے لکھے جاتے ہیں۔ بس جو فرق ہے وہ یہ کہ سرگزشت نگاری میں خارجیت پر زیادہ زور دیا جاتا ہے جب کہ خود نوشت میں داخلیت پر زیادہ زور ہوتا ہے۔ سرگزشت میں معاملات و تحریکات اور اشخاص و واقعات کا تذکرہ ہوتا، خود نوشت میں بھی یہ موجود ہوتے ہیں لیکن فرق یہ ہے کہ سرگزشت میں ان کا عنصر چھایا رہتا ہے اور ان کے بالمقابل ذات کی اہمیت کم رہتی ہے جبکہ خود نوشت میں ان کا ذکر ناگزیر حالات میں ہوتا ہے اور یہ اسمیں کمزور زیریں لہر کا کام کرتے ہیں۔ اسمیں اصلاً اہمیت ذات کو حاصل ہوتی ہے۔ غالباً عربی زبان میں مذاکرات کے نام سے جو سلسلہ اس صدی میں فروغ پایا ہے اس کا اردو ترجمہ سرگزشت ہی کیا جائے۔ ان مذکرات کا بھی یہ اختصاص ہے کہ ان میں ذات سے زیادہ حالات و واقعات اور معاملات و تحریکات کا ذکر ہوتا ہے، ان مذکرات میں سے احمد شفیق، کرد علی اور محمد حسین ہیکل کے مذکرات کافی مشہور ہوئے[1]، مذکرات کے علاوہ "ذکریات" کے نام بھی ایک نیا سلسلہ عربی زبان میں شروع ہوا ہے، اسمیں ذات سے زیادہ ماحول، سوسائٹی اور مشاہدات پر توجہ دی جاتی ہے۔

خود نوشت سوانح کی اقسام:۔ ادباء اور ناقدین نے اپنے اپنے زاویہ نظر سے خود نوشت کی مختلف طریقوں سے تقسیم کی ہے جس کے باعث اس کی بہت سی قسمیں کتابوں میں مذکور ہیں لیکن خاص طور سے تقسیم کا دو طریقہ زیادہ معروف رہا ہے ان میں سے ایک طریقہ بلحاظ ہیئت تقسیم کا ہے اور دوسرا بلحاظ موضوع و مواد تقسیم کا ہے۔ ہیئت کے لحاظ سے ایک موٹی تقسیم منثور اور منظوم سے کی جاتی ہے لیکن دوسری تقسیم، مکمل و نامکمل، مختصر و طویل اور مکتوباتی و افسانوی کی جاتی ہے اس کے لحاظ سے بھی مختلف محققین کی تعین کردہ قسموں میں تنوع پایا جاتا ہے۔ یہاں مشہور

---

[1] انیس المقدسی ـــ الفنون الادبیۃ واسلامھا ص ۵۶۱ دار الکتاب العربی بیروت ۱۹۶۳ء

مصری ادیب اور مؤرخ ڈاکٹر شوقی ضیف کی قائم کردہ تقسیم کو بنیاد بنا کر بعض باتیں اختصار سے پیش کی جا رہی ہیں۔ البتہ شوقی ضیف کی قائم کردہ فلسفیانہ تقسیم کو علمی و ادبی کے تحت اور متصوفانہ تقسیم کو مذہبی خود نوشت کے تحت کر لیا گیا ہے۔

مذہبی خود نوشتیں سوانحی ادب کا ایسا سرمایہ ہیں جن میں مذہب، تصوف، اخلاقیات اور تہذیبی اقدار کی تصویریں بیک وقت دیکھی جا سکتی ہیں، مذہبی خود نوشتیں خاص مقصد کے تحت لکھی جاتی ہیں عموماً یہ مقصد تحدیث نعمت اور تبلیغ دین ہوتا ہے مذہبی خود نوشت کا مصنف خود شناسی سے خدا شناسی کی راہ پر گامزن ہوتا ہے۔ وہ اپنی ذات کے وسیلے سے مذہبی امور کی شرح و بسط کرتا ہے اور پند و نصائح کے انداز میں واقعات کو تحریر کرتا ہے اس طرح مذہبی خود نوشتوں پر واعظانہ رنگ غالب آ جاتا ہے ان خود نوشتوں میں شریعت اور طریقت کے بعض اہم اصولوں کے تحت انسانی افکار و اعمال کا محاسبہ کیا جاتا ہے۔ ان خود نوشتوں کا اسلوب نہایت سنجیدہ ہوتا ہے۔ زبان صاف اور سادہ ہوتی ہے۔ دوسرے امور پر تبصرہ خارجی واقعات کی کارفرمائی اور دیگر ضروری عناصر ساری خود نوشتوں کی طرح یہاں بھی موجود ہوتے ہیں البتہ ان میں بعض واقعات و مشاہدات بالکل منفرد انداز کے ہوتے ہیں جن کا تعلق خود نوشت نگار کے روحانی تجربات اور احساسات سے ہوتا ہے۔ انگریزی میں سینٹ آگسٹائن کی خود نوشت سوانح حیات کنفیشن (CONFESSION) مذہبی خود نوشت کی ایک مثال ہے۔ عربی میں امام غزالیؒ کی تصنیف "المنقذ من الضلال" ان کی مذہبی اور روحانی شخصیت کے ارتقاء کی بہترین داستان ہے۔ ان دونوں خود نوشت سوانح عمریوں کو ایک دوسرے سے مماثل قرار دیا گیا ہے۔ لیکن صحیح بات یہ ہے کہ دونوں کے کچھ پہلوؤں میں مماثلت

کے باوجود مغایرت کی شکلیں زیادہ ہیں۔ امام غزالی کے علاوہ دوسرے صوفیاء نے بھی اپنے روحانی تجربات کو تحریری شکل دی ہے، لیکن یہاں ان کی طرح احاطہ نہیں پایا جاتا ہے[1]۔

علمی و ادبی خود نوشتوں سے وہ مراد وہ خود نوشتیں ہیں جو اپنے عہد کی روایات کی امین اور اقدار کی آئینہ دار ہوتی ہیں۔ ان میں سیاسی، مذہبی، سیاسی اور سماجی عناصر بھی موجود ہوتے ہیں لیکن یہ عناصر کمزور ہوتے ہیں اور علمی و ادبی مسائل و افکار اور اشخاص کے اثرات غالب رہتے ہیں ان خود نوشتوں میں نفسیات اور جمالیات کے عناصر کی کارفرمائی بھی نظر آتی ہے۔ سیاسی تحریکات، اشخاص اور افکار کے رنگ میں بھی نظر آتے ہیں لیکن یہ رنگ تصویر کے مجموعی میں صرف ذیلی رنگوں کا کام دیتے ہیں۔ ان میں سچائی، خلوص اور فنی دروبست کے نمونے زیادہ نظر آتے ہیں، ان خود نوشتوں زبان و بیان کی تمام خوبیوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے بہت سادہ اور عام انداز میں بڑے بڑے علمی و فلسفیانہ مسائل سے تعرض کیا جاتا ہے اور بعض اوقات ان کی مدد سے بڑے بڑے علمی و ادبی مسئلے حل ہو جاتے ہیں۔ اور ان سے لسانی، فنی، منطقی، شعری اور ادبی معلومات فراہم ہوتی ہیں۔ عربی زبان میں ابن حیان توحیدی، ابن حزم، ابن جوزی، ابن طولون، ابن ضیاء، ابن الہیثم اور امام رازی کی وہ تالیفات جن میں انھوں نے اپنے نقطۂ نظر سے علمی، ادبی، اور فلسفیانہ امور پر بحث کی ہے مذکورہ بالا خوبیوں کی توثیق کرتی ہیں اور ان پر مہر تصدیق ثبت کرتی ہیں[2]۔

سیاسی و سماجی خود نوشتوں سے مراد وہ خود نوشتیں ہیں جن میں سیاسی افکار اور تحریکوں کا ذکر ہو۔ عموماً سیاسی و سماجی خود نوشتوں کے مصنفین سیاسی رہنما، سماجی کارکن اور مصلحین ہوا کرتے ہیں۔ ان خود نوشتوں میں اس عہد کی سیاست اور سماجی صورت حال پر تبصرے

---

[1] شوقی ضیف ـــ الترجمۃ الشخصیۃ ص ۳۶-۱۲

[2] " " ص ۸-۳۷

اور مصنفین کی ذاتی رائے ہوتی ہیں لیکن اصل مقصود ذات نہیں ہوتی ہے بلکہ ذات کے وسیلے سے سیاسی نظریات اور سیاسی اشخاص کی تصویر کشی کرنا ہوتا ہے۔ اسی لئے ان میں مصنف کے جذبات اور مذہبی معتقدات کا عنصر کم ہوتا ہے۔ سیاسی خود نوشتوں کی اس صورت حال کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان میں ادب اور مذہب وغیرہ کے معاملات پر سرے سے اظہار خیال ہی نہیں کیا جاتا ہے۔ اظہار ضرور کیا جاتا ہے لیکن اس احتیاط کیساتھ کہ اصل مقصد متاثر نہ ہو۔ اکثر سیاسی خود نوشتوں کے اسلوب، زبان اور حیثیت میں یکسانیت ہوتی ہے ان میں کوئی خاص ندرت نہیں ہوتی ہے۔ لیکن ان میں کچھ عناصر ضرور ایسے ہوتے ہیں جو انھیں دوسری خود نوشتوں سے ممیز و ممتاز کرتے ہیں۔ انھیں صفات کو اس خود نوشت کا ذاتی وصف کہا جاتا ہے۔ عربی زبان میں سیاسی طرز کی خود نوشتوں کے لکھنے کا آغاز عصر عباسی ہی میں ہو چکا تھا مثلاً اسی عہد کے ایک سیاسی داعی المؤید فی الدین نے اپنی سیاسی اور فکری آراء کو تفصیل کیساتھ اپنی خود نوشت "سیرۃ المؤید فی الدین داعی الدعاۃ" میں پیش کیا۔ اسی نوعیت کی تالیف غرناطہ کے آخری امیر عبد اللہ بن بلقین کی "مذکرات امیر عبد اللہ" بھی ہے۔ ان کے علاوہ اسامہ بن منقذ کی "الاعتبار"، اور علامہ ابن خلدون کی "التعریف بابن خلدون ورحلتہ غربا ومشرقا" میں بھی ان دونوں کے سیاسی خیالات اور اپنے زمانے کے سیاسی حالات کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ اس طرح انھیں بھی سیاسی خود نوشتوں کی فہرست میں شامل کیا جا سکتا ہے[1]۔

خود نوشت کی مذکورہ بالا تقسیم جیسا کہ شروع میں وضاحت کی جا چکی ہے، ڈاکٹر شوقی ضیف کی تقسیم سے ماخوذ اور مستفاد ہے[2] پھر اسمیں مزید کچھ ترمیم و تبدیل اور حذف

---

[1] احسان عباس ـــ فن السیرۃ ص ۱۲۱-۱۲۳

[2] شوقی ضیف ـــ الترجمۃ الشخصیۃ ص ۱۰۲-۱۲

و اضافہ کیا گیا ہے۔ شوقی ضیف کے علاوہ بعض دوسرے ادباء و محققین نے بھی خود نوشت کی اپنے نقطۂ نظر سے تقسیم کی ہے۔ مثلاً پروفیسر ڈاکٹر احسان عباس نے اپنی شہرہ آفاق کتاب "فن السیرۃ" میں اسکی تقسیم کا ایک دوسرا طریقہ اختیار کیا ہے۔ اس محسوس ہوتا ہے کہ ان کا یہ طریقہ خود نوشت کی غرض و غایت اور مقصد و محرک کی اساس پر مبنی ہے۔ چنانچہ انھوں نے ان خود نوشتوں کو جن میں تجربات، مشاہدات اور اخبار پر مشتمل حکایتیں بیان کی جاتی ہیں "الصنف الاخباری" کا نام دیا۔ اور ان خود نوشتوں کو جن میں مصنفین اپنے خیالات کی تفسیر، توضیح، تعلیل یا کسی بات کی معذرت اور برأت پیش کرتے ہوں ان کا نام "الصنف التفسیری" رکھا۔ اسی طرح ان کے یہاں ایک قسم روحانی کشمکش کی تصویر کشی کرنے والی خود نوشت سوانح عمریوں کی ہے اور ایک چوتھی قسم زندگی کے تجربات اور پیچیدگیوں کو بیان کرنے والی آپ بیتیوں کی ہے[1]۔

---

[1] شوقی ضیف ـــــ الترجمۃ الشخصیۃ ص ۱۰۴-۹۸

باب دوم

فصل اوّل: قدیم عربی ادب میں خود نوشت سوانح نگاری کا ایک جائزہ

انسان اپنی جبلت اور فطرت کی بنیاد پر ہر دور اور زمانے میں علم و معرفت کے بیش از بیش حصول کے لئے سرگرداں رہا ہے، اسکی سعی و جہد کی جہات ہمیشہ مختلف اور متنوع رہی ہیں۔ وہ خارجی اور ذاتی ذرائع کو استعمال کر کے کائنات کے رازہائے سربستہ کی تلاش و جستجو میں منہمک رہا ہے۔ ظاہر ہے یہ انسان جو اس قدر اپنے گرد و پیش سے دلچسپی رکھتا ہو، اپنی ذات سے غفلت کبھی نہیں برت سکتا تھا۔ اس کی ذات خود ایک جہان ہے۔ اور یہاں صرف اسی کی رسائی ہو سکتی ہے۔ وہ جہاں ایک طرف اپنی ذات کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے وہیں دوسری طرف اپنے احساسات و تاثرات سے اپنے دوسرے بھائیوں کو مختلف مقاصد پیش نگاہ بھی کرتا ہے۔ اپنی ذات سے متعلق انسان کا یہ دو طرفہ عمل ہمیشہ سے موجود رہا ہے۔ چنانچہ جب ہم دور جاہلی پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں وہاں بھی فہم ذات اور اظہار ذات کی مختلف ٹوٹی پھوٹی اور غیر منظم کوششیں نظر آتی ہیں جس کے عملی مظاہر آج بھی فخریہ، ہجویہ اور دوسری نوعیت کے قصائد کی شکل میں موجود ہیں اسلام کی آمد کے بعد جب علوم و فنون کو باضابطہ ترقی ملی اور لکھنے پڑھنے کا رواج عام ہوا تو دوسری اصناف سخن کیطرح سیرت نگاری کو بھی پھیلنے پھولنے کا بھرپور موقعہ میسر آگیا۔ قبل اس کے کہ ہم قدیم عربی ادب میں سیرت نگاری کی تاریخ اور اس کے ارتقائی مراحل کا جائزہ لیں، یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قدماء کی اس صنف سے آگہی اور واقفیت کی تفصیلات کا پتہ لگایا جائے اس سے ہمیں اس فن کے تعلق سے قدماء کے موقف کی فہم و فراست میں مدد ملے گی اور ہم زیادہ وضاحت کیساتھ یہ جان سکیں گے کہ ادب کی اس اہم ترین صنف کے بارے میں ہمارا کیا رویہ رہا ہے؟

قدیم عربی ادب میں خود نوشت کیلئے استعمال کی جانے والی اصطلاح کا سراغ

لگانے سے معلوم ہوتا ہے کہ "سیرۃ" اور "ترجمہ" دونوں کا مفہوم "سوانح حیات" ہوتا تھا۔ عربوں کے یہاں فرد کی تاریخ نے مختلف شکلیں اختیار کی جن میں اولین شکل "سیرۃ" کی تھی۔ سیرت کا یہ لفظ "سار یسیر" مسیراً سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں (۱) جانا، روانہ ہونا، چلنا (۲) طریقہ و مذہب (۳) سنت (۴) ہیئت (۵) حالات (۶) کردار (۷) کہانی (۸) خصوصیت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مغازی کا بیان (۹) آخیر میں آپ کے پورے احوال زندگی کا بیان [1]

اس لفظ کے اصطلاحی مفہوم کے سلسلے میں یہ کہا جاتا ہے کہ لفظی معنی "طریقہ" سے نکل کر شروع میں اس پر خاص معنی "طریقۃ المسلمین فی المعاملۃ مع الکافرین" غالب آگئے۔ شروع میں یہ حضورؐ کے جنگوں میں طریقہ کار کیلئے بولا جاتا تھا پھر بعد میں تمام امور میں آپ کے طریقہ کار کیلئے بولا جانے لگا بلکہ اس سے بھی وسیع ہو کر دوسرے لوگوں کے طریقہ کار کیلئے استعمال ہونے لگا [2]

عربوں میں سیرت نگاری کی مختلف شکلیں رہی ہیں۔ بعض کتابیں مخصوص طور سے کسی ہستی کے بارے میں تفصیلات سے آگاہ کرتی ہیں تو دوسری طرف بہت سے لوگوں کے تذکرے ہوتے ہیں۔ ان سب کیلئے ان کے پاس الگ الگ نام ہے۔ سر دست جس لفظ "سیرۃ" سے ہم بحث کر رہے ہیں اس کا اطلاق شروع میں صرف رسول اللہؐ کی زندگی اور ان کے مقدس غزوات پر ہوتا تھا لیکن یہ بعد میں عام ہو کر دوسرے لوگوں کی زندگیوں کے لئے بھی استعمال ہونے لگا۔ مثلاً عوانہ کلبی م ۱۴۷ھ نے حضرت امیر معاویہؓ اور ان کے خاندان کی تاریخ "سیرۃ معاویۃ وبنی امیۃ" کے نام سے تحریر کی [3]۔ اس کا تذکرہ ابن ندیم نے کیا ہے اور اس کا زمانہ ظہور مسیر بن اسحاق م ۱۵۱ھ سے قریب لگتا ہے۔ بعد کے زمانوں میں یہ عمومیت برابر بڑھتی گئی۔ خود سیرت نگاری کا فن جب آگے بڑھا تو اس کی بہت سی شاخیں "طبقات"، "تراجم"، اور "جرح و تعدیل" وغیرہ کے ناموں سے مستقل فن کا درجہ

---

[1] فیروز آبادی ــــ القاموس المحیط ۲ / ۵۶ [2] اردو دائرہ معارف اسلامیہ ج ۱۱ طبع اول دانش گاہ پنجاب لاہور ۱۹۷۵ء [3] روزنتال ــــ علم التاریخ عند المسلمین ص ۱۲۱

اختیار کر لیتی ۔

جہاں تک لفظ "ترجمہ" کا معاملہ ہے تو اس کا استعمال ساتویں صدی کے اوائل تک نہیں ملتا ہے۔ ساتویں صدی ہجری میں سب سے پہلے یاقوت حموی نے اپنی معجم میں اس لفظ کا استعمال کسی شخص کی زندگی کے معنی میں کیا۔ اس خیال کو تقویت اس بات سے بھی ملتی ہے کہ ابوالفرج الاصفہانی نے اپنی کتاب الاغانی میں اس لفظ کا استعمال نہیں کیا۔ حالانکہ انھوں نے بہت سے شعراء اور ادباء کی زندگیوں پر روشنی ڈالی ہے وہ اس کی جگہ پر خبر اور اخبار کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔

زمانے کے گزرنے کے ساتھ ساتھ لفظ ترجمہ کا استعمال اصطلاحی طور سے مختصر سوانح حیات کیلئے ہونے لگا اور لفظ سیرت کا استعمال طویل سوانح حیات کیلئے۔ یہ تفریق بھی ماضی میں تھی۔ اب جدید اصطلاح میں ان دونوں کو ہم معنی تصور کیا جاتا ہے اور پھر یہیں سے "السیرۃ الذاتیۃ" یا "الترجمۃ الذاتیۃ" کا استعمال خود نوشت Autobiography کے معنی میں ہونے لگا[1]

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ سیرت نگاری کا فن عربوں میں اپنی ابتدائی شکل سے لیکر آج تک مختلف شکلیں اختیار کر چکا ہے۔ اسکی تقسیم اور تہذیب نیز اسے بہتر، مفید اور مثمر اور بنانے کیلئے اس کے اصول و ضوابط اور اوصاف و خصائص کا تعین بھی کیا گیا۔ یہاں اس کی گنجائش نہیں کہ ان تمام امور پر روشنی ڈالی جائے اس لئے سیرت نگاری کی ایک مخصوص اور نازک صنف "خود نوشت" سے متعلق بعض باتیں پیش کی جائیں گی۔

سیرت نگاری کیساتھ ساتھ اس سے متعلق جو دوسرے فنون عربوں میں متعارف ہوئے ان میں خود نوشت سوانح نگاری بھی ہے۔ غالباً اس کی طرف توجہ فارسی اور یونانی آداب سے واقفیت کے بعد منعطف ہوئی۔ ایرانیوں کے بارے میں انھیں یہ معلوم ہوا کہ ان کے بادشاہ اور دوسرے

---

[1] یحییٰ ابراہیم ـــــ الترجمۃ الذاتیۃ ص ۳۱

قومی رہنما اپنی ذاتی زندگی اور وصیتیں اپنے لڑکوں کے لئے قلمبند کر دیا کرتے تھے۔ پھر دوسری قوموں کے ساتھ اختلاط کے بعد انھیں انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنی شخصیت کے تحفظ کا احساس پیدا ہوا۔ مزید یہ کہ جزیرۂ عرب سے باہر نکلنے کے بعد زندگی کے مختلف میدانوں میں عربوں نے جو وسیع و عریض اور مہذب و متمدن دنیا دیکھی اور اس پر فتح حاصل کی اس کی وجہ سے انھیں اپنے تجربات و مشاہدات سے دوسرے ہم مسلک لوگوں کو روشناس کرانے کی فکر دامنگیر ہوئی[1]۔ اس کے علاوہ بھی بعض دوسرے اسباب ہیں۔ بہرحال! ان سب اسباب کی وجہ سے ہمارے بزرگوں نے اپنے بارے میں لکھنا شروع کیا۔ انھوں نے باضابطہ خود نوشت کا لفظ تو نہیں استعمال کیا لیکن جو کچھ لکھا وہ اس اصطلاح کے مطابق تھا۔ اس سلسلے میں کہ وہ خود نوشت کی مکمل شکل و صورت کی کتنی تصویر کشی اور نمائندگی کرتا ہے اور اسمیں کیا کیا کمیاں اور خامیاں باقی رہ گئیں ہیں، آنے والے صفحات میں تفصیل سے گفتگو کی جائے گی۔

قدیم عربی خود نوشت سوانح کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ مختلف مقاصد اور محرکات کے تحت لکھی گئی ہیں۔ ہر ایک کے پشت پر ایک مقصد ہوتا ہے جو اپنے مصنف سے لکھنے کا بار بار مطالبہ کرتا ہے، جب یہی اصرار حد تک آگے بڑھ جاتا ہے تو مصنف کے لئے اپنی قومی زندگی کے احوال اور نجی تجربات کا بیان ضروری ہو جاتا ہے بعض مصنفین اپنی خود نوشت کے محرکات کا تذکرہ کر دیتے ہیں اور بعض تذکرہ تو نہیں کرتے لیکن ان کی خود نوشت کے مکمل مطالعہ سے ان کا سراغ لگا لیا جاتا ہے خواہ مصنف تذکرہ کرے یا نہ کرے کچھ داخلی محرکات تو ضرور کارفرما ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی ایک محرک کے بجائے کئی کئی محرک کارفرما ہوتے ہیں اور ان کا بھی پتہ لگانا کوئی زیادہ مشکل نہیں ہوتا ہے۔ قدیم عربی خود نوشت سوانح میں کچھ اوصاف مشترک طور سے پائے جاتے ہیں۔ خوبیوں میں یہ اشتراک عوامل اور محرکات میں اشتراک کے باعث پیدا ہوا۔ اگر عوامل و محرکات کے لحاظ

---

[1] عبدالرحمان ـــــ الموت والعبقریۃ ص ۱۱۹

سے ان خود نوشت سوانح عمریوں کی تقسیم کی جائے تو یہ کچھ اس طرح ہوگی۔

۱۔ مدافعانہ اور معذرت خواہانہ :۔ اس میں مصنف اپنے کسی خاص فکر اور موقف کی وضاحت کرتا ہے اور اگر عوام و خواص میں اس کے کسی نظریہ یا عمل کے بارے میں کوئی غلط فہمی پائی جاتی ہو تو اس کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ قدیم عربی سرمایہ میں "حنین بن اسحٰق، ہمواہ بن یحییٰ المنوبی اور طبیب مصری" کی خود نوشتیں اسی مقصد کے تحت لکھی گئی ہیں۔ مفصل اور طویل تالیفات میں "المؤید فی الدین" کی "سیرۃ المؤید فی الدین وداعی الدعاۃ"[1] امیر عبد اللہ بن یلیقین کی "التبیان عن الحادثۃ الکائنۃ بدولۃ بنی زیری فی غرناطۃ"[2] اور علامہ ابن خلدون کی "التعریف بابن خلدون ورحلتہ شرقاً وغرباً"[3] بھی اسی قسم کی خود نوشتوں میں شمار کی جاتی ہیں۔

۲۔ روحانی کشمکش کی تصویر گری کرنے والی خود نوشت :۔ اس قسم میں وہ خود نوشت سوانح عمریاں شامل ہیں جن کے مؤلفین روحانی اعتبار سے اضطراب و انتشار کے شکار رہے ہیں ان میں سے بعض کو کوئی متعین راہ مل گئی اور بعض آخری وقت تک یوں ہی سرگرداں رہے۔ ایسی تالیفات میں سے امام غزالی کی "المنقذ من الضلال"[4]، امام رازی کی "السیرۃ الفلسفیۃ"، حارث محاسبی کی "کتاب النصائح" کے بعض حصے اور ابن ہیثم کی اپنی خود نوشت بطور مثال پیش کی جاسکتی ہیں[5]۔

۳۔ معاشرے کی رسوم و رواج کے خلاف اپنے تاثرات کا اظہار :۔ اس مقصد کیلئے لکھی گئیں تالیفات میں ابو العلاء المعری کے بعض رسالے اور ابو حیان التوحیدی کی "فی مثالب الوزیرین" "فی الصداقۃ والصدیق" اور "الاشراف والمؤانسۃ" ہیں۔ لیکن اس مقصد کیلئے کسی مستقل بالذات تصنیف کا پتہ نہیں چلتا۔ اس دوسرے مقصد کے تحت لکھی گئیں تالیفات میں یہ مقصد بھی ضم ہو جاتا ہے۔

۴۔ اپنی مثالی زندگیوں کی تصویر کشی :۔ اس میں راست و پرداز اپنی اخلاقی، عملی اور فکری

---

[1] دار الکاتب العربی ۱۹۶۹ء [2] دار المعارف، مصر ۱۹۵۵ء [3] الجنۃ، مصر ۱۹۵۱ء

[4] مکتبۃ الانجلو ۱۹۵۲ء [5] ابن ابی اصیبعہ ۔ عیون الانباء فی طبقات الاطباء، البہیۃ ۱۸۸۲ء

زندگی کی تفصیلات سے آگاہ کرتا ہے تاکہ لوگ ان سے مستفید ہوں۔ اس کی مثال عبدالرحمان بن جوزی کی "لقطة الکبد فی نصیحة الولد"، عبدالوہاب شعرانی کی "لطائف المنن"، اور حلاج، ابن عربی اور سہروردی کی اپنی ذات سے متعلق تحریریں ہیں۔ خالص فکری زندگی کے تمام مراحل کی تفصیلات سے آگاہ کرنے کے لئے لکھی گئیں تالیفات میں بیرونی، رازی، ابن الہیثم، سخاوی، سیوطی اور ابن طولون کی تحریریں ہیں۔ مؤخر الذکر کی تالیف کا نام "الفلک المشحون فی أحوال محمد بن طولون" ہے[1]۔

۵۔ زندگی کے تجربات اور اہم یادگار واقعات کو محفوظ رکھنے کی خواہش۔ اس میں وہ تالیفات شامل ہیں جن کی تحریر کا مقصد اپنی مفید اور مؤثر زندگی کے تجربات و مشاہدات کی تصویر کشی ہو عربی ادب میں اسامہ بن منقذ کی "کتاب الاعتبار"[2]، ابن حزم کی "طوق الحمامة فی الألفة والألاف"[3] اور عمارہ یمنی کی "النکت العصریة" اس قسم کی بہترین مثالیں ہیں۔

مذکورہ بالا مباحث سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ عربی ادب میں اظہار ذات کی اعلیٰ و ارفع شکل خود نوشت کا وجود بہت عرصہ پہلے سے رہا ہے اور یہ کہ اس کی تالیف کے محرکات بھی کم و بیش وہی رہے ہیں جو دوسری زبانوں میں پائے جاتے ہیں۔ اب خود نوشت کے اس سرمایے کی بعض دوسری خصوصیات اور امتیازی امور پر نظر ڈالی جائیگی۔

قدیم عربی خود نوشت کے تعلق سے ایک اہم اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس میں وہ سب کچھ موجود ہے جسے ہم یومیات، مذاکرات، اور المشرامات کے نام سے جانتے ہیں۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس زمانے میں یہ اصطلاحات عام نہیں تھیں بلکہ ان کے مشمولات عربی زبان کی بہت سی تالیفات میں موجود ہیں، چنانچہ اگر ہم اس نقطۂ نظر سے عربی سرمائے کا جائزہ لیں تو ماضی ماضل کی کتاب "فی مبادمات" کا طرز، اسلوب اور مواد آج کے زمانے میں معروف اصطلاح یومیات سے بڑی حد تک ملتا جلتا ہے۔

---

[1] تحقیق محمد کرد علی ـ ط احمد عبید دمشق
[2] تحقیق فیلیپ حتی ط ـ برنسٹون
[3] ط ـ قاہرہ ۱۹۵۵ء

اسی طرح بہت سے سیاحوں نے بھی اپنے سفرنامے روزنامچہ تحریر کرنے کا معمول بنا رکھا تھا۔ ان کا یہ طرز بھی یومیات سے ملتا جلتا ہے۔ مذاکرات کے بارے میں بھی یہی بات کہی جا سکتی ہے۔ ایسی تحریریں تو بکثرت موجود ہیں جنہیں شخصیات، احوال و واقعات اور تجربات و مشاہدات کو اپنے مخصوص انداز میں بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ باقی یہ مذاکرات سیرت کی ان کتابوں کیساتھ مل کر بھی آئے ہیں جنہیں وزراء اور حکام کے احوال بیان کئے گئے ہوتے ہیں۔ انشاء انہیں اپنے مشاہدات اور تجربات کی روشنی میں قلمبند کرتا ہے۔ گویا ان میں مصنف کی ذات اور دوسروں کی سیرت دونوں کا حسین امتزاج ہوتا ہے۔ اس طرح کی کتابوں میں ابن دقاق کی "احمد بن طولون"، بلنسی کی "سلطان جلال الدین"، اور ابن شداد کی "سلطان صلاح الدین" کا نام بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے۔ موجودہ زمانے میں "اعترافات" کا سلسلہ زیادہ عام اور مقبول ہوا ہے۔ ان کا تعلق زیادہ تر روحانی اور فکری مسائل سے ہوتا ہے۔ خاص طور سے اپنے گناہوں، جسمانی لذت اندوزیوں اور دیگر لغزشوں کا بیان کر کے کبھی اظہار ندامت کیا جاتا ہے اور کبھی اظہار فخر۔ اسی طرح کبھی کبھی سرگرداں اور پریشان حال دکھا کر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ عربی زبان میں محاسبی کی "النصائح الدینیۃ" اور امام غزالی کی "المنقذ من الضلال" اس کی بہترین مثال ہیں۔ ابن حیثم اور رازی کی تحریروں میں بھی اس طرح کے اعترافات بکثرت موجود ہیں[1]۔

دور حاضر کی خود نوشتوں میں پرجوش انقلابیت، معاشرے سے علی الاعلان بغاوت اور روایات و اقدار کا کھلے عام استہزاء اور تمسخر کا جو انداز پایا جاتا ہے قدیم عربی ادب کی خود نوشتوں میں یہ چیز زیادہ ابھر کر سامنے نہیں آسکی۔ یہاں بالعموم حوالگی اور خود سپردگی کا رنگ غالب رہا ہے۔ حتیٰ کہ بعض وہ شخصیات جن کی صلابت اور مصائب برداشت کرنے میں بے پناہ مشق و ممارست ضرب المثل تھی وہ بھی مشکلات کے سامنے سپر ڈال دیتی ہیں اور گوشہ نشینی و جلاوطنی کو ترجیح دیتی

---

[1] ابن ابی اصیبعہ ـــ عیون الانباء فی طبقات الاطباء
وشوقی ضیف ـــ الترجمۃ الشخصیۃ ص ۳۶-۱۲

ہیں۔ گویا ان کے پیچھے ان کا یہ نظریہ کام کرتا ہے کہ ان کے بارے میں سوچنا، غور و فکر کرنا اور ان سے نجات حاصل کرنے کیلئے سعی و کوشش کرنا ان کا اپنا کام نہیں ہے بلکہ یہ قضا و قدر کے فیصلے کے تحت انجام پاتے ہیں ان لوگوں میں علامہ ابن خلدون جیسے فرد بھی شامل ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کشمکش کا وہ احساس جو فن کی تخلیق کا باعث ہوتا ہے قدیم عربی خود نوشت سوانح عمریوں میں بہت ہی کمزور ہے بقیہ نفسی کشمکش اور تصادم تو ہر آن اور ہر لمحہ موجود ملتا ہے[1]۔

اس کے بالمقابل اعتراف، صراحت اور نفس کشائی کا عنصر عربی خود نوشتوں میں قدرے مضبوط اور نمایاں ہے خاص طور سے ان لوگوں کی تحریروں میں جو کسی مخصوص فکری اور روحانی زاویۂ نظر کے مالک ہوں مثلاً ابن ہیثم اس حقیقت کا صاف اعتراف کرتے ہیں کہ دینی امور میں اپنے تمام تر انہماک اور توجہ کے باوجود انھیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا چنانچہ انھوں نے عقلی امور میں انہماک اور توجہ کو اپنا مقصود بنا لیا اسی طرح امام غزالی نے اس کا اعتراف کیا انھیں بدیہی امور کے علاوہ ہر معاملے میں شک و شبہ ہو گیا تھا۔ لیکن انھوں نے بعد میں اپنی اس انقلابیت کو تصوف کی آغوش میں آکر ہمیشہ کیلئے دفن کر دیا[2] بقیہ جہاں تک ذاتی زندگی میں بعض مخصوص حالات کے تحت بعض حقائق کے اعتراف کا معاملہ ہے تو عربی خود نوشتوں یا مذکرات یا یومیات میں اس کا وجود بہت کم ملتا ہے۔ ہاں ابن حزم کو اس میدان میں ضرور یہ امتیاز حاصل ہے کہ دینی معاملات میں تشدد کے باوجود انھوں نے اپنی کتاب "طوق الحمامۃ" میں عشق و محبت کے بعض واقعات کا اعتراف کیا ہے اور ان کے تعلق سے اپنے دل کی گہرائیوں سے بعض حقائق پیش کیے ہیں۔ ایک دو واقعات کی تو انھوں نے دقیق تفصیل پیش کی ہے کہ اس میں ان کا کوئی ثانی نظر نہیں آتا۔ ان کی کتاب میں صاف گوئی اور صراحت کے پہلو سے اگر کوئی کمی رہ گئی ہے تو وہ یہ کہ واقعات میں اپنے براہ راست وجود کو تسلیم کرنے کے بجائے اشارات و تلمیحات اور استعارات و کنایات

---

[1] عادل غضبان — فن التراجم، مجلۃ الکتاب ۷/۵۰۸-۵۰۷، اپریل ۱۹۴۹ء

[2] جرجی زیدان — حضارۃ الاسلام، ترجمہ عبدالعزیز توفیق ص ۲۲۸-۲۲۷

سے کام لیا ہے اور دوسری جگہ کمی یہ رہ گئی کہ بعض باتوں کی تفصیلات ان کے ذہن سے محو ہو گئی تھیں۔ تاہم ان کمیوں کے باوجود عشق و محبت کے موضوع پر ان کا طرز نگارش اچھوتا اور نرالا ہے۔ اس کی بنیاد تجربے، مشاہدے، اعتراف اور گہرے نفسیاتی تجزیے پر قائم ہے۔ اگر انہوں نے حد سے زیادہ اشعار اور ضرورت سے زیادہ صنائع بدائع سے کام نہ لیا ہوتا تو ان کی کتاب اور زیادہ دلچسپ بن جاتی[1]۔

جس طرح قدیم عربی خود نوشت سوانح عمریوں میں ہمیں انفرادیت اور طربانیت کی کمی نظر آتی ہے اسی طرح نفسیاتی عمق کی بھی کمی کا احساس ہوتا ہے۔ یہ وصف مذکورہ بالا دونوں اوصاف کیساتھ ساتھ چلتا ہے اور اس کا وجود بڑی حد تک فرد اور معاشرے کے درمیان اور فرد کے اپنے بارے میں اور اپنے معاشرے کے بارے میں خیالات کے درمیان ہم آہنگی اور توافق کی موجودگی پر منحصر ہے۔ یہ اس انفرادی فخر کے بالمقابل بھی بہت گہری چیز ہے جو اپنی اچھائیوں اور دوسروں کی برائیوں کے تذکرہ پر قائم رہتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں آج بھی یہ سطحیت پائی جاتی ہے۔ کیونکہ شخصیت کی فلسفیانہ توجیہ یہاں کمزور یا ناپید ہے۔ یہاں ناولوں، افسانوں، ڈراموں اور سوانح میں خارجی حرکات و سکنات اور مواصل کے نقل کرنے میں تو مہارت کا اظہار کیا جا سکتا ہے لیکن اندرون نفس غواصی اور ملاحظہ خوری کوشش بہت کم ہوتی ہے، حالانکہ یہی وہ عمق ہے جسکی وجہ سے شخصیات کو بقا و دوام کی دولت نصیب ہوتی ہے[2]۔

مذکورہ بالا مباحث میں قدیم عربی خود نوشت سوانح عمریوں کے اندر جو تین اہم کمزوریاں بتائی گئی ہیں ان کی موجودگی کے بعض اسباب (مثلاً طبعی نسیان، قصدی نسیان، فطری حیا و شرم وغیرہ) تو وہ ہیں جو ہر زبان کی خود نوشت سوانح عمریوں کیلئے مسئلہ بنے ہیں لیکن بعض اسباب عربوں سے خاص طور سے متعلق ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ عرب فطرۃً اور قوموں کے بالمقابل باحیا اور خوددار واقع ہوئے ہیں وہ اپنے یا اپنے

---

[1] احسان عباس — فن السیرۃ ص ۱۲۲-۱۲۱

[2] " " ص ۱۲۳

بھائیوں کے حائب لشت ازبام کرنے سے حتی الامکان گریز کرتے ہیں اور دوسرے یہ کہ عرب جس دین کے علمبردار ہیں اس کی تعلیمات اولاً اخلاقی مفاسد پر ہر طرح سے قدغن لگاتی ہے۔ اور ثانیاً ان کے تذکرہ اور تشہیر کو بھی سختی سے ممنوع قرار دیتی ہے۔ تیسرے یہ کہ عربوں کی معاشرت میں اخلاقی مفاسد کو بہرحال ہمیشہ ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ ان خودنوشتوں میں بہت زیادہ وضاحت اور صاف گوئی کی راہ میں حائل ایک رکاوٹ عربوں کی سیاسی صورتحال بھی ہے۔ یہ صورت حال ہمیشہ پیچیدہ رہی ہے اور آزادی و فکر و رائے پر پابندی کی قائل رہی ہے۔ ڈاکٹر عبدالرحمان بدوی نے ایک سبب کی طرف متوجہ رہنمائی کی ہے وہ لکھتے ہیں :-

"عربوں کے بالمقابل ساموں کے یہاں چونکہ شخصیت کا تصور برابر پیچ رہا ہے اس لئے اس کے باعث عربوں میں خودنوشت سوانحعمری کا فن اس قدر ترقی پذیر نہیں ہو سکا جتنا آریائی نسل کے لوگوں میں ہوا۔ انھوں نے اس ادبی صنف کو اپنی فکری اور تحریری سرگرمیوں کی جولان گاہ بنایا یہاں تک اسے ادب کا ایک اصلی فن بنا دیا کیونکہ ان کے اندر اپنی شخصیت کا احساس بہت قوی اور واضح ہے۔ عربوں میں سے جنہوں نے اس باب میں کچھ لکھا ہے ان میں سے بیشتر خالص عرب نہیں تھے بلکہ دوسری جنسوں سے مرکب تھے"[1]

مذکورہ مباحث میں بھی اس کی وضاحت ہو چکی ہے کہ قدیم عربی خودنوشت سوانح عمریوں میں صراحت اور وضاحت کی کمی کی شکایت کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ یہ وصف وہاں سرے سے موجود ہی نہیں ہے کیونکہ جو شخص ابن الہیثم، امام رازی اور ابن خلدون وغیرہ کی تحریروں کا مطالعہ کرے گا وہ ان میں اس وصف کی موجودگی کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکے گا۔ ابن الہیثم نے صاف فکر سے لوگوں سے معتقدات کے خلاف آواز اٹھائی، اسی طرح محمد بن زکریا رازی نے اپنی کتاب "السیرۃ الفلسفیۃ" میں رائج الوقت فلسفیانہ افکار اور معاشرتی رسوم کے خلاف اپنا ذاتی موقف پیش کیا۔ اس کے باعث

---

[1] عبدالرحمن بدوی ـــــ التراث والعبقریۃ ص ۱۱۵

وہ مطعون ہوا لیکن اپنے موقف سے رجوع نہیں کیا۔ اسی طرح علامہ ابن خلدون نے بھی مختلف سیاسی و سماجی مسائل کے ضمن میں عام لوگوں سے ہٹ کر اپنے ذاتی خیالات کا اظہار کیا ہے۔

اگر مضمون اور مواد سے ہٹ کر خالص فنی لحاظ سے غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ عہد ماضی کی بیشتر مدلل خود نوشتوں میں فن کی وہ تمام خوبیاں اور عناصر پائے جاتے ہیں جو انھیں عہد جدید کی خود نوشتوں سے قریب کر دیتے ہیں ان میں سے اکثر کا اسلوب صاف اور واضح، عبارتیں شیریں، پیشکش خوبصورت اور سلیس اور انداز بیان افسانوی ہوتا ہے۔ ان سے ماضی کی تمام یادیں تازہ ہو جاتی ہیں اور واقعات و تجربات کی تصویر کشی سے جذبات میں حرکت اور حرارت پیدا ہو جاتی ہے۔

ان خود نوشتوں میں سے بیشتر نے زمانی و مکانی عناصر کے اثبات، شخصیات اور مقامات کے ناموں کی وضاحت اور تاریخ کی روشنی میں واقعات کی تفصیل وغیرہ پر توجہ دی ہے، اس کے ساتھ ان میں زبان اور اسلوب وغیرہ پر بھی توجہ دی گئی ہے۔ اس طرح یہ آپ بیتیاں کسی حد تک قاری کی توقعات پر پورا اترتی تھیں چنانچہ انھیں عوام و خواص کی طرف سے یکساں مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان میں سے بعض کے افسانوی طرز بیان نے ان سے دلچسپی اور شغف میں مزید اضافہ کر دیا۔

فنی طور سے ان بہترین خوبیوں کی موجودگی کے باوجود چونکہ بعض بنیادی کمزوریاں باقی رہ جاتی ہیں جن میں سے کچھ کی تفصیل پچھلے صفحات میں بیان کی جا چکی ہے پھر فنی خوبیوں کا جو حصار اوپر قائم کیا گیا ہے وہ فی الواقع قدیم مدلل خود نوشتوں کی مجموعی تصویر ہے ورنہ اگر انفرادی طور سے ہر خود نوشت کو الگ الگ جانچا پرکھا جائے تو اس پہلو سے بھی بعض کمیاں مل سکتی ہیں یہی وجہ ہے کہ ان میں سے بیشتر جدید تعریف کی رو سے خود نوشت کی فہرست سے خارج ہو جاتی ہیں گرچہ بعض خود نوشت سوانح نگاروں نے اس سمت بہترین کوششیں کی اور اپنے احوال کی تصویر کشی کے ساتھ ساتھ ادبی چاشنی

اور دوسری ضروری شرطیں پوری کرنے میں کامیابی بھی حاصل کی جن میں الصیتم، امیر عبداللہ، رازی، اُسامہ بن منقذ ابن خلدون اور شعرانی کا نام خاص طور سے قابل ذکر ہے لیکن ان مشاہیر ادب و تاریخ کی خودنوشت سوانح عمریوں میں کسی نہ کسی پہلو سے کچھ کمیاں ایسی باقی رہ گئیں جن کے باعث وہ عربی سرمایے کی اچھی اور نمائندہ کوشش ہونے کے باوجود جدید تعریف کے مطابق مکمل نہیں قرار پاتی ہیں۔ ان میں سے دو خودنوشتیں (۱) الاعتبار لاُسامہ بن منقذ اور (۲) مذکرات امیر عبداللہ، جدید تعریف پر بڑی حد تک پوری اترتی ہیں۔ اول الذکر زبان و بیان کے اعتبار سے فن کا جیتا جاگتا نمونہ ہے۔ زبان سلیس اور انداز افسانوی ہے۔ اس سے مؤلف کی طویل زندگی کے تجربات اور شخصیت کے پیچ و خم ابھر کر سامنے آ جاتے ہیں۔ اسی طرح امیر عبداللہ کی خودنوشت ان کی شخصیت کے تمام مراحل کی عکاسی کرتی ہے۔ امیر عبداللہ ایک سیدھے سادے اسلوب کے مالک تھے، ان کی زندگی آسائشوں اور تکلفوں سے مبرا تھی۔ اس لئے مختصر طور پر یہ ایک دلچسپ اور لائق مطالعہ خودنوشت بن گئی۔ اسمیں حقائق سے زیادہ تعرض کیا گیا اور تصور و خیال سے کم سے کم مدد لی گئی ہے۔

قدیم عربی خودنوشت سوانح عمریوں کے سرمایوں پر نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہیئت اور شکل و صورت کے اعتبار سے ان کے درمیان تنوع اور اختلاف پایا جاتا ہے، ان میں سے بعض خودنوشتیں اگر مکمل ہیں تو بہت سی غیر مکمل۔ اسی طرح بعض کی حیثیت مستقل بالذات خودنوشت کی ہے تو بعض دوسروں کی حیثیت ضمنی اور ذیلی کی ہے۔ ٹھیک اسی طرح چونکہ یہ خودنوشت سوانح عمریاں مختلف طبقات اور مختلف میدان کے لوگوں کے ذریعہ لکھی گئی ہیں اس لئے ان کے مضمون اور دوسری تفصیلات میں بھی فرق ہے۔ یہاں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بعض قدیم خودنوشت سوانح عمریوں کا تعارف پیش کیا جائے۔[1] اس تعارف سے پہلے ان کوششوں کا اجمالی تذکرہ افادیت سے خالی نہیں ہوگا جس میں کسی نہ کسی حیثیت سے مؤلفین نے اپنا تذکرہ خود کیا ہے۔

---

[1] ابن ابی اصیبعہ — طبقات الاطباء، قدیم عربی خودنوشت کی تفصیلات، عبدالرحمن بدوی، الموت والعبقریۃ اور معجم الادباء، یعقوب حموی سے ماخوذ ہیں۔

۱ - رسالۃ عن سیرۃ حنین بن اسحاق - طبقات الاطباء لابن ابی اصیبعۃ

حنین بن اسحاق م ۲۶۰ھ نے یہ رسالہ یونانی طبیب اور فلسفی جالینوس سے متأثر ہو کر لکھا۔ اسمیں انھوں نے اپنی زندگی کا تعارف پیش کیا ہے اور ان مشکلات کا ذکر کیا ہے جو اس کے حاسدین کی سازشوں سے خلیفہ متوکل کے دربار میں پیش آئی تھیں۔ یہ رسالہ ابن ابی اصیبعہ کی "طبقات الاطباء" میں مذکور ہے۔

۲ - السیرۃ الفلسفیۃ - فخر الدین رازی

یہ رسالہ بھی جالینوس سے متأثر ہو کر لکھا گیا ہے، اسمیں امام رازی نے اپنی فلسفیانہ زندگی پیش کی ہے۔ ابن ابی اصیبعہ کے طبقات میں اس کا کچھ حصہ موجود ہے۔

۳ - النکت العصریۃ - عمارۃ الیمنی

یہ کتاب فی الواقع مصری وزراء کے بارے میں ہے لیکن اسمیں مصنف نے اپنی زندگی کی داستان بھی قلم بند کی ہے اور اپنی بہت سے حکایات اور قصائد کا ذکر کیا ہے۔

۴ - مبادمات - قاضی فاضل

قاضی فاضل نے اسمیں اپنی زندگی کی بہت سی باتیں نقل کی ہیں۔ اس کتاب کو ملی زبان میں اعترافات کی نوعیت کی کتاب سمجھا جاتا ہے۔

۵ - الفلک المشحون فی أحوال محمد بن طولون - محمد بن علی بن طولون

دسویں صدی ہجری کے معروف مؤرخ نے یہ رسالہ مستقل طور سے اپنے احوال کے لئے لکھا ہے۔

۶ - لغتۃ الکبد الی نصیحۃ الولد - عبد الرحمن بن الجوزی

یہ رسالہ استاذ ابن جوزی نے اپنے بیٹے کی نصیحت کیلئے لکھا ہے، لیکن چونکہ اسمیں اپنی تالیفات

اور حکایات کو بھی نقل کیا ہے، اس لئے اسے خود نوشت کی قسم کا سمجھا جاتا ہے۔

۷۔ الضوء اللامع لأهل القرن التاسع ۔ شمس الدین سخاوی

یہ کتاب پوری صدی کے لوگوں کی تاریخ پر مشتمل ہے لیکن مصنف نے اس میں اپنی زندگی کا تعارف بھی پیش کر دیا ہے۔ اس میں زندگی سے متعلق بہت سی جزئیات بھی آگئی ہیں۔

۸۔ الإحاطة في أخبار غرناطة ۔ لسان الدین بن خطیب

مذکورہ کتاب کی طرح اس کتاب میں بھی مصنف نے اپنے احوال زندگی شامل کر دیے ہیں۔

۹۔ حسن المحاضرة في أخبار مصر والقاهرة ۔ جلال الدین السیوطی

اس کتاب کا معاملہ بھی مذکورہ بالا دونوں کتابوں کی طرح ہے۔

۱۰۔ سیرة ابن الهیثم الذاتیة ۔ بقلمہ[1]

اس سے مختلف اقتباسات ابن ابی اصیبعہ نے نقل کیا ہے۔ ابن ہیثم کی جرأت، بے باکی اور صاف گوئی قابل ستائش ہے۔ اس نے مختلف عقائد اور دیگر مسلم امور و روایات کے خلاف آواز بلند اور شک کا اظہار کیا۔

مذکورہ بالا کتابوں کے علاوہ بعض دوسری تحریریں بھی ملتی ہیں جنمیں مصنف نے اپنی زندگی خود بیان کی ہے۔ مثلاً ابن ابی اصیبعہ ہی نے ابن سینا، موفق الدین البغدادی اور ابن رضوان کی مختصر خود نوشتیں نقل کی ہیں[2]۔ اسی طرح جاحظ، ابوحیان توحیدی، صلاح الصفدی، نہابی اور بھولی وغیرہ کی بھی ایسی تحریریں موجود ہیں جنمیں ان کے احوال زندگی اور حکایات و واقعات مذکور ہیں۔ ان کے علاوہ بھی عربی زبان میں بعض دوسری تالیفات کا وجود ملتا ہے جو کسی نہ کسی پہلو سے اپنے مصنفین کا تعارف پیش کرتی ہیں۔

---

[1] شوقی ضیف ۔ الرحلة الشخصیة، ص ۹۳ ۔ ۱۲ [2] ابن ابی اصیبعہ ۔ طبقات الاطباء ج ۲ ر ۲، ۳، ۹۰، ۹۲ ۔

عربی زبان کی مختصر یا طویل، اسیطرح مستقل یا غیر مستقل خودنوشت سوانح حیات کے مذکورہ اجمالی تعارف کے بعد اب بعض ایسی تصنیفات کا تعارف مقصود ہے جو قدرے طویل ہیں اور جنکی حیثیت بھی مستقل بالذات جیسی ہے۔ ان میں ان کے مؤلفین نے اپنی ذات کو واشگاف کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس طرح کی تالیفات کل تقریباً چھ ہیں۔

۱۔ طوق الحمامۃ فی الالفۃ والالاف :۔ یہ کتاب ابن حزم اندلسی (۳۸۴ھ/۹۵۴ء) کی تالیف ہے۔ مختلف دوسری خوبیوں اور اوصاف کے علاوہ یہ فقہ کے ایک مستقل مذہب کے بانی ہیں اور دینی امور میں ان کا تشدد اور عدم مداہنت معلوم و معروف ہے لیکن اس کے باوجود انھوں نے یہ کتاب اپنے جذباتِ محبت کی تعبیر و تفصیل کیلئے تحریر کی ہے۔ عربی زبان کے ذخیرۂ کتب میں اس کتاب کو اس حیثیت سے نمایاں مقام ہے کہ اسمیں مصنف کے کمزور گوشۂ زندگی بھی دائرہ تحریر میں لے لئے گئے ہیں۔ یوں موجودہ اصطلاح کے مطابق یہ "اعترافات" کی نوعیت کی کتاب ہے[۱]۔ مصنف کی صاف گوئی اور صراحت کا عالم یہ ہے کہ مذہبی حیثیت کے حامل ہونے کے باوجود اپنے تجربات عشق و محبت کھول کر بیان کر دیتے ہیں۔ اس کتاب میں ہزاروں چھوٹی چھوٹی حکایاتِ محبت مذکور ہیں۔ اس کا انداز افسانوی ہے اور یہ کل تیس ۳۰ فصلوں پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس سے پانچویں صدی ہجری کے اندلس کی اندرونِ خانہ صورتحال ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔ بلاشبہ یہ صورتحال بے حد ابتر تھی۔ فارغ بالی اور خوشحالی کی وجہ سے لذت اندوزی اور نفس پرستی کا ہر طریقہ وہاں عام تھا۔ ظاہر ہے اسی سماج سے ابن حزم کو بھی واسطہ پڑا تھا۔ یہ بھی مختلف ادوار اور مراحل سے گزر کر کچھ بن سکے تھے۔ انھوں نے کوئی بات مخفی نہیں رکھی اور اپنے احوالِ دل اور کیفیاتِ قلبی بڑی دقت اور مہارت سے لوگوں کے سامنے پیش کر دی[۲]۔

---

[۱] احسان عباس ــــ فن السیرۃ ص ۱۲۱

[۲] ابن حزم ــــ طوق الحمامۃ ص ۲۸

اس کتاب کے ابواب اور اس کے مشتملات دیکھ کر ہی اس کے مصنف کی باریک بینی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ کتاب کے تیس ۳۰ ابواب میں سے دس میں محبت کے اصول بتائے گئے ہیں، بارہ ابواب میں محبت سے اغراض و مقاصد اور اس کی پسندیدہ و ناپسندیدہ صفات بتائی گئی ہیں، پھر چھ ابواب میں محبت کے ساتھ پیش آنے والی مشکلات کا تذکرہ کیا گیا ہے اور آخری دو ابواب میں معصیت اور پاکیزگی کے فائدے اور نقصانات بتائے گئے ہیں۔ پوری کتاب میں بڑی حد تک محبت کی تمام شکلوں اور جزئیات کا احاطہ کر لیا گیا ہے۔ اس طرح یہ کتاب مصنف کی اور مصنف کے پورے معاشرے زندہ تصویر پیش کر دیتی ہے کتاب کی ادبی فنی اور دوسری خوبیوں کی بنیاد پر اسے عربی زبان کی ایک بہترین خود نوشت قرار دیا گیا ہے۔ کتاب میں جگہ جگہ نفسیاتی تجزیہ بھی کیا گیا ہے۔ اسطرح اسے "استبطان نفسی" اور "تعمق نفسی" کی شاہکار بتایا گیا ہے[1]۔

اس کتاب کی مذکورہ خوبیوں کیساتھ تو ساتھ بعض خامیاں بھی ہیں۔ مثلاً کتاب بعض واقعات کی نسبت مصنف اپنی طرف کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے، بس اشاروں کنایوں سے کام لیا۔ زندہ لوگوں کے واقعات خاص طور سے بغیر نام کی صراحت کے بیان کیا۔ بہت سی یادیں بھی نسیان کا شکار ہو گئیں، اسمیں اشعار کی کثرت ہے، کہیں کہیں ضائع بدائع کی بھی زیادتی معلوم ہوتی ہے۔ کہیں کہیں "طربیات ادب" (الادب المکشوف) کا مظاہرہ بھی ہوا ہے[2]۔

۲۔ السیرۃ المؤیدیۃ :۔

اس کتاب کے مؤلف المؤید فی الدین ھبۃ اللہ بن موسیٰ بن داؤد الشیرازی (۳۹۰ — ۴۷۰ھ) ہیں۔ یہ فاطمی سلطنت کے زیر دست داعی تھے۔ انھوں نے اپنی اس کتاب میں اپنی زندگی کے صرف متعین مرحلہ (۴۲۹ھ تا ۴۵۰ھ) کی تصویر کشی کی ہے[3]۔ یہ وہی مؤید ہیں جن کے ابو العلاء المعری سے حرمت لحم اور اکتفا بالنباتات کے سلسلے میں طویل مراسلت ہوئی تھی۔ یہ فطرۃً اور جاہ و عزت کے حد سے زیادہ طلبگار تھے۔ مشہور بویہی فرماں روا ابو کالیجار کو انھوں نے اپنے اسماعیلی مذہب کا حامی

---

[1] احسان عباس — فن السیرۃ ص ۱۲۲-۱۲۳ [2] اسکی ایک مثال کتاب کے صفحہ عشر پر موجود ہے

[3] المؤید فی الدین — السیرۃ المؤیدیۃ، دار الکتاب العربی المصری ۱۹۴۹ء

بنا لیا جبکہ وہ اس کا بے حد مخالف تھا۔ پھر اپنے مقاصد عالیہ کی تکمیل کیلئے ایران سے مصر چلا گیا یہاں فاطمیوں نے اسے کوئی خاص مقام نہیں دیا۔ وہ پوری سلطنت میں سرگرداں رہا یہاں تک کہ لسبا سیری کے ساتھ مل کر خلافت عباسیہ کے خلاف سازش کیا۔ اسمیں اسے کامیابی ملی اور بغداد کے منبروں پر فاطمی خلیفہ کے نام کا خطبہ پڑھا جانے لگا۔ مؤید کی نظر میں یہ پورا زمانہ بے حد اہم تھا، اور وہ یہ دیکھ رہا تھا کہ کسی مؤرخ کا قلم اس کا حق ادا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ چنانچہ اس نے خود اس کام کی انجام دہی کا عزم کیا اور اس کے نتیجہ میں یہ کتاب منظر عام پر آئی۔

انھوں نے اپنی اس کتاب میں تفصیل کیساتھ ان واقعات اور حادثات کو بیان کیا ہے جو ابو کالیجار کے دربار میں پیش آئے اور اپنے خلاف ہونے والی اُن سازشوں کو ذکر کیا ہے جن کے باعث اسے ایران چھوڑ کر مصر جانا پڑا، پھر مصر میں سفر وغیرہ کی جو صعوبتیں برداشت کرنی پڑی ان پر روشنی ڈالی ہے اور یہ بتایا ہے کہ کیسے لسباسیری کے ساتھ مل کر خلافت عباسیہ کے خلاف سازش کرنے میں کامیابی ملی؟ اسکے باوجود اس کے اسباب و علل کیا تھے؟[1] ان امور کے علاوہ کتاب میں جگہ جگہ دوسرے دینی، فقہی اور معاشرتی کا تذکرہ ہے۔ ان سے مصنف کی قوت مناظرہ اور بحث و جدال کا ثبوت ملتا ہے

یہ کتاب جیسا کہ بتایا جا چکا ہے ۴۲۹ھ سے ۵۰۰ھ تک کی تاریخ پر مشتمل ہے کتاب میں مصنف کے تین اہم مراحل حیات کی تصویر کشی اس کے تین الگ الگ ابواب میں کی گئی ہیں۔ یہ کتاب چونکہ ایک پر آشوب دور کی یادگار ہے اس لئے اس کی تاریخی، معاشرتی اور سیاسی اہمیت کا اندازہ لگانا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ استاذ محمد حسین ہیکل نے اسے صرف مصنف کی سوانح حیات نہیں بلکہ پورے نصف صدی کی تاریخ پر ایک اہم ماخذ قرار دیا ہے[2]۔ بلاشبہ مصنف کے اپنے زمانے کے حالات سے بڑا گہرا رابطہ و تعلق تھا اس لئے ان کے بارے میں تفصیلی معلومات ان کی کتاب سے مل جاتی ہیں۔

---

[1] السیرۃ المؤیدیۃ ص ۶۹-۶۰

[2] محمد کامل حسین ـ فی ادب مصر الفاطمیۃ ص ۱۱۶ دار الفکر العربی القاہرۃ (ب ت)

اس کتاب کی اہمیت کے باوجود اس پر بعض اعتراضات بھی کئے گئے ہیں۔ ایک اعتراض یہ ہے کہ مصنف نے بہت سے پیچیدہ مسائل میں کوئی موقف واضح اختیار نہیں کیا۔ اور دوسرے فاطمی مبلغین کی طرح "تقیہ" سے کام لیا۔ خود اپنی زندگی کی بہت سی تفصیلات سے پردہ نہیں اٹھایا۔ ان کی ابتدائی زندگی پیدائش سے لیکر تعلیم و تربیت تک کی بالکل مستور اور مخفی ہے[1]۔ دوسرا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ ان کا اسلوب سخت ہے، اس میں سہولت اور روانی نہیں ہے سجع کا بکثرت استعمال ہے جبکہ خود مصنف نے ابوالعلاء کے بعض رسائل میں اسے عیب قرار دیا تھا[2]۔ تیسرا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ کتاب میں غرور اور تعلی کے احساسات غالب ہیں۔ ہر جگہ اپنے وقار اور انا کا تحفظ کیا گیا ہے۔ اسی لئے لوگوں کے اجتماعی، سیاسی اور معاشی مسائل سے بہت زیادہ تعرض نہیں کیا۔ ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ واقعات کی تاریخ وغیرہ کا ذکر نہیں ہے۔ چنانچہ پانچویں صدی ہجری کی کسی تاریخی کتاب کی مدد کے بغیر بہت سی باتیں واضح نہیں ہو پاتی ہیں[3]۔

مذکورہ بالا اعتراضات اپنی جگہ پر صحیح ہیں، صرف ان میں سے ایک دو پر کلام کیا جا سکتا ہے لیکن اسی سے قطع نظر بحیثیت ایک خود نوشت اس کی اہمیت مسلم ہے۔ ڈاکٹر احمد حسین صبحی نے اپنی کتاب "فی ادب الفاطمیین" میں اسے اپنے موضوع پر بہترین کتاب قرار دیا ہے اور اس کو عربی زبان میں خود نوشت سوانح نگاری کی اولین کوششوں میں شامل کیا ہے[4]۔

۳۔ التعریف بابن خلدون و رحلتہ شرقاً و غرباً:

علامہ ابن خلدون کا زمانہ بھی پر آشوب، پر پیچ اور اضطراب انگیز رہا ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی سوانح قلمبند کی۔ اور اس میں اپنی ابتدائی زندگی کی تفصیلات بھی فراہم کر دیں۔ اس کے علاوہ ان کے خطوط اور اشعار کی بھی معتد بہ تعداد ہے لیکن اسی کتاب کی تالیف کا بنیادی مقصد کچھ امور کی وضاحت اور تفصیل پیش کرنی تھی۔ ان پر یہ الزام تھا کہ اندلس میں انھوں نے بہت سے انقلابات میں شرکت کی ہے۔ لوگ انھیں ناپسند کرنے لگے تھے یہاں تک کہ

---

[1] مقدمہ محمد کامل حسین ـ السیرۃ المؤیدیۃ ص ۱۳، [2] احسان عباس ـ من السیرۃ، ص ۱۳

[3] تحقیق محمد کامل حسین ص ۱۶۹ [4] ایضاً ص ۱۱۷

ان کے دوست لسان الدین بن الخطیب بھی۔ اسیطرح مصر میں انھیں متعدد بار قضا کی ذمہ داری سونپی گئی لیکن ہر بار انھیں معزول کر دیا گیا اس سے یہ اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کہ اس کا سبب لوگ خود ان کو قرار دینے لگیں۔

مذکورہ دو اسباب اور بعض دوسرے اسباب کی بنا پر انھوں نے اپنی خودنوشت تحریر کی۔ اس کتاب کے مطالعہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی پوری زندگی کی جزئیات کا احاطہ کرنا اپنا مقصود نہیں بنایا تھا۔ چنانچہ اپنی ابتدائی بیس سال کی زندگی چند صفحات میں سمیٹ دی اور بچپن و نوجوانی کے بہت سے امور و مسائل سے تعرض نہیں کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی علمی اور سیاسی تاریخ لکھنا زیادہ مقدم سمجھتے تھے، خاص طور سے سیاسی حالات کا تجزیہ کرنا چاہتے تھے۔ اپنی کتاب میں تاریخ اور سن لکھنے کا انھوں نے بہت زیادہ اہتمام کیا۔ یہاں تک کہ اپنے اساتذہ، شیوخ طریقت اور ساتھیوں کے بہت سے واقعات کی تاریخ بھی لکھ دی ہے[1]۔ یہ ان کی کتاب کا ایک اہم وصف ہے۔ اس کتاب میں خاص طور سے اس عتاب کا ذکر کیا ہے جو مختلف حکمرانوں کی طرف سے ان پر نازل ہوتا رہا۔ اور انھوں نے ہر ایک کو خندہ پیشانی سے برداشت بھی کیا۔ ان کی طرف سے اس وقت بھی اور نہ ہی ان واقعات کے قلمبند کرتے وقت کسی طرح کا منفی ردعمل ظاہر ہوا۔ یہ بڑے ظرف کی بات ہے[2]۔

ابن خلدون کی اس کتاب پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اسمیں مراسلات کی کثرت ہے[3] اور مراسلات بھی اگر بقدر ضرورت نقل کر لیے جائیں تو کوئی حرج نہیں لیکن یہاں پورے کے پورے بے موقع اور بے محل نقل کر لئے گئے ہیں۔ ابن خلدون کو خود اس کا احساس تھا کہ ان سے کتاب کا مقصد فوت ہو جائیگا لیکن اسے افادۂ عام کیلئے نقل کرنے پر مصر تھے وہ صرف اپنے مراسلات ہی نہیں بلکہ دوسروں کے بھی مراسلات نقل کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ اپنے ساتھی ابن خطیب کے دس صفحہ کے ایک مراسلے

---

[1] ابن خلدون ــ التعریف بابن خلدون ص ۶۰-۱۲ [2] ایضاً ص ۶۷

[3] ایضاً ص ۸۲-۸۴ [4] ایضاً ص ۱۳۰

کو پورا نقل کر دیا[1] - اس سے مقصود ان کی زبان دانی کا اثبات تھا - حالانکہ یہ اس سے بچ سکتے تھے - اسیطرح اس کتاب پر یہ بھی اعتراض کیا جاتا ہے کہ اسمیں بعض واقعات و حادثات کی تکرار ہے اور بعض واقعات مقصد سے ہم آہنگ نہیں تھے - علامہ ابن خلدون ان کے نقل کرنے کو حق بجانب قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس سے قاری کو مراجعت میں آسانی ہوگی - اس کتاب پر ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ اسمیں ابن خلدون کے فکری ارتقاء، اسلوب تحریر اور فلسفۂ زندگی کے بارے میں تفصیلات نہیں ہیں -

ان سب اعتراضات کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ "کتاب التعریف" ایک اہم تاریخی دستاویز ہے، اسمیں ایک زمانے کے سیاسی اور معاشرتی احوال کی بہترین تصویر بیان کر دی گئی ہے - ان احوال کا مصنف کا خود بیحد گہرا تعلق تھا - علاوہ ازیں مصنف ایک مضبوط اور معتدل شخصیت کے مالک تھے قضا کی ذمہ داریوں کی انجام دہی میں حق کا دامن ہمیشہ پکڑے رکھا - ان کے خلاف سازشیں کی گئیں - الغیں متعدد بار معزول کیا گیا - لیکن جادۂ حق سے منحرف نہیں ہوئے - اولاً وہ قضا کی ذمہ داری قبول کرنے سے گریز کرتے تھے لیکن بادشاہ وقت کی طرف سے کسی اصرار کو ٹالتے نہیں تھے - عزل و نصب کے سلسلے میں بادشاہ وقت کے تمام اقدامات کو وہ قبول کرتے تھے اور ان پر کوئی ردعمل ظاہر نہیں کرتے تھے - ان کے نزدیک بادشاہ بہرحال ایک محترم ہستی تھی[2]

۴ - کتاب الاعتبار: یہ کتاب مشہور مسلم مورخ اور مرد مجاہد اسامہ بن منقذ (م ۵۸۴ھ) کی یادگار ہے - مذکرات کی نوعیت کی یہ کتاب اپنے مصنف کی زندگی کے تجربات و مشاہدات کو عام فہم انداز میں پیش کرتی ہے - اپنی تاریخی اہمیت کے پیش نظر اسے چھٹی صدی ہجری کے حالات و واقعات کے بارے میں واقفیت کا ایک بہترین ذریعہ قرار دیا جا سکتا ہے - مصنف نے اسمیں خاص طور سے شام اور مصر کے اسلامی معاشرے اور صلیبی جنگوں میں اپنی شرکت و شجاعت و جوانمردی کے واقعات

---

[1] ابن خلدون — التعریف بابن خلدون ص ۶۰-۱۲، ص ۲۷۸ ،

[2] احسان عباس — فن السیرۃ ص ۱۲۰ ،

کئے ہیں۔ عہد ایوبی میں صلیبی جنگوں کا جو طویل سلسلہ رہا ہے اس کے بارے میں یہ کتاب بیش قیمت مواد فراہم کرتی ہے۔ کتاب کی خوبی یہ ہے کہ اس کا مصنف بہترین مؤرخ، ادیب اور سپہ سالار تھا اس لئے اسے کوئی واقعہ قلمبند کرنے میں دقت پیش نہیں آئی۔ واقعات کی جمع و تدوین میں صداقت، اعانت اور عدل و انصاف کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اس کا اعتراف مسلم محققین کے علاوہ مستشرقین کو بھی ہے[1]۔

کتاب کا مرکزی موضوع مصنف کی جوانمردی اور شجاعت کا بیان ہے۔ مصنف نے بچپن کی زندگی سے ایسے واقعات نقل کئے ہیں جو اس کی بہادری پر دلالت کرتے ہیں۔ اس جوہر گرانمایہ کی دیکھ ریکھ اور پرورش و آرائش میں ان کے والد کی تربیت کا خصوصی دخل تھا۔ وہ کسی بھی جرأت مندانہ اقدام پر انکار نکیر نہیں کرتے تھے[2]۔ مصنف کو شکار کھیلنے سے بھی بہت زیادہ دلچسپی تھی۔ اس سے متعلق کئی ایک واقعات کتاب میں منقول ہیں، جو ان کی بے خوفی، ہمت اور حوصلے پر بہترین دلیل ہیں۔ بقیہ فرنگیوں کے ساتھ معرکہ آرائی کے تو بے شمار واقعات ہیں۔ مصنف نے اس کتاب میں یہ فلسفہ بار بار دہرایا ہے کہ "موت کا ایک وقت متعین ہے، یہ اپنے وقت پر آئے گی۔ انسان اگر جلدی کرنا چاہے تو اس کے لئے ممکن نہیں خواہ وہ کتنے ہی بڑے خطرات میں اپنے کو ڈالتا رہے"[3]۔

کتاب کی اور خوبیوں کے علاوہ ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں مسلم اور عیسائی مردوں اور عورتوں کی نفسیات اور رجحانات کا بہترین مطالعہ کیا گیا ہے۔ ساری ایسے پڑھ کر دلچسپی کا بہت سا سامان پالیتا ہے۔ اس میں اپنی ذات کی مبالغہ آمیز مدح و توصیف بھی نہیں ہے۔ اس کتاب کی کمیوں میں ایک یہ ہے کہ اس میں زبان کہیں کہیں بے ربط معلوم ہوتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مصنف نے پیرانہ سالی میں اسے ترتیب دیا اور کسی کی مدد سے اسے مدون کیا۔ یہی وجہ ہے کہ غلطیاں باقی رہ گئیں۔ کتاب میں عوامی زبان کے الفاظ اور ترکیبیں بھی ہیں۔ کیونکہ مصنف کا عوامی زندگی سے گہرا رابطہ تھا اور

---

[1] مقدمہ فلیپ حتی ۔ کتاب الاعتبار ص ۔ [2] ایضاً ص ۱۰۲

[3] ایضاً ص ۱۶۲ ،

وہ اس کتاب کو ہر طبقہ کے لوگوں کے لئے لکھ رہا تھا۔

۵۔ المنقذ من الضلال :۔

یہ کتاب مشہور اسلامی مفکر اور فلسفی امام غزالی کی تحریر کردہ ہے۔ اس میں انھوں نے اپنے اندرون ہر پار اس کشمکش کی تصویر کھینچی ہے جو فکر و فلسفہ کی وادیوں میں سرگرداں ہونے کی وجہ سے انھیں درپیش تھی[1]۔ حتیٰ کہ شدید روحانی اضطراب و انتشار سے دوچار ہونے کے بعد انھیں حق کی معرفت ہوئی اور ریب و تشکیک کا زمانہ ختم ہوا۔ وہ اس کی تفصیل بتاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ انھیں علم و فن و معرفت کی راہ میں مشکلات و مصائب برداشت کرنے کا شوق بچپن سے تھا۔ وہ ہر بات کا تنقیدی مطالعہ کرتے تھے۔ تقلید و اتباع ان کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں تھی۔ اپنی اس طبیعت کی وجہ سے وہ تمام موروثی عقائد اور روایات پر شک کرنے لگے۔ حقیقت کی تلاش میں انھوں نے مختلف فلسفیانہ مسالک کا مطالعہ کیا لیکن کہیں تشفی نہیں ہوئی۔ آخر کار تصوف کا مطالعہ کیا اور یہاں ان کی متاعِ گمشدہ انھیں حاصل ہوگئی۔ وہ صوفیاء سے بیحد متاثر ہوئے اور انھیں اپنا آئیڈیل بنایا اس نئی بات کے بعد وہ دنیا اور اس کی علائق سے کنارہ کش ہوگئے حالانکہ ان کے ساتھیوں نے انھیں روکا لیکن وہ بغداد میں اپنا علمی و تدریسی حلقہ چھوڑ کر شام، فلسطین اور حجاز چلے گئے۔ آخری وقت میں پھر بغداد لوٹ آئے لیکن اپنی قلبی کیفیت کی تسکین و تسلی کے لئے وہ برابر تصوف سے جڑے رہے کیونکہ یہی مسلک ان کے نزدیک معنی پر حق تھا[2]۔ امام غزالی کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے اپنی روحانی سراسیمگی اور مضطرب کیفیت کی پوری تصویر کھینچ دی ہے۔ کسی بات کو کہنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کی۔ بلاشبہ ایک عظیم مرتبہ پر فائز ہونے کے بعد اگر وہ چاہتے تو بہت سی باتیں چھپا لے جاتے۔ کم از کم عقائد میں اپنے ریب و تشکیک کا تذکرہ نہ کرتے۔ ان کی دوسری خوبی یہ ہے کہ وہ اپنی نفسیاتی اور ذہنی کیفیت بیان کرنے پر بھرپور قدرت رکھتے ہیں اس کتاب میں جس طرح مختلف مواقع پر اندرونی جذبات و احساسات کی تعبیر کی گئی ہے وہ ان کی

---

[1] المنقذ من الضلال ۔ الغزالی ، ص ۳۳

[2] ایضاً ص ۵۱

قوتِ بیان اور اظہار ما فی الضمیر کی بہترین مثال ہے۔ اس کتاب کی ادبی حیثیت مسلم ہے اگر اس کا اندازہ کرنا ہو تو صرف اس پیراگراف کا مطالعہ کافی ہے۔

"میں دنیا کی خواہشات اور آخرت کے محرکات کے مابین تقریباً چھ ماہ اندرونی کشمکش سے دوچار رہا ..... یہاں تک کہ یہ معاملہ میرے ہاتھ سے نکل گیا۔ اب میں چاہتا تو بھی اس سے نکل نہیں سکتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے میری زبان پر قفل ڈال دیا تھا۔ میں بعض لوگوں کی دلجوئی کیلئے کسی دن درس دینے کی کوشش کرتا تو میری زبان سے ایک بات بھی ادا نہیں ہو پاتی۔ یہ معاملہ زبان سے نکل کر دل تک پہنچ گیا۔ میرا نظام ہاضمہ خراب ہو گیا اور کھانا پانی مجھے راس نہیں آنے لگا ..... اطباء نے دیکھ کر کہا کہ یہ معاملہ دل سے ہو کر مزاج میں سرایت کر گیا ہے اب اس کا علاج ممکن نہیں۔ الا یہ کہ اس تکلیف دہ غم کا کوئی علاج کر دیا جائے ..... میں اللہ تعالیٰ سے دعا کی پس اللہ تعالیٰ نے مجھے دنیا سے بے نیاز کر دیا۔"[1]

۶۔ مذکرات الأمیر عبد اللہ

یہ کتاب جیسا کہ نام سے واضح ہے، مغرب کے آخری مسلم فرماں روا امیر عبد اللہ کی خود نوشت ہے۔ ان کی زندگی سازشوں، آزمائشوں اور تباہیوں کے درمیان بسر ہوئی۔ انہیں ایک طرف عیسائیوں کا مقابلہ کرنا پڑا تو دوسری طرف مرابطین کے فرماں روا یوسف بن تاشفین کی ناراضگی، عتاب اور حملے سے بچنا تھا۔ حکومت کمزور ہو چکی تھی اور مفاد پرست وزراء اور امراء دونوں طرف سازباز کر کے امیر عبد اللہ کو ہر طرح سے مفلوج کر دینا چاہتے تھے۔ افواہوں کا بازار گرم تھا اور امیر کے ہر عمل اور حرکت کی غلط اور بے بنیاد تعبیر پیش کی جا رہی تھی۔[2] ان حالات میں امیر نے اپنی خود نوشت لکھنے کا فیصلہ کیا، اور اپنے خلاف عائد کردہ تمام الزامات، اپنے تمام اقدامات اور اپنی تمام پالیسیوں کی وضاحت

---

[1] الغزالی ۔ المنقذ من الضلال ص ۹۰-۹۱

[2] مذکرات الأمیر عبد اللہ ص ۱۲۱

کی۔ انھوں نے صورت واقعہ بلا کسی کمی یا زیادتی کے لوگوں کے سامنے رکھ دی۔

یہ کتاب جلا وطنی کے زمانے میں لکھی گئی ہے۔ صورت حال یہ ہے کہ مراکش نے امیر کے لنصف کو خالی ہاتھ، بے یار و مددگار ملک سے نکال دیا۔ ایک شخص جو کبھی ہر چیز کا مالک رہا ہو اس کے لئے ویران، بے سروسامانی اور تنہائی کی زندگی کتنی اذیت ناک ہوگی اسے بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور اس عالم میں انسان جو کچھ لکھتا ہے اسمیں جذبات کی حرارت اور حقائق کی صداقت کا ایک حسین امتزاج ہو جاتا ہے۔ امیر کی خود نوشت میں یہ سب کچھ ہے۔ اس کے مطالعہ سے قاری بیحد جذباتی ہو جاتا ہے[1] اور اس کی تمام ہمدردیاں مصنف کے ساتھ ہو جاتی ہیں۔ امیر نے اس کتاب سے اپنا دفاع کرنا چاہا ہے لیکن صحیح بات یہ ہے کہ ان کی شخصیت ہر طرح کے دفاع سے بالاتر ہے۔ تاریخ خود صحیح اور غلط واضح کر دیتی ہے۔

اس کتاب کی ایک اہم خوبی یہ ہے کہ اس میں مصنف کی ذاتی زندگی اور نجی حالات کیساتھ ساتھ اندلس کی سیاسی اور معاشرتی زندگی کا بھی شاندار نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ اس طرح یہ ایک قیمتی تاریخی دستاویز قرار پاتی ہے جس سے مصنف کی شخصیت اور مصنف کے معاشرے کی صورتحال دونوں کے حقائق نمایاں ہو کر سامنے آجاتے ہیں۔ اس کتاب کی ایک دوسری خوبی یہ ہے کہ اس کا انداز بیان ادبی ہے۔ اس سے نفس کے اندر ادبی لذت پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے کہ امیر عبداللہ کا امتیازی ان کا شیریں اور دلچسپ ادبی اسلوب ہے۔ اسمیں مکالمات کو اس طرح فنی قالب میں پیش کر دیا جاتا ہے کہ پوری صورتحال اپنی حقیقی شکل میں سامنے آجاتی ہے۔ انھیں بہرحال اپنی مکالمات کو جاندار انداز میں پیش کرنے کی بھرپور صلاحیت حاصل تھی۔ انھوں نے زندگی کے واقعات میں حرکت اور حرارت پیدا کر دی اور اسے خیال اور تصور کی بھی تھوڑی سی مقدار سے مزین کر دیا۔ عربی خود نوشتوں

---

[1] بطور مثال کتاب کا صفحہ نمبر ۱۵۸ دیکھا جا سکتا ہے۔

میں اس کی نظیر مشکل سے ملے گی ۔ اس لیے اپنی خوبیوں کی بنا پر یہ کتاب کی جمالیاتی حس کو بیدار کر دیتی ہے اور اس کے اندر مزید مطالعہ کا شوق پیدا کرتی ہے ۔ اسے بار بار پڑھنے سے گھبراہٹ نہیں ہوتی ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی ڈرامہ یا افسانہ ہے حالانکہ بات ایسی نہیں ہے یہ اس کی فنی خوبی ہے اور پیشکش کا نرالا انداز ہے[1]۔

---

[1] الدکتور یحیی ابراھیم عبد الدائم ص ۱۳

فصل دوم:

عصرِ حاضر میں
خود نوشت سوانح نگاری کا ایک تعارف

جدید عربی ادب کے ایک سرسری مطالعہ سے یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ اسمیں فن خود نوشت نگاری کو ایک معقول اور مناسب مقام ملتا جا رہا ہے یہی وجہ ہے کہ اسمیں دن بدن کمیت اور کیفیت دونوں اعتبار سے اضافہ ہو رہا ہے ۔ اسکی مزید وضاحت اس وقت ہو جاتی ہے جب ہم پیچھے مڑ کر اپنے قدیم سرمایے پر نظر ڈالتے ہیں ۔ واقعہ یہی ہے کہ خلافت عباسیہ کے زوال کے بعد ، اولاً کسی مستحکم عربی اسلامی کے موجود نہ ہونے کی وجہ سے اور ثانیاً علوم وفنون سے اوپر سے مسلم حکمرانوں کی سرپرستی ختم ہونے کی وجہ سے ، تمام اسلامی ، ادبی ، علمی اور تحقیقی کوششوں کا دروازہ بند ہو گیا تھا ۔ دوسرے علوم مثلاً تاریخ اور سیرت وغیرہ پر علماء اور حکمرانوں دونوں کی توجہ کسی حد تک باقی تھی ۔ لیکن عربی ادب عہد تحکومی اور عہد عثمانی میں بالکل ٹھٹھر کر رہ گیا تھا ۔ جہاں تک خود نوشت نگاری کی بات ہے تو ادب کی انتہائی مظلوم اور متروک صنف یہی قرار پائی [1]

نویں صدی ہجری میں علامہ ابن خلدون کی خود نوشت "التعریف بابن خلدون" کے بعد کوئی قابل ذکر اور مستقل بالذات خود نوشت سامنے نہیں آئی ۔ گرچہ ان ہی کے تین معاصر علماء نے اپنی زندگی ہی

---

[1] روزنتال ـــــ علم التاریخ عند المسلمین ص ب ۔ ج ،

انداز میں مرتب کی جو علماء کا پہلے سے جانا پہچانا طریقہ رہا ہے۔ وہ علماء سخاوی، سیوطی اور ابن حجر عسقلانی ہیں۔ انھوں نے دیگر تاریخی اور سوانحی کتابوں میں اپنی زندگی کی مختصر داستان بیان کردی۔ سخاوی نے اپنی کتاب "الضوء اللامع لأهل القرن التاسع"، سیوطی نے اپنی کتاب "حسن المحاضرة"، اور "طبقات المفسرین"، اور ابن حجر عسقلانی نے اپنی کتاب "رفع الإصر عن قضاة مصر" کے ذیل میں ضمناً اپنا تذکرہ کیا ہے لیکن اس تذکرہ کی کوئی ادبی اہمیت نہیں ہے۔ اس کے بعد مشہور مؤرخ "ابن طولون" نے اپنی کتاب "الفلك المشحون فی أحوال محمد بن طولون" میں اور شعرانی نے اپنی کتاب "لطائف المنن" میں کسی حد تک اپنی داستانِ زندگی بیان کرنے کی کوشش کی۔ ان سب کے بعد ہمیں سترھویں اور اٹھارہویں صدی عیسوی میں درمیان کوئی قابلِ ذکر خود نوشت نہیں ملتی۔ پورے عالمِ اسلام پر فکری جمود طاری تھا۔ اس کے براہِ راست اثرات ادب اور اس کے فنون پر مرتب ہوئے تھے۔ اس پورے مرحلے میں زیادہ سے زیادہ علماء نے اپنی علمی زندگی سے متعلق بعض خفیف اشارے ملتے ہیں۔ یہ اشارے مؤلفین ان کی کتابوں کے مقدمے میں یا دوسرے سیرت نگاروں کے ذریعہ منقول شخصی اقوال کی شکل میں سامنے آئے۔ ان میں کتابوں، اساتذہ، علمی اسفار اور علمی آثار سے متعلق بعض باتیں ہوتی تھیں۔ عبدالرحمن جبرتی کی کتاب "عجائب الآثار فی التراجم والأخبار" میں ایسے بہت سے اقوال منقول ہیں جن سے متعلقہ افراد کی ذاتی علمی زندگی کے پہلے گوشے نمایاں ہوتے ہیں۔ یہ کتاب اٹھارہویں صدی کے بارہ اور ذی علم لوگوں کے حالات پر مشتمل ہے[1]۔

انیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی مصر اور عالمِ عرب میں نشاۃ ثانیہ کا آغاز ہوا۔ جمود اور تعطل اور زوال و ادبار کا خاتمہ ہوا۔ اور لوگوں میں اپنے مستقبل کی بہترین تعمیر کی فکر پیدا ہوئی۔ اس کا ایک بڑا سبب مغربی تہذیب و تمدن اور علوم و فنون سے مغربیوں کی براہِ راست واقفیت تھی[2]۔ ۱۷۹۸ء میں مصر پر نپولین کے حملہ کے بعد اس واقفیت اور آشنائی کے مواقع دن بدن بڑھتے گئے۔ اس کی شکلیں

---

[1] شوقی ضیف ـــــ الترجمة الشخصية ص ۱۰۳-۱۰۴

[2] عبدالکریم الاشتر ـــــ النثر المهجری دار صادر بیروت ۱۹۹۰ء

کتابوں کی آمد و رفت سے لیکر افراد کی آمد و رفت وغیرہ پر محیط تھیں۔ الغرض علمی تبادلے اور استفادے کے نتیجہ میں مصر اور دوسرے عرب ممالک میں بہت سے افراد اور تحریکیں اصلاح کا علم لے کر میدان میں آگئیں[1]۔ ان میں رفاعہ طہطاوی، احمد فارس الشرتاق، جمال الدین افغانی اور شیخ محمد عبدہ کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ان لوگوں نے قوم کو سیاسیات، معاشیات اور معاشرت کے نئے اصولوں سے روشناس کیا اور اسے تعلیم، آزادی، جمہوریت، تمدن اور تشخص کے معانی و مفاہیم اور قدر و قیمت سے آگاہ کیا۔ ان کی کوششوں اور سعی و جہد کی وجہ سے عربی قوم کا تشخص اور انفرادیت کی بقا اور تحفظ کا سامان پیدا ہوا۔ کیونکہ مغربی تمدن کی مسلسل یلغار کی وجہ سے عربی زبان کے قدیم فکری و روحانی سرمایے کا وجود خطرے میں پڑ گیا تھا۔ اس خطرے کا ازالہ کرنا بیحد ضروری تھا۔ اصلاح و بیداری کے مذکورہ علمبردار ان فی الواقع اس ضرورت کی تکمیل کیلئے بنیادی گارہ مٹی اور اینٹ پتھر تیار کر رہے تھے[2]۔ چنانچہ رفاعہ طہطاوی (۱۸۰۰ - ۱۸۷۳) پہلے مصری تھے جنہوں نے قوم کو اس کے فکری و ثقافتی جمود اور سیاسی و معاشرتی زوال پر بیدار کیا۔ انھوں نے فرانس سے واپسی کے بعد اپنی کتاب "تخلیص الابریز" کے ذریعہ قوم کو جدید تہذیب کے مظاہر سے متعارف کیا اور ایک نئی فکری تحریک کی بنیاد ڈالی جو مروج فکری اور معاشرتی مفاہیم میں رد و بدل کی علمبردار تھی۔ ان کی کتاب اور بعد کی دوسری کوششوں کے مثبت نتائج برآمد ہوئے۔ خاص طور سے تعلیم اور سیاست کے میدان میں ان سے خاص طور سے فائدہ اٹھایا گیا۔ انیسویں صدی عیسوی کے اندر جو اہم واقعات اور تغیرات رونما ہوئے ان کے پیچھے ان کی شخصیت کے اثرات تھے۔ ان کے ساتھ ساتھ جمال الدین افغانی کی بھی تحریک اپنے شباب پر تھی۔ اس کا مقصد جدید مغربی تہذیب کے اصولوں و مبادی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے قوم کے اندر اسلام اور عربیت کی روح پھونکنا تھا۔ احمد فارس شدیاقی بھی جمال الدین افغانی کے ساتھ تھے۔ شیخ محمد عبدہ ایک دوسری تحریک کے علمبردار تھے۔ اس تحریک کے اثرات بھی بعد میں بہت گہرے ثابت ہوئے اس کا بنیادی محور یہ فکر تھی کہ

---

[1] انیس المقدسی ـ الاتجاہات الادبیۃ ص ۳۸۰-۳۶۷ دار العلم للملائین بیروت ۱۹۸۸ء

[2] " " ص ۱۰۶-۱۰۲

تربیت کے ذریعہ ہی دینی، سیاسی اور معاشرتی اصلاح ممکن ہو سکتی ہے۔

ان مختلف کوششوں اور تحریکوں کے نتیجے میں بہت سے نئے نئے مسائل پیدا ہوئے۔ یہ اُس وقت سے لیکر آج تک تعلیم یافتہ طبقے میں زیر بحث رہے ہیں۔ یہ مسائل سیاسی، معاشرتی، ادبی اور فکری نوعیت کے تھے۔ معاشرتی مسائل میں خاص طور سے عورت کا مسئلہ زیر بحث آیا[1]۔ رفاعہ طہطاوی نے اپنی کتاب میں فرانسیسی عورت کے اخلاق و عادات پر گفتگو کے بعد مصری عورت کے بارے میں اپنی رائے ظاہر کی ہے اسیطرح شدیاق نے بھی اپنی کتاب "الساق علی الساق" میں مشرقی اور مغربی عورت کے بارے میں اپنے خیالات پیش کیا ہے ان کے نزدیک عورت کی تعلیم اور اسے اس کے معاشرتی حقوق سے بہرہ ور کرنا زیادہ ضروری ہے اس سے معلوم ہوا کہ قاسم امین سے پہلے ہی عورت کا مسئلہ زیر بحث آ چکا تھا۔ عورت کے علاوہ علم اور دینی ترجمہ اور اقتباس اور اسلوب اور ادب سے متعلق مسائل بھی کافی زور و شور سے علمی حلقوں میں بحث و تحقیق کا موضوع بنے ہوئے تھے۔

انیسویں صدی عیسوی میں جو خود نوشت سوانح حیات مرتب کی گئیں ان سب میں مذکورہ فکری اور اصلاحی مسائل اٹھائے گئے ہیں اور مصری معاشرے کے جمود و تعطل کو پیش کر کے اس سے نکلنے اور مغربی تہذیب سے استفادہ کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ رفاعہ طہطاوی کی "تخلیص الابریز" اور علی مبارک کی "علم الدین" اسی نوعیت کی کتابیں ہیں۔ انھیں خود نوشت کے فنی مفہوم میں نہیں بلکہ وسیع و عریض معنی میں سوانح عمری کہا جا سکتا ہے۔ اسی طرح شیخ محمد عبدہ کی خود نوشت میں بھی دینی اور لغوی اصطلاح کی طرف دعوت دی گئی ہے۔ احمد فارس شدیاق نے بھی اپنی کتابوں میں مصر اور مغربی دنیا کی معاشرتی زندگی پر نظر ڈالی ہے اور بہت سے مسائل پر اپنی برہمی اور غصے کا اظہار کرتے ہوئے شدید تنقید کی ہے۔

اس زمانے کی خود نوشت سوانح، جو فی الواقع اپنے موضوع کی ابتدائی کوششیں ہیں

---

[1] انیس المقدسی ــــ الاتجاہات ص ۲۵۲ دار العلم للملایین بیروت ۱۹۸۸ء

[2]

مغربی اور عربی تمدن و ثقافت کے درمیان تصادم کی صحیح طور سے عکاسی کرتی ہیں اور یہ بتاتی ہیں کہ عرب اس وقت اپنی شخصیت کی تعمیر و تشکیل اور اسکے بنیادی عناصر کی تلاش و جستجو میں کس حد تک مصروف تھے۔ عربی زبان میں جدید خود نوشت سوانح نگاری کا فن ابھی پورے طور پر ارتقا پذیر نہیں ہو سکا تھا اس لئے یہ خود نوشت سوانح فن کے تمام تقاضوں کی تکمیل سے قاصر ہیں لیکن بہرحال صحیح سمت میں مناسب قدم سے تعبیر کئے جانے کے قابل ہیں۔ فی الواقع بعد کی نسلوں کے لئے انھوں نے ایک مستحکم بنیاد فراہم کر دی۔ یہاں اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا بھی ضروری ہے کہ باوجود اس کے کہ ان خود نوشت سوانح عمریوں کے مؤلفین مغربی تہذیب اور مغربی ادب سے واقف تھے لیکن انھوں نے اپنی سوانح نگاری میں اس کا بہت کم اثر قبول کیا۔ ان سب لوگوں نے اپنا تعلق عربی ادب قدیم ورثے سے جوڑے رکھا اور اپنی تصنیفات میں قدیم اور موروثی طرز نگارش اختیار کرنے کو پسند کیا۔ چنانچہ سابقین کی طرح یہ لوگ بھی اپنے علمی و فکری ارتقاء کا پس منظر، بچپن سے لیکر خود نوشت کی تالیف کے وقت تک کے حالات کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ اگر کبھی خاندان اور دوسرے امور کا تذکرہ نہ بھی ہو تو بہ فی الجملہ قدیم عرب علماء کے طرز نگارش سے مختلف نہیں ہوتی۔ اسکی مثال ہمارے سامنے شیخ محمد عباد طنطاوی (۱۸۱۰ — ۱۸۶۱ء) علی مبارک (۱۸۲۳ — ۱۸۹۲ء) اور شیخ محمد عبدہ (۱۸۴۹ — ۱۹۰۵ء) کی خود نوشت سوانح حیات ہیں۔ ان لوگوں نے خالص قدیم اور موروثی طرز نگارش اختیار کیا۔ بقیہ ان کے علاوہ احمد فارس شدیاق نے اپنی کتاب "الساق علی الساق" میں، رفاعہ طہطاوی نے اپنی کتاب "تخلیص الابریز" میں اور علی مبارک نے اپنی کتاب "علم الدین" میں مغربی ادب اور مغربی تعلیم و ثقافت سے معمولی حد تک اخذ و استفادہ کیا لیکن اس کے باوجود انھوں نے موروثی عربی اسلوب جو مقامہ کے اسلوب سے بڑی حد تک متاثر تھا۔ اپنائے رکھا اور اسے نظر انداز کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ گویا اس طرح انھوں نے

عیسوی میں اسلوب کے اعتبار سے عربی خود نوشت نگار دو حصوں میں تقسیم تھے - ایک قدیم اسلوب کے حامل تھے اور دوسرے قدیم کسیاتھ تھوڑی مقدار میں جدید پیتے بھی لئے ہوئے تھے - اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا اہم تاریخ ساز شخصیتوں، ان کی مختصر خدمات اور ان کی خود نوشت سوانح عمریوں کا مختصر سا تعارف پیش کر دیا جائے -

(۱) شیخ محمد عباد الطنطاوی (۱۸۱۰ - ۱۸۶۱ء) :- شیخ طنطاوی کی وفات اور تدفین روس میں ہوئی - وہ وہاں پٹرس برگ یونیورسٹی میں استاذ تھے - انھوں نے اپنے احوال اپنے قلم سے لکھ کر مشہور مستشرق "فرین" کے اس وقت حوالہ کیا تھا جب وہ مصر سے روس منتقل ہوئے تھے - یہ تحریر کراتشکوفسکی کی تصنیف "حیاۃ شیخ محمد عباد الطنطاوی" میں شامل ہے - اسمیں انھوں نے اپنی خاندان، آباء و اجداد، تعلیم کی ابتداء، تعلیم کے مختلف مراحل، جامعہ ازہر کا زمانہ طالبعلمی، دوران تعلیم پڑھی گئیں اہم کتابیں، جامعہ ازہر کے مختلف اساتذہ، تعلیم سے فراغت کے بعد مصر میں متعدد مصروفیات، دیگر اساتذہ اور رفقاء وغیرہ کا مختصر لیکن جامع تذکرہ کیا ہے[1] - اس خود نوشت سوانح حیات سے سب سے اہم بات ہمیں یہ معلوم ہوتی ہے کہ مصر کے مختلف مدرسوں کا تجزیہ اور جامعہ ازہر میں انیسویں صدی عیسوی کے نصف اول میں تعلیم و تدریس کا نصاب اور طریقہ کار کیا تھا؟ مثلاً ان کا یہ بیان کہ "انھوں نے جامعہ ازہر میں مقامات حریری اور معلقات کی شرح زوزنی پڑھی تھی اور ان سے پہلے انھیں کسی نے نہیں پڑھایا تھا" - اس سے ایک نئی حقیقت سامنے آتی ہے - ہمیں کبھی یہ معلوم نہ تھا کہ ازہر میں ادب اور نثر کی کتابیں پہلے سے پڑھائی جاتی تھی لیکن جدید عربی ادب کے بعض مؤرخین لکھتے ہیں کہ شیخ محمد عبدہ کے اہتمام سے ازہر میں مقامات بدیع الزماں، نہج البلاغہ اور بلاغت کی بعض دوسری کتابیں داخل نصاب کی گئیں[2] - شیخ طنطاوی کا مذکورہ بیان جدید مؤرخوں کے خیالات کی تردید کرتا ہے -

۱۸۴۰ء میں شیخ طنطاوی روس چلے گئے - وہاں اپنی علمی خدمات کی بنا پر یہ

---

[1] کراتشکوفسکی ـــــ حیاۃ الشیخ محمد عباد الطنطاوی، ترجمہ کلثوم عودۃ قاہرہ ۱۹۶۲ء ص ۱۱۱-۱۱۳

[2] " " ص ۱۱۲

یہ حلقۂ مستشرقین میں کافی مقبول ہوئے۔ انھوں نے اپنی کوششوں سے طلبہ میں عربی ادب کا ذوق پیدا کیا
ان کے اس کارنامے کا اثر روس ہی نہیں پورے یورپ پر پڑا۔ کیونکہ اس سے پہلے مستشرقین عربی ادب سے
واقفیت کے بغیر اسلام اور مسلمانوں کا مطالعہ کرتے تھے جس کی وجہ سے بہت سی جگہوں پر غلطیوں کا ارتکاب
کر بیٹھتے تھے۔ شیخ کے اثرات کی وجہ سے عربی مآخذ سے براہ راست استفادہ کرنے کا رجحان مستشرقین
میں عام اور مقبول ہوا۔ روس کا سفر کرنے سے پہلے مصر ہی میں ان کے تعلقات بعض یورپین سے بہت
گہرے ہو گئے تھے۔ ان میں سے بھی کچھ نے ان سے استفادہ کیا تھا۔[1]

۲۔ شیخ محمد عبدہٗ (۱۸۴۹ - ۱۹۰۵ء) ۱۔ شیخ محمد عبدہٗ نے اپنی زندگی کے آغاز
اور علمی نشو و نما پر دیگر علماء کی طرح روشنی ڈالی ہے لیکن یہ ان کی زندگی کی مکمل سوانح نہیں ہے۔ اسمیں زندگی
کے ابتدائی مراحل کا قدرے تفصیل سے تذکرہ کیا گیا ہے۔[2] شیخ نے شروع ہی میں اپنی کتاب کی تالیف کا
سبب اور محرک بیان کر دیا ہے۔ ایک طرف ان کے بعض مغربی ساتھیوں کا اصرار تھا۔ یہ مغربی رفقاء
شیخ کے تجربات و مشاہدات کا مطالعہ کرنا چاہتے تھے اور یہ خواہش رکھتے تھے کہ یہ تجربات ان کی زبان
میں منتقل کر دیئے جائیں۔ دوسری طرف ان کے شاگرد رشید رضا کی شدید خواہش تھی کہ شیخ اگر موجودہ نسل
کے لئے نہیں تو آئندہ نسل کیلئے کچھ احوال زیست قلمبند کر دیں۔[3]

اس کتاب میں شیخ محمد عبدہٗ نے اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ مصر کے ایک
اوسط درجے کے گھرانے میں پیدائش اور پرورش کے باوجود انھوں نے اپنی تلاش و جستجو اور علم و معرفت
کی بنیاد پر دو عظیم ترین کارنامے انجام دیئے ہیں ۱۔ اندھی تقلید سے نکل کر اسلاف کے طرز پر آزادانہ
فکر و نظر کی دعوت ۲۔ عربی زبان کو سجع اور مقفیٰ بنانے کے بجائے آسان اور عام فہم بنانے کی کوشش۔
کیونکہ حکومت کے شعبوں اور اخبارات میں ناقابل فہم کلمات کا استعمال ہوتا تھا اور ازہر کے فارغین اور ادباء ایسے

---

[1] کراتشکوفسکی ـــ حیاۃ الشیخ محمد عیاد الطنطاوی ص ۱۱۲

[2] سید رشید رضا ـــ تاریخ الاستاذ الامام، قاہرہ مطبعۃ المنار ۱۹۳۱ء ص ۹ / ۳۸، ۱۰۲ - ۱۰۵ [3] ایضاً ص ۹-۱۰

سچے اسالیب اختیار کرتے تھے جو معنی کی ادائیگی سے قاصر تھے[1]۔ اس کے علاوہ شیخ نے مصریوں کو ان کے حقوق سے روشناس کرنے اور اس مقصد میں حاصل شدہ کامیابیوں یا ناکامیوں کا مکمل تعارف پیش کرنے کی کوشش کی ہے انھوں نے اپنی بیشتر صفات اور خوبیوں کا مرجع اپنے والدین کو قرار دیا ہے۔ چنانچہ ان کے بیان کے مطابق انھوں نے اپنے والد سے کم گوئی، وقار، سنجیدگی اور شرافت، اسیطرح والدہ سے رحم و مروت جیسی اخلاقی خوبیاں بطور وراثت پائی ہیں[2]۔ اپنے حسب و نسب اور معاشرے کے بارے میں ضروری معلومات فراہم کرنے کے بعد انھوں نے اپنے تعلیمی مراحل تفصیل سے بیان کئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ انھیں شروع میں تعلیم سے بہت زیادہ دلچسپی نہیں تھی، وہ اس سے بھاگتے تھے۔ لیکن یکایک ان کی ملاقات ان کے ایک صوفی مزاج رشتہ دار سے ہوگئی تھی، اس بزرگ نے انتہائی دانائی اور حکمت سے ان کے اندر علم کا شوق پیدا کر دیا اور ساتھ ہی حصول علم کے راستوں کیطرف رہنمائی کی جس کا بنیادی نقطہ یہ تھا کہ لہو و لعب سے کنارہ کشی اختیار کی جائے اور علم کی کلید یعنی قرآن مجید سے تعلق مضبوط کیا جائے چنانچہ انھوں نے اس پر عمل کیا اس کا بیحد اثر ہوا اور فائدہ ہوا انھوں نے مختلف مکاتب اور جامعہ ازہر کے اساتذہ کے علاوہ دوسرے اساتذہ اور ماہرین علم و فن سے بھی استفادہ کیا فن میں شیخ جمال الدین افغانیؒ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ خود مذکورہ صوفی بزرگ سے بھی استفادہ برابر جاری رہا[3]۔ اسطرح انھوں نے فلسفہ، کلام اور ریاضی (یہ علوم جامعہ ازہر میں ممنوع تھے) کی تحصیل شیخ جمال الدین افغانیؒ سے کی اور اخلاق، نفسیات، معاشرت، تاریخ، فلسفہ اور تربیت کے بہت سے علوم مغربی علماء یہ کی تحریروں سے استفادہ کرکے حاصل کیا تھا۔ اس کیلئے فرانسیسی زبان بھی استفادے کی حد تک سیکھ لی۔ دور حاضر کی علمی ضروریات کے پیش نظر وہ مسلم علماء اور مصلحین کے لئے یورپ کی کسی زبان میں مہارت حاصل کرنا ضروری قرار دیتے تھے۔ حصول علم کے بعد انھیں جامعہ ازہر میں وہاں کے شیوخ کی مخالفت کے باوجود درس و تدریس کیلئے منتخب کر لیا گیا[4]۔

---

[1] سید رشید رضا — تاریخ الاستاذ الامام ص ۱۲-۱۱ [2] ایضاً ص ۱۴-۱۳

[3] ایضاً ج ۱ ص ۲۳-۱۶ [4] ایضاً ص ۲۰۵-۲۰۱

ان کی خودنوشت کے مطالعہ سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ دورِ حاضر کے ایک عظیم مفکر کو علم و معرفت کی راہ میں کس قدر مشقت برداشت کرنی پڑی اور ایک مستحکم فکر، رائے اور نظریہ قائم کرنے نیز اپنے لوگوں کے سامنے پیش کرنے میں کن کن مراحل سے گذرنا پڑا۔ اس خودنوشت میں مصنف کا ادبی اسلوب بالکل نمایاں ہے۔ وہ مرسل اسلوب کے زبردست داعی تھے۔ ان کی خودنوشت قدیم عرب علماء کی خودنوشتوں سے اس طور سے ملتی جلتی ہے کہ اسمیں پیدائش اور نشو و نما وغیرہ کا تذکرہ بالکل ان ہی کے انداز میں کیا گیا ہے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ ان کے یہاں واقعات کا تذکرہ اور تاریخی حقائق کا بیان بالکل اس انداز میں ہوتا ہے کہ اسمیں ادبی اسلوب کا وجود یکسر مفقود ہوتا ہے، اسطرح گویا وہ قدیم علماء سے مطابقت کے باوجود اپنی ایک علاحدہ اور امتیازی شناخت قائم رکھنے میں کامیاب رہے۔

۳۔ رفاعہ طہطاوی (۱۸۰۱ ـ ۱۸۷۳ء): ـ یہ ازہر کے تعلیم یافتہ اور طہطا کے باشندہ تھے۔ محمد علی کی توجہ اور خواہش سے خود خود بیرونِ مصر مختلف مقاصد کے تحت بھیجے جاتے تھے ان ہی میں سے ایک وفد کے مذہبی امور کے انچارج بنا کر انہیں فرانس بھیجا گیا تھا[1]۔ وہاں سے واپس ہونے کے بعد انھوں نے اپنے تجربات و مشاہدات اور افکار و خیالات کا خلاصہ تحریر کیا اور اسے "تخلیص الابریز فی تلخیص الباریز"[2] نامی کتاب کی شکل میں پیش کیا۔ بلاشبہ فرانسیسی تہذیب و تمدن اور اس کے علمی مظاہر دیکھ کر وہ بیحد متاثر ہوئے تھے اور اسی وجہ سے ان کی خواہش تھی کہ اس تہذیب کی کچھ جھلکیاں پیش کر کے وہ اپنے ہم وطنوں کو اسکی اتباع اور تقلید کی دعوت دیں۔ اس اعتبار سے یہ ایک مفید اور بامقصد کتاب قرار پائی ہے[3]۔

ان کی کتاب میں مقدمہ اور چار ابواب کے علاوہ کچھ تنقیدی مقالات بھی ہیں۔ مجموعی طور سے یہ کتاب فرانسیسی زندگی کے بارے میں دلچسپ معلومات فراہم کرتی ہے۔ اسمیں مصریوں کے

---

[1] جمال الدین الشیال ـ التاریخ والمؤرخون فی مصر لجنۃ التألیف القاہرۃ ۱۹۵۸ ص ۵۹-۵۴

[2] القاہرۃ ـ وزارۃ الثقافۃ والارشاد سنہ ۱۹۵۸ء [3] ایضاً ص ۵۷-۵۶

عقلی و فکری منہج اور اس کے ارتقائی مراحل کی داستان بھی آ گئی ہے۔ اسمیں کوئی شبہ نہیں کہ رفاعہ طہطاوی اس فکری ارتقاء کے ایک اہم ستون تھے۔ انھوں نے اپنی کتاب میں اپنی شخصیت، حسب و نسب، خاندان اور شہر کے بارے میں ضروری معلومات فراہم کی ہے پھر فوج میں اپنی خدمات کا حوالہ دیتے ہوئے فرانس کے سفر کے محرکات اور اسباب کا تذکرہ کیا ہے۔ اس بات کو خاص طور سے پیش کیا ہے کہ سفر سے قبل ہی بعض قدر دانوں کی طرف سے خاص طور سے شیخ حسن عطار کی طرف سے روداد سفر لکھنے کا مطالبہ آ چکا تھا کیونکہ وہ اخبار عجائب کے بیحد شوقین تھے۔ لیکن اتفاق سے صرف سفر ہی نہیں بلکہ سفر کے نتائج اغراض و مقاصد اور فرانس کے علوم و فنون پر ایک جامع کتاب مرتب ہو گئی۔

اس کتاب میں ذاتی احساسات، تاثرات اور خواطر کا تذکرہ بیحد مختصر ہے البتہ سفر کے واقعات و مشاہدات اور فرانسیسی عادات و اطوار وغیرہ پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان میں زمانی ترتیب کا خیال بھی کم رکھا گیا ہے۔ اس کے فکری پہلو، ادبی پہلو پر غالب آ گئے ہیں۔ اسکی وجہ سے یہ ایک خشک کتاب ہو گئی ہے۔ مغربی زندگی سے متعلق کسی مشرقی آدمی کی یہ پہلی تاثراتی کاوش ہے اسمیں مغربی زندگی کی اہم خوبیاں مثلاً علم، فکر، دستور، سیاست، اجتماع، جمہوریت اور آزادئ نسواں وغیرہ، ابھر کر سامنے آ گئی ہیں۔ کتاب میں اس ضرورت کا احساس بھی دلایا گیا ہے کہ مشرق میں یہ خوبیاں اپنے حقیقی مفہوم میں اب تک ناپید ہیں۔

رفاعہ، علی مبارک اور شدیاق کو اپنے بیرونی اسفار کی تدوین کا موقعہ ملا، انھوں نے اپنے سفرناموں میں ذاتی امور پر گفتگو کے ساتھ ساتھ مغربی زندگی اور اس کے ادب کی تصویر بھی کھینچی ہے، کیونکہ یہ لوگ مغربی ادب اور ثقافت سے نہ صرف یہ کہ واقف تھے بلکہ اس سے مرعوب اور متاثر بھی تھے۔ لیکن مغربی تہذیب کی عکاسی اور ترجمانی کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ انھوں نے اپنے ماضی سے اپنا تعلق

بالکل منقطع کر لیا تھا۔ بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ تا وقتِ آخر ان کا طرزِ تحریر و تعبیر بڑی حد تک موروثی رہا۔ قدیم اسلوب میں جدید مضامین کی ادائیگی ایک مشکل امر ہے۔ اسکی وجہ سے ان لوگوں کو بھی کبھی پریشانیوں سے دوچار ہونا پڑا۔ خاص طور سے بعض نئے الفاظ اور مصطلحات کی ادائیگی میں۔ اس بناء پر ان کی کتابیں عربیت اور مغربیت کے مابین ایک سنگم کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان میں دونوں کے درمیان ٹال میل اور یگانگت پیدا کرنے کی بہترین کوششیں کی گئی ہیں۔ رفاعہ طہطاوی کے یہاں یہ وصف اور زیادہ نمایاں ہے۔

۲۔ احمد فارس الشدیاق (۱۸۰۴ - ۱۸۸۷ء)۔ لبنان کے ایک عیسائی خانوادے کا فرزند جو تعلیم و تعلم کے بعد حصولِ معاش اور مزید حصولِ علم کیلئے مصر گیا اور پھر مختلف مقاصد کے تحت عرب، افریقہ اور یورپ کے کئی ایک ممالک کا سفر کرنے کے بعد ٹیونس میں حلقہ بگوشِ اسلام ہو گیا انھوں نے اپنی کتاب "الساق علی الساق فیما ھو الفارياق"[1] میں اپنی زندگی اور اس کے اہم تجربات و واقعات پیش کئے ہیں۔ کتاب کا آغاز لبنان کے ایک گاؤں "عشقوت" میں پیدائش سے ہوتا ہے اور اختتام (۱۸۵۵ء) یعنی تا وقتِ تالیفِ کتاب ہذا تک کے حالات و واقعات پر ہوتا ہے۔ اسمیں مصنف کی شخصیت اپنے معاصر خود نوشت نگاروں علی مبارک اور رفاعہ طہطاوی کے بالمقابل زیادہ نمایاں اور واضح ہے۔ انھوں نے مالٹہ، انگلستان اور فرانس کی سفری داستانوں کو اس مقصد کیلئے پیش کیا کہ اپنے خیالات و افکار کی روشنی میں مغرب و مشرق کے رسوم و عادات پر یکساں طور سے تنقید کر سکیں[2]۔

باوجود اس کے کہ شدیاق کو فصیح عربی زبان پر عبور حاصل تھا، اور وہ سجع و قوافی اور محسنات لفظی سے بہت دور رہتے تھے لیکن اس کتاب میں اپنی زبان دانی کے زعم میں

---

[1] ط۔ پاریس ۱۸۵۵ء [2] ایضاً ص ۶۰-۶

انھوں نے جابجا مترادف الفاظ اور استطرادات کا استعمال کیا ہے جس سے ان کی کتاب میں وہ شیرینی انسانوی انداز تحریر مفقود ہو گیا جو ان کا طرۂ امتیاز تھا۔ اس طرح اگرچہ شدیاق جدید ادب اور نثر نگاری کو نیا رخ دینے والوں میں پیش پیش تھے لیکن یہاں مقامہ کے اسلوب اور مزاج سے اپنے آپ کو الگ نہیں کر سکے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ انھوں نے خالص تقلیدی راہ اختیار کر لی تھی، دراصل انھوں نے مقامہ میں بھی ایک طرح کا لطف و مزاح پیدا کر دیا تھا چنانچہ ایک مقام پر جہاں وہ اپنی بیوی سے کسی بات چیت کا حوالہ دینا چاہتے ہیں وہاں تخیلات اور غیر معلومات کے سہارے عورت کے بارے میں اپنے تمام خیالات نہایت مضحکہ خیز انداز میں پیش کر جاتے ہیں بلکہ اس سے بڑھ کر وہ حد سے زیادہ غیر سنجیدگی اور عریانیت پر اتر آتے ہیں[1]۔

شدیاق نے علی مبارک اور رفاعہ کی طرح مغربی اور مشرقی زندگیوں کی تصویر پیش کی ہے لیکن مقصد اور شخصیت کی وجہ سے ان کی تصویریں باہم دگر مختلف ہیں۔ جہاں تک رفاعہ کا معاملہ ہے تو "تخلیص الابریز" میں اپنی عقل اور فکر کا استعمال کرتے ہوئے انھوں نے فکری، سیاسی اور معاشرتی مسائل سے تعرض کیا ہے اور مختلف انسانی مشکلات کے تعلق سے مغربی علماء و مفکرین کے اقوال کو بحث و تجزیہ اور تحلیل و تبصرہ کے انداز میں پیش کیا ہے۔ اس پوری بحث میں ان کی ذات تقریباً پوشیدہ ہے اس لئے کہ وہ اپنے شخصی تاثرات کے بالمقابل مشاہدات، اور معلومات وغیرہ پر زیادہ توجہ دیتے تھے اس کے علی الرغم شدیاق اپنی ذات، خیالات اور افکار میں گم رہتے ہیں۔ اس لئے انھوں نے تقریباً ہر مشاہدے، رائے اور فکر میں اپنی پر مزاح اور مضحکہ آمیز شخصیت کو اس طرح شامل کر دیا ہے کہ قاری اسے پڑھ کر بے اختیار ہنس پڑتا ہے۔ کہیں کہیں غیر سنجیدگی اور عبث گوئی کا مظاہرہ کچھ زیادہ ہی ہو گیا ہے۔ اپنے وطن اور اپنے سفر کے تذکرے کے دوران عیسائی شخصیات اور مذہبی شعائر

---

[1] احمد فارس الشدیاق ــــ الساق علی الساق، طہ ــ پاریس ۱۸۵۵ء ص ۲۵۱-۲۵۶

کے بارے میں ان کا انداز بیان تقریباً ناپسندیدہ ہے۔

شدیاق کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ وہ اپنے تجربات کے اظہار پر زیادہ توجہ دیتے ہیں گویا مشاہدات و ملاحظات میں اپنے تجربات کی آمیزش کر دیتے ہیں۔ رفاعہ طہطاوی کے برعکس وہ جگہ جگہ مختلف مسائل کے تحت اپنی ذاتی رایوں کو داخل کر دیتے ہیں۔ خاص طور سے انھوں نے عورت کے بارے میں بڑے طویل، مفصل اور غیر سنجیدہ مباحث چھیڑے ہیں۔ وہ ان مباحث کیلئے موقعے و محل کی مناسبت وغیرہ کا سرے سے خیال نہیں رکھتے۔ بس عورت کا لفظ آجانا ان کے لئے کافی ہوتا ہے۔ ایک موقعے پر انھوں نے مصری عورت کی شب زفاف کی جو تصویر کشی وہ حد سے زیادہ شرمناک ہے۔

مترادفات کی کثرت اور عورت کے سراپے کی تصویر کشی میں مبالغہ آرائی پر تعجب اور حیرت میں اس وقت نمایاں طور سے کمی ہو جاتی ہے جب شدیاق کی یہ وضاحت سامنے آجائے کہ اس کتاب کا مقصد زبان کے عجائبات کو پیش کرنا اور عورت کی خامیوں اور خوبیوں کو نمایاں کرنا ہے، پہلے مقصد کیلئے انھوں نے زبان کے مترادفات کا استعمال کیا اور ان کے معانی و مفاہیم کی وضاحت کی[1] اور دوسرے مقصد کے لئے عورت کی دیگر خوبیوں کے ساتھ اس کے حسن و جمال اور جذبات و احساسات کی تصویر کشی کی[2]، اس طرح یہ کتاب "تعلیم لغت" کا ایک عظیم مقصد بھی لئے ہوئے ہے، مقصد خواہ کتنا ہی بلند ہو لیکن اس کے حصول کے لئے غلط طریقے اختیار کرنا مناسب نہیں ہے، غیر سنجیدگی اور مزاح سے احتراز کیا جا سکتا تھا، لیکن یہ ان کی فطرت کا ایک لازمی حصہ تھا جو باحیات ان سے وابستہ رہا۔

غیر سنجیدہ اور مزاحیہ منظر پر ہم جس قدر چاہیں اظہار نفرت کریں لیکن اس سے کتاب کی ادبی اور لغوی حیثیت مجروح نہیں ہوتی ہے۔ شدیاق بہرحال جدید مصر کے معمار تھے، اور ادب و لغت کی اعلیٰ

---

[1] احمد فارس الشدیاق ـــــ الساق علی الساق ص ۱ [2] ایضاً ص ۱۶

و ترقی میں نمایاں خدمت انجام دی ہے۔ یہ ان کی اور ان کے بعض معاصروں کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ بیسویں صدی میں عربی ادب اپنی پوری شان کے ساتھ ترقی یافتہ زبانوں کے بالمقابل کھڑا ہو سکا اور دورِ جدید کی علمی ضرورت کو انتہائی خوش اسلوبی اور فراخ دلی سے پورا کیا۔

بہرحال! وہ کتاب الساق علی الساق فیما ھو الفاریاق، عصرِ حاضر کی سب سے پہلی باضابطہ خود نوشت سوانح حیات تصور کی جاتی ہے۔ ہر مؤلف کے ہر مرحلۂ زندگی کی سچی اور اصلی تصویر پیش کرتی ہے[1]۔

۵۔ علی مبارک (۱۸۲۳ — ۱۸۹۳ء): علی مبارک کا تعلق مصر کے شمال مشرق میں واقع ایک گاؤں دمرباط الجدیدہ سے تھا۔ ان کا خاندان گاؤں کے مذہبی امور کی انجام دہی پر مامور تھا۔ مختلف اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنے امتیازی تجربات کی بنیاد پر انھیں فرانس جانے والے طلبہ کے ساتھ اعلیٰ تعلیم کے حصول کیلئے ۱۸۴۴ء میں فرانس بھیج دیا گیا۔ فرانسیسی زبان نہ جاننے کی وجہ سے انھیں ابتداء میں خاصی زحمتیں اٹھانی پڑی۔ لیکن اپنی انتھک محنت اور لگن کی وجہ سے انھوں نے اس مشکل پر قابو پالیا۔ چودہ سال فرانس میں گزارنے کے بعد جب وہ مصر لوٹے تو اپنی تمام تر صلاحیتوں [redacted] اصلاح و بہبود کیلئے وقف کر دیا۔ تعلیم کے میدان میں ان کی خدمات خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ انھوں نے مغربی اور مشرقی معاشرت، دونوں کے امتیازی گوشے، دونوں کے بارے میں اپنے مخصوص خیالات اور دونوں کی روشنی میں قوم کی ترقی کے امکانات اور ذرائع پر کم از کم دو کتابیں تصنیف کی۔ ۱۔ الخطط التوفیقیۃ ۲۔ علم الدین، پہلی کتاب مفصل، باضابطہ اور بامقصد خود نوشت سمجھی جاتی ہے جبکہ دوسری کتاب مکالمے اور گفتگو کے انداز میں فکر کے ایک خاص پہلو کو اجاگر کرتی ہے اسمیں مذکور دونوں کردار فرضی اور تخیلاتی ہیں لیکن باتیں مفید، کارآمد اور بدلتے ہوئے حالات سے ہم آہنگ ہیں۔ پہلی کتاب قدماء کے طرزِ نگارش سے زیادہ قریب

---

[1] احمد فارس الشدیاق — آثارہ اللغویۃ، محمد احمد خلف اللہ ص ۹

ہے اور دوسری کتاب کسی حد تک جدید اسلوب اور مزاج کی نمائندگی کرتی ہے۔ گویا پہلی کی حیثیت شیخ محمد عبدہٗ اور شیخ محمد عباد طنطاوی کی تحریروں جیسی ہے جبکہ دوسری رفاعہ طہطاوی اور احمد فارس شدیاق کے اسلوب نگارش سے قریب تر ہے[1]۔

۱۔ الخطط التوفیقیہ :۔ علی مبارک نے یہ کتاب اپنی وفات سے چار سال پیشتر ۱۸۸۹ء میں مکمل کر لی تھی۔ یہ ایک مفصل خود نوشت سوانح حیات ہے[2]۔ اسمیں انھوں نے اپنی پیدائش والدین، گاؤں، خاندان، مکتب کی ابتدائی، ثانوی تعلیم، اس زمانے کے مکاتب کا حال، تعلیم کے لئے فرانس کا سفر، واپسی اور اس کے بعد مصر میں اپنی مصروفیات کا خاصے مفصل انداز میں ذکر کیا ہے[3]۔ انھوں نے خود نوشت نگاری کے اصول کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہر جگہ صداقت اور صاف گوئی سے کام لیا ہے۔ اپنے کمزوریوں کے اعتراف میں انھیں کوئی جھجک نہیں ہوتی۔ مثلاً تعلیمی مراحل کے بارے میں ان کا یہ اعتراف بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ وہ ہمیشہ کمزور اور پھسڈی طالب علم رہے[4]۔ حالانکہ بڑے لوگ بالعموم بچپن ہی سے اپنی علمی استعداد اور مہارت کا سکہ بٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسمیں زیادہ تر فخر و مباہات کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے بلکہ کہیں کہیں بات فخر و غرور اور استعلاء تک پہنچ جاتی ہے۔ انھوں نے فرانس سے واپسی کے بعد اپنے گھر لوٹنے اور فرانسیسی فوجی لباس میں ہونے کی وجہ سے والدہ کے نہ پہچاننے کا ذکر بڑے دلچسپ انداز میں کیا ہے[5]۔ انھوں نے مصر واپس لوٹ کر اپنی ادا کردہ مختلف ذمہ داریوں خاص طور سے اپنی تعلیمی کوششوں کا تفصیل سے تذکرہ کیا۔ چنانچہ یہ کتاب جدید مصر میں تعلیم کے تاریخی ارتقا کی ایک مکمل دستاویز بن گئی ہے۔ تعلیم کے میدان میں نمایاں خدمات انجام دینے کی وجہ سے انھیں "ابو التعلیم فی مصر" کا لقب دیا گیا۔ تعلیم کے سلسلے میں ان کی نمایاں خدمات میں فوجی اسکول کی تنظیم نو، حساب، ریاضی اور انجینئرنگ کے پیچیدہ مسائل پر غور و فکر اور خدیو اسماعیل کے عہد میں مصر کے تعلیمی نظام کی اصلاح و تربیت

---

[1] جمال الدین الشیال ـــــ التاریخ والمؤرخون فی مصر ص ۱۱۲-۹۹ [2] الخطط التوفیقیہ، القاہرۃ، المطبعۃ الامیریۃ ببولاق ۱۳۰۵ھ [3] ایضاً ص ۲-۳۸ [4] ایضاً ص ۴۱ [5] ایضاً ص ۴۳-۴۲

کی کوشش خاص طور سے قابلِ ذکر ہے۔ انھوں نے ادب اور لغت کی بہترین تعلیم کیلئے مدرسۂ دارالعلوم کی بنیاد ڈالی اور اپنے تعلیمی افکار سے عوام کو واقف کرانے کیلئے ایک مجلہ "روضۃ المدارس المصریۃ" کا اجراء کیا اور تعلیمی ضروریات کے تحت مناسب کتابوں کی اشاعت کیلئے "دارالکتب" کے نام ایک مطبعہ کی بنا بھی ڈالی۔ ان کوششوں کا تعلیمی بیداری پر بڑا مفید اثر مرتب ہوا۔ فی الواقع یہ کوششیں آئندہ کی ثقافتی ترقیوں کیلئے مضبوط بنیاد ثابت ہوئیں[1]۔

اس کتاب کا اسلوب مرسل ہے اسمیں سجع اور تکلف نہیں ہے، البتہ اکثر مقامات پر بے ربطی اور اضطراب پایا جاتا ہے جس کے باعث تحریر کی سلاست اور حلاوت متاثر ہوئی ہے۔ چونکہ اس کتاب میں ہند سے، تاریخ اور بعض دوسری تفصیلات کثرت سے موجود ہیں اس لئے یہ ادبی سے زیادہ تاریخی اہمیت کی حامل بن گئی ہے۔ اس کتاب کے ہر صفحہ کے مطالعہ سے علی مبارک کی خاکساری اور انکساری اعتراف میں اضافہ ہوتا ہے۔ بعض مقامات پر ان کا انداز پیشکش بیحد مؤثر اور جاذبِ نظر ہوگیا ہے مثلاً فرانس سے طویل وقفے کے بعد واپسی پر اپنی ماں کے جذبات کی جس خوبصورت انداز اور مناسب الفاظ سے تصویر کشی کی ہے۔ وہ سحر بیانی اور حقیقت نگاری کی جیتی جاگتی تصویر ہے[2]۔

علی مبارک نرم مزاج اور خاموش طبیعت کے مالک تھے۔ وہ معاملات کو شور وشغب اور بغاوت سے کچلنے کے بجائے احتیاط، نرمی اور حکمت سے حل کرنا چاہتے تھے، اسی وجہ سے وہ عرابی پاشا کے انقلاب کے مخالف تھے اور اسے حکومت خلاف بغاوت تصور کرتے تھے۔ جس کا حاصل ان کی نظر میں انتشار اور انارکی کے علاوہ کچھ نہیں۔

مرحوم علم الدین ۔ علی مبارک نے اپنی اس کتاب میں بدلتے حالات کا

---

[1] الخطط التوفیقیہ ـــــ ص ۵۱-۵۲ [2] ایضاً ص ۵۷-۵۸

اور تفصیل سے تذکرہ کیا ہے۔ انھوں نے مجرد بحر کے عجائبات اور غیر مانوس مخلوقات کی تصویر کشی کے لئے ایک مفروض مصری عالم اور ایک انگریز کے درمیان مکالمہ کرایا ہے۔ ان دونوں کی بحث و گفتگو اور سوال و جواب کے ذریعہ مشرق و مغرب کے احوال تقابلی انداز میں سامنے آگئے ہیں۔ گویا رفاعہ طہطاوی کی طرح علی مبارک بھی اپنے ہم وطنوں کو مغرب کے احوال اور مغربی تہذیب و تمدن کے مفید ثمرات سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں تاکہ مشرق و مغرب کے مابین فکری اور معاشرتی پہلوؤں پر اظہار خیال اور ایک دوسرے سے اخذ و استفادہ کی راہیں آسان ہوں[1]۔

کتاب میں علم الدین کو ایک ازہری شیخ کی شکل میں پیش کیا گیا ہے جنہیں ایک انگریز کیپٹن یورپ کی سیاحت کا موقع فراہم کیا گیا ہے۔ وہ مغرب کی ہر چیز دیکھ کر مبہوت ہو جاتے ہیں اور اس کی حقیقت جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ کبھی وہ اپنے انگریز دوست کی وضاحت سے مغربی طور و طریق پر اطمینان اور پسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں تو کبھی مشرقی اقدار کا مخالف قرار دیکر انھیں رد کر دیتے ہیں۔ اس طرح مصنف مشرق و مغرب کے رد و قبول کے پیمانے پیش کرنے کی کامیاب کوشش کرتے ہیں۔ اسمیں دونوں طبائع اور جبلتوں کا اسی انداز میں مقابلہ اور موازنہ کیا گیا ہے جیسا کہ محمد مویلحی نے اپنی کتاب "حدیث عیسیٰ بن ہشام" میں کیا ہے۔ دونوں میں بڑی حد تک مطابقت ہے۔ البتہ مویلحی نے مغربی زندگی کو مزید واضح کرکے پیش کیا ہے۔ ان کا اسلوب بھی مغربی سے قریب ہے لیکن وہ مغرب کی تقلید میں حد سے زیادہ احتیاط کے قائل ہیں۔ ان کے یہاں ماضی سے رشتہ قائم رکھنا از حد ضروری اور لازم ہے۔

اس کتاب میں "علم الدین" کی شخصیت گرچہ مفروضی ہے لیکن مؤلف کی شخصیت سے بیحد مشابہ اور قریب ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے ایک مفروضی

---

[1] القاهرة — علم الدين ۱۸۸۳ء ص ۸

کردار کے پردے میں اپنی شخصیت اور اپنے افکار کی ترجمانی کی ہے۔ چنانچہ والد صاحب کا "علم الدین" کو جامعہ ازہر بھیجنا، وہاں ایک انگریز سے بلا قصد و ارادہ اچانک ملاقات ہو جانا اور دونوں کا سفر پر آمادہ ہو جانا، ان سب میں مؤلف کی تصویر نظر آتی ہے، خاص طور سے علم الدین میں مکالمات کے دوران جو معلومات اور افکار فراہم کئے گئے ہیں ان کا مرجع زیادہ تر فرانسیسی مآخذ ہیں۔ علی مبارک فرانسیسی زبان سے بخوبی واقف تھے۔ اسی مطابقت اور مشابہت کی وجہ سے اس کتاب کو بھی ہم ان کی ایک خود نوشت تسلیم کرتے ہیں۔

باب سوم

بیسویں صدی میں
عربی خودنوشت سوانح نگاری
کا ارتقاء

بیسوی صدی عیسوی پر آپ طائرانہ نظر ڈالنے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اس صدی میں دیگر علوم و فنون کی طرح فن خود نوشت نگاری کو بھی غیر معمولی ترقی نصیب ہوئی۔ اور یہ ترقی بھی ہمہ جہتی ہے۔ اگر ہم اس ارتقاء کے اسباب و عوامل کا جائزہ لیں تو اس کی جڑیں بہت گہری نظر آئیں گی۔ ان میں سے بعض کا تعلق ماضی کی مرحلہ وار تبدیلیوں اور انقلاب سے ہوگا تو بعض بالکل نئے اور جدید تقاضوں کی پیداوار ہونگے

بلاشبہ عربی ادب میں بعض مثبت تبدیلیاں انیسویں صدی کے آغاز ہی سے آنی شروع ہو گئی تھیں۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ ان میں اضافہ ہوتا گیا۔ بعد میں یہی تبدیلیاں عربی ادب کے مکمل عروج کا سبب بن گئیں۔ دور حاضر میں علوم و فنون کی ارتقاء اور سائنس و ٹکنالوجی کی مقبولیت سے انسان کو سب سے بڑا فائدہ یہ پہونچا کہ ان سے اس کی شخصیت کے بعض خفیہ پہلو ابھر کر سامنے آئے۔ فطرت اور انسان کو سمجھنے کی کوشش بہت پہلے سے ہوتی آرہی ہے۔ یہ ایسے امور ہیں جن کے بارے میں انسانی نقطہ ہائے نظر ہمیشہ مختلف اور متغائر رہے ہیں اور فی الواقع اسی اختلاف کے نتیجے میں مختلف افکار و نظریات وجود میں آتے رہے ہیں۔ اسی نوعیت کی ایک کوشش ڈارون کی کتاب "أصل الأنواع" ہے اسمیں پیش کردہ نظریہ ارتقاء کا عصر جدید میں انسان کی تفہیم میں بڑا نمایاں رول رہا ہے[1]۔ اس کے بعد اس

---

[1] علی ادھم ا ، علی هامش الادب و النقد ص ۳۲ ۔ دار الفکر العربی قاہرہ ب ت

پر مزید بحث و مباحثہ ہوا اور باقاعدہ ایک علم "علم الانسان" (Anthropology) کے نام سے وجود میں آیا۔ ان کوششوں سے موجودہ انسان کو اپنی حقیقت معلوم کرنے اور اپنا مزاج اور طبیعت سمجھنے میں مدد ملی۔ پھر عصر حاضر کے ایک اور مفکر فرائڈ نے علوم انسانی میں علم نفسیات کی اہمیت کو اجاگر کر کے نئی نسل کو نفسیاتی تحلیل و تجزیہ کا خوگر بنایا۔ اس نفسیاتی تجزیہ کیلئے انسان کے اپنے بیانات سے زیادہ اور کوئی چیز مفید نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ اس سے خود نوشت نگاری کو بے حد اہمیت حاصل ہو گئی۔

عربی زبان میں خود نوشت نگاری کے ارتقاء کیلئے مذکورہ علوم کے علاوہ بعض دوسرے عوامل بھی کارفرما رہے ہیں۔ خود جزیرہ عرب کی سیاسی اور سماجی صورتحال پر ایک ہلکی نظر ڈالنے سے بعض دوسرے مؤثر اسباب کی طرف رہنمائی ہوتی ہے۔ بیسویں صدی کے نصف اول میں پوری دنیا کے سامنے جو مسائل درپیش تھے انہیں مختلف قوموں اور ممالک کے بقاء و وجود کا مسئلہ خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ جنگ عظیم اول اور دوئم کی تباہ کاریوں سے انسان اپنے مستقبل کے بارے میں سخت اندیشوں سے دوچار تھا۔ عالم اسلام اور خاص طور سے عالم عرب میں معقول اسباب کی بنیاد پر یہ اندیشے اور خدشات کچھ زیادہ ہی محسوس کئے جا رہے تھے۔ ان کی وجہ سے لازماً قومی وجود اور شخصی وجود کے اثبات اور تحفظ کی طرف توجہات زیادہ مرکوز ہوئیں۔ پھر عالم عرب کی سیاسی اور سماجی صورتحال کا ایک عجیب و غریب پہلو اور بھی تھا۔ وہاں جن علاقوں پر اپنوں کی حکومت تھی وہ بھی عدل و مساوات کے سلسلے میں مخلص نہیں تھے۔ سماج کو مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ جس کی وجہ سے قومی ذرائع و وسائل سے انتفاع کے فطری حق سے بہت سے لوگ محروم کر دیئے گئے تھے۔ جب مختلف اسباب کے باعث ان لوگوں کو کچھ آگے بڑھنے کا موقع ملا تو انہیں قوم کے بااثر لوگوں سے سخت کبیدگی اور

لغزش ہوگئی اور اپنی حالت زار پر افسوس اور ندامت ہوئی۔ نفس کی اس خلجانی کیفیت نے انھیں کچھ کہنے اور لکھنے پر مجبور کر دیا۔[1]

مذکورہ بالا اسباب کی وجہ سے بیسویں صدی عیسوی کے عرب علماء نے اپنی ذات اور شخصیت کا گہرائی سے جائزہ لیا اور اسے لوگوں کے سامنے پیش کیا۔ چنانچہ اس صدی کے اوائل ہی میں اظہار ذات کی بہت سی شکلیں معروف و متداول ہوگئیں۔ جن سے عربی شخصیت کے خدوخال نمایاں ہوئے اور اسکی شناخت ممکن ہوسکی۔ اس کام میں متوسط طبقے کے ادباء نے بہت نمایاں کردار ادا کیا۔ ان لوگوں کی کوششوں سے لوگوں کے اندر حریت، استقلال، دستور اور جمہوری نظام کے مفاہیم واضح ہوئے اور انکے حصول کیلئے منظم جدوجہد کا آغاز ہوا۔ اس مقصد کیلئے مصری ادباء نے ایک ایسا ادب پیش کیا جو قوم کی امیدوں اور آرزوؤں کے عین مطابق تھا۔ اور جسمیں کسی کی نقالی یا تقلید نہیں کی گئی تھی

جدید عرب خود نوشت نگاروں نے اپنے ذاتی اور انفرادی احساس کے تحت جو کچھ لکھا ان میں لوگوں کے جذبات کی بھرپور عکاسی تھی۔ انھوں نے عربی ادب، مغربی ادب اور جدید افکار و نظریات سے مدد لی۔ ان کی تحریروں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ بحیثیت مجموعی اپنے مؤلفین کی فکری، روحانی، ادبی، معاشرتی اور سیاسی سے متعلق حقائق سامنے لاتی ہیں۔ بلاشبہ ان مؤلفین کا اپنے زمانے کی تبدیلیوں میں بڑا نمایاں رول رہا ہے۔ ان مؤلفین نے اپنی ذات سے متعلق تحریروں کو جدید مفہوم اور اسلوب سے آراستہ کرنے کی کوشش کی۔ ان کے سامنے مغربی زبانوں کی خود نوشت سوانح عمریاں بطور نمونہ موجود تھیں۔ انھوں نے اپنے فن میں کبھی کبھی اس قدر جدت اور ندرت پیدا کی کہ یہ مغربی خود نوشتوں سے بھی آگے بڑھ گئے۔[2]

---

[1] Modern Arabic Literature. J. A. Haywood, London. P.P. 163-166

[2] علی هامش الادب والنقد، علی ادهم ص ۲۸ - ۲۹ ۔

جدید عربی ادب کی بعض خود نوشت سوانح عمریوں میں کچھ ایسی خصوصیات پائی جاتی ہیں جو قدیم عربی خود نوشتوں میں موجود نہیں تھیں مثلاً اپنے ماحول اور گرد و پیش سے لاتعلقی کا اظہار۔ قدیم موروثی افکار کے خلاف اظہار بغاوت۔ اپنے بعض جرائم کا صریحاً اعلان وغیرہ۔[1] اسیطرح دور جدید میں خود نوشت سوانح سے مشابہ بعض دوسری اقسام کی تالیف و تدوین کا رواج پہلے کے بالمقابل زیادہ عام ہو گیا ہے۔ یہ سوانح مذاکرات، اعترافات اور اسی طرح کے دوسرے ناموں سے موسوم ہوئیں۔ پھر جدید دور میں افسانوی طرز پر خود نوشت سوانح عمری لکھنے کا فن بھی بہت آگے بڑھ گیا ہے۔ قدیم عربی ادب میں بھی اس طرز تالیف کا وجود ملتا ہے لیکن جدید دور میں اسکی مقبولیت اور رواج میں بیحد اضافہ ہوا ہے۔ اسی طرح خطوط اور مراسلات کی شکل میں اپنے جذبات کی ادائیگی کیلئے باضابطہ کتابیں تالیف کی گئیں۔ توفیق الحکیم کی "زهرة العمر"، احمد امین کی "إلى ولدي" اور محمد حسین کی "ولدي" وغیرہ اسی قبیل کی تصنیفات ہیں۔

یوں تو ہر ادبی عمل کی ایک انفرادی اور امتیازی حیثیت ہوتی ہے اس لئے اسے کسی دوسرے ادبی عمل کے ساتھ شامل کرنا مناسب نہیں ہوتا ہے۔ لیکن اسکے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ بعض ادبی اعمال میں اسقدر مطابقت ہوتی ہے کہ انہیں کسی تقسیم کے وقت ایک ساتھ رکھنے میں کوئی مضائقہ نظر نہیں آتا۔ پس ہمارے پاس موجود خود نوشت سوانح عمریوں کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ ہم اغراض و مقاصد کی روشنی میں ان خود نوشت سوانح عمریوں کی تقسیم کر سکتے ہیں۔ کیونکہ ان کے مؤلفین کی دلچسپیاں باہم دگر مختلف ہونے کے باوجود بعض امور میں کبھی کبھی یکسانیت رکھتی ہیں۔ پھر خود نوشت کی مختلف بنیادی شرائط کی تکمیل میں بھی ان میں بعض کی بعض سے مطابقت ہوتی ہے اور بعض سے مغایرت۔ یہاں یہ حقیقت بھی پیش نظر رہے

---

[1] جرمانوس، حضارة الإسلام ص ۳۴۲-۳۴۹، مكتبة مصر، ۱۹۵۶ء۔

کہ ہر خود نوشت کا ایک محرک ہوتا ہے اور یہی محرک خود نوشت کے مضمون کا تعین کرتا ہے اور اسکی غرض وغایت کو واضح کرتا ہے اسطرح ہم جدید عربی خود نوشت سوانح عمریوں کو ان کے اغراض ومقاصد، طریقہ کار اور محرکات کی روشنی میں درج ذیل اقسام میں تقسیم کرسکتے ہیں۔

۱۔ فکری خود نوشت سوانح عمریاں

جدید عربی خود نوشت سوانح عمریاں اپنے مؤلفین کے افکار وخیالات کی بھرپور نمائندگی کرتی ہیں ان سے ان مفکرین کی فکری خوبیاں اور امتیازی اوصاف ابھر کر سامنے آجاتے ہیں اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ذہنی تربیت میں کون سے عوامل اور محرکات کارفرما رہے ہیں۔ اور اس راہ میں انھیں کس طرح کی مشکلات اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا

یہ ایک حقیقت ہے کہ مغربی تہذیب اور اس کے مظاہر سے آشنائی کے بعد عرب مفکرین اور ادباء کی ایک قابل ذکر تعداد ان موروثی رسوم ورواج کے خلاف آواز اٹھانے لگی جو ایک زمانے سے ان کے معاشرے میں معروف ومشہور تھیں۔ جنگ عظیم اولی کے بعد چونکہ انگریزوں نے عربوں سے کئے ہوئے اپنے وعدوں کی تکمیل نہیں کی اور پورا عالم اسلام خاص طور سے عالم عرب اس جنگ کا خصوصی نشانہ بنا اسلئے عربوں کے تعلیم یافتہ طبقے میں ایک بے چینی اور اضطراب پیدا ہوا۔ اور اس کے نتیجے میں غور وفکر کی مختلف راہیں ہموار ہوتی گئیں۔ اپنے تشخص اور انفرادیت سے متعلق جب سرگرم تلاش وجستجو ہوئی تو کچھ ادباء ومفکرین نے اپنے ورثے سے مایوس ہوکر پوری تہذیب وتمدن کیطرف دیکھنا شروع کردیا اور کچھ دوسرے اپنے ماضی ہی سے امیدیں وابستہ کئے بیٹھے رہے پھر ان میں ایک تیسرا گروپ بھی تھا جو دونوں کے درمیان مطابقت اور اعتدال پیدا کرنے کیلئے سرگرم عمل تھا[1]۔ ان تمام فکری رجحانات ومیلانات سے عربوں کے سامنے مختلف نوعیت کے مسائل پیدا ہوگئے

---

[1] انیس المقدسی، الاتجاہات الادبیۃ فی العالم العربی الحدیث ص ۳۵-۳۸، بیروت ۱۹۶۹ء۔

مذکورہ فکری میلانات ایک دوسرے سے اس قدر مختلف اور متغایر تھے کہ انکی ابتدا ہی سے ایک الگ پہچان اور شناخت بن گئی۔ جدید عربی خودنوشت سوانح ان تمام رجحانات کی عکاسی کرتی ہیں اور ان میں اختلافات کے باعث یہ سوانح بھی مختلف جہتیات کی مالک ہیں۔ پس عبدالرحمن شکری، عقاد، مازنی اور احمد امین نے جو کچھ لکھا وہ ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتا

فکری اعتبار سے جدید عربی خودنوشت سوانح کا سب سے بڑا وصف یہ تھا کہ انکے لکھنے والے زیادہ تر متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ معاشرتی اور سیاسی اعتبار سے پسماندہ تھے جب ان لوگوں کو یورپی علوم و فنون اور تہذیب و تمدن سے واقفیت ہوئی تو انھیں اپنے معاشرے اور اسکی رسوم و روایات سے نفرت ہونے لگی۔ چنانچہ ان لوگوں نے یورپ سے اخذ کردہ جدید مفاہیم کی روشنی میں ادب و ثقافت کے قدیم مفاہیم کے گرد شکوک و شبہات کا اظہار کیا اور اپنی بات مستحکم بنانے کیلئے مغربی ادب و ثقافت کے بہت سے حصوں کا ترجمہ بھی کیا جدید خودنوشت نگاروں میں جو ادباء خاص طور سے مغرب سے متاثر نظر آتے ہیں ان میں طٰہٰ حسین، سلامہ موسیٰ اور توفیق الحکیم قابل ذکر ہیں۔ ان میں بعض ادباء ایسے بھی ہیں جنھوں نے مغرب و مشرق کے درمیان فاصلہ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اس سلسلے میں احمد امین اور عباس محمود العقاد کی کوششیں خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ البتہ ان ادیبوں میں میخائیل کی شخصیت وہ واحد شخصیت ہے جو مغرب سے بیحد قریب ہونے کے باوجود اپنی فکری دنیا کی ایک علیحدہ تشکیل و تعمیر میں کامیاب ہو گئی انھوں نے مشرق و مغرب سے بلند ہو کر لوگوں کے سامنے ایک آفاقی نظریہ پیش کیا جسکی بنیادیں دونوں تہذیبوں سے مستعار نہیں۔[1] عباس محمود العقاد اپنی خودنوشت میں دیگر تالیفات کیطرح بیش تر سیاسی و معاشرتی مسائل میں منفرد نظر آتے ہیں۔ انھیں اپنی

---

[1] میخائیل نعیمۃ، السبعون، ثلاثۃ اجزاء، دار صادر بیروت ۱۹۵۹ء / ۱۹۶۰ء۔

ذات پر بیحد اعتماد ہے۔ وہ اپنی افکار کو پیش کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہیں۔ انکی تحریروں میں سب سے زیادہ انکی انا اور انفرادیت ہے

جدید عرب ادباء مغرب سے متاثر اپنے افکار اور اپنے معاشرے کے درمیان ایک خلا محسوس کرتے ہیں اور کبھی کبھی اس خلا سے پریشان ہو کر وہ جھنجھلاہٹ اور اضطراب کے شکار ہو جاتے ہیں۔ طٰہٰ حسین کی "مستقبل الثقافۃ" اور "فی الشعر الجاھلی" اس کی بین مثال ہے اپنی کتاب "الایام" میں بھی انھوں نے معاشرے کی تنگ دامنی پر اپنے غم و غصے کا اظہار کیا ہے۔ اور لوگوں کو قدیم منزدھوں سے نکلنے کی دعوت دی ہے[1]، الغرض جدید عربی سوانح میں عصر حاضر کی ضروریات اور افکار و مسائل بڑی خوش اسلوبی سے پیش کئے گئے ہیں۔ معاشرے کی فکری اور نفسیاتی مشکلات کے علاوہ ان میں ادبی و فکری مسائل کے مختلف پہلوؤں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ انکے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جدید عربی شخصیت کے خد و خال اب بڑی حد تک نمایاں ہو گئے ہیں۔ یہ قدیم و جدید کی آمیزش سے ایک امتیازی شان کی مالک بن چکی ہے اور اب یہ اس قابل ہے کہ مقامی اثرات سے بالاتر ہو کر پورے عالم میں اپنے انمٹ نقوش ثبت کر سکے۔

۲۔ سیاسی خودنوشت سوانح عمریاں

سیاسی قسم کی خودنوشت سوانح عمریوں میں انشا پرداز کے سیاسی میدان کی تصویر کشی ہوتی ہے۔ ان سے سیاسی دنیا میں اسکے کردار اور نمایاں کارناموں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اس نوعیت کی خودنوشت سوانح زیادہ تر دفاع کے مقصد سے لکھی گئی ہیں کیونکہ انکے مؤلفین کا سیاست کے بارے میں مخصوص نقطۂ نظر اور موقف رہا ہے جس پر مختلف حلقوں سے انھیں تنقید و تعریض کا نشانہ بھی بننا پڑا اس لئے اپنے افکار و خیالات اور اصول و ضوابط کی وضاحت انکے لئے

---

[1] طٰہٰ حسین، الأیام، الجزء الاول والثانی، دار المعارف مصر ۱۹۵۵ء۔

لازم تھی

جدید عربی ادب میں احمد شفیق کی کتاب "مذاکراتی فی نصف قرن"[1] اسکی ایک بہتر بن مثال ہے۔ اسمیں اپنے بعض شخصی احوال کے ساتھ ۱۸۷۳ء سے ۱۹۲۳ء تک کی سیاسی اور معاشرتی زندگی کی تفصیلات قلمبند کی ہیں۔ یہ کتاب مصر کی جدید تاریخ کا ایک بہتر بن ماخذ ہے مصنف نے اپنی کتاب میں خدیو توفیق کی حمایت اور احمد عرابی پاشا کی مخالفت کے اسباب تفصیل سے بیان کئے ہیں۔ اس طرح یہ کتاب اپنے مؤلف کے ایک خاص موقف کی وضاحت اور دفاع کا کام انجام دیتی ہے۔

فی الواقع انیسویں صدی عیسوی کے اواخر اور بیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں مصر کے اندر جو سیاسی اور اصلاحی تحریکیں برپا ہوئی تھیں انکی وجہ سے سیاسی یادداشتیں جمع کرنے کی روایت کافی مقبول ہوئی۔ ان تحریکوں کے قائدین نے خاص طور سے مختلف مسائل کے بارے میں اپنا مخصوص نقطہ نظر واضح کیا۔ خود احمد عرابی پاشا نے "کشف الستار عن سر الاسرار" کے نام سے اپنے مذاکرات قلمبند کیا۔ اسی طرز پر انکے ایک رفیق محمود فہمی نے اپنے ذاتی تاثرات قلمبند کئے۔ اسمیں انقلاب کے دوران پیش آنے والے واقعات پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ اسی طرح عبد اللہ ندیم نے بھی انقلاب کے بارے میں اپنی یادداشتیں قلمبند کرکے احمد عرابی کی خدمت میں ارسال کیا تھا۔ یہ یادداشتیں بعض دوسرے خطوط اور مقالات کے ساتھ ۱۹۵۶ء میں "عبد اللہ الندیم ومذاکرات الشخصیۃ" کے نام سے شائع ہوئیں۔

احمد لطفی السید کی "قصۃ حیاتی"، عبد العزیز فہمی کی "مذکرات حیاتی"، اور محمد حسین ہیکل کی "مذاکرات فی السیاسۃ المصریۃ"[2] اسی طرز کی خود نوشت سوانح

---

[1] احمد شفیق، مذکراتی فی نصف قرن، القاہرہ ۱۹۳۲ء۔

[2] ان تینوں کتابوں پر اس مقالے میں تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے۔

حیات ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کا مصر اور عرب کی سیاست میں بڑا اہم رول رہا ہے۔ سیاست اور فکر کے تعلق سے انکے کچھ مخصوص نظریات تھے۔ انمیں سے بعض عوام کی جنرل سوچ سے ہم آہنگ نہیں تھے اسلئے انھیں عوام کے مختلف اور متضاد ردعمل کا سامنا کرنا پڑا۔ اپنے موقف کی باضابطہ وضاحت کے لئے ان میں سے ہر ایک نے اپنی خود نوشت لکھی، اور اسمیں سیاست، معاشرت اور فکری اصلاح کے تعلق سے اپنی سعی و کوشش اور جد وجہد کا دفاع کیا۔

مذکورہ بالا شخصیات میں سے لطفی السید کی خدمات اس لحاظ سے بیحد اہم ہیں کہ انھوں نے اپنی فکر و فلسفہ کی ترویج و اشاعت اور اسکے مطابق قوم کی اصلاح و تربیت کیلئے بیحد سنجیدہ اور مفید لائحہ عمل وضع کیا۔ اخبار الجریدہ کا اجراء، الحزب الوطنی کا قیام اور سرگرم شرکت، المصر للمصریین کا نعرہ اور فلسفہ ارسطو کی نمائندہ کتابوں کا ترجمہ، یہ سب ایک ہی سلسلے کی سنہری کڑیاں ہیں۔ سیاست اور معاشرت سے قوم کو واقف کرانے کیلئے وہ یونانی فلسفہ کو خاص اہمیت دیتے تھے۔ دوسری زبانوں سے عربی میں ترجمہ اور منتقلی کا کام انجام دینا لطفی السید کا طرۂ امتیاز ہے۔ ان سے پہلے اس کام کی طرح فتحی زغلول نے ڈالی تھی۔ انھوں نے قوم کی صحیح رہنمائی کیلئے سیاست اور معاشرت سے متعلق جدید مغربی مفکرین کی بعض مشہورہ آفاق تصانیف کو عربی زبان میں منتقل کیا تھا۔ اس سے لوگوں کے اندر حریت اور استقلال کا معنی اور مفہوم اور اس کے اصول و مبادی کا علم پیدا ہوا۔ اور وہ دنیاوی ترقی کیلئے علمی تیاریوں کی ضرورت سے واقف ہوئے۔[1]

محمد کرد علی، عبد الرحمن رافعی، محمد فرید اور ملک عبد اللہ کے مذاکرات کا شمار بھی سیاسی نوعیت کی خود نوشت سوانح عمریوں میں ہوتا ہے۔ ان میں سے اول الذکر دو کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ کرد علی نے اپنے مذاکرات میں ان الزامات کا دفاع کیا ہے جو جنگ عظیم

---

[1] قصۃ حیاتی، احمد لطفی السید، دار الہلال، قاہرہ ۱۹۶۲ء۔

اول کے دوران عثمانی حکمرانوں سے دوستی کے سبب ان پر لگائے جاتے تھے۔ اسطرح ان پر شام میں فرانسیسیوں کے غلبہ کے دوران انکی مدد کرنے کا الزام بھی لگایا جاتا ہے[1]۔ عبدالرحمن رافعی نے اپنے مذاکرات میں سیاسی اور قومی نظریات کے علاوہ اپنے زمانے کی تاریخ کا ریکارڈ بھی محفوظ کر دیا ہے۔ اسمیں انھوں نے "الحزب الوطنی" اور اسکے زعماء محمد فرید اور مصطفی کامل کے بارے میں تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ کتاب میں انکی زندگی کے ابتدائی مراحل زمانی ترتیب کے ساتھ پیش کر دیئے گئے ہیں۔ اہم تاریخی واقعات کی تاریخیں بھی مذکور ہیں۔ اس لئے تاریخ کے تعلق سے یہ ایک مفید کتاب ہے۔ یہ کتاب ان کی پیدائش ۱۸۸۹ء سے لیکر تاریخ اشاعت ۱۹۵۱ء تک محیط ہے[2]

۳۔ افسانوی خودنوشت سوانح عمریاں

انیسویں اور بیسویں صدی عیسوی میں جو سیاسی، معاشرتی اور تعلیمی نظریات مصر اور بیرون مصر فروغ پا رہے تھے۔ عرب مفکرین اور ادباء نے جسطرح انھیں اپنی دوسری تحریروں میں برتنے اور پیش کرنے کی کوشش کی اسیطرح انھوں نے اپنی ناولوں اور افسانوں میں بھی ان کو جگہ دی۔ ان ناولوں اور افسانوں میں یوں تو فرضی کردار پیش کئے جاتے ہیں اور انکے پردے میں مؤلفین اپنے افکار و خیالات پیش کرتے ہیں لیکن بعض ناول اور افسانے ایسے ہیں جن پر ایک معمولی سی نظر ڈالنے سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان کے کردار فرضی نہیں بلکہ حقیقی ہیں اور یہ کہ ان کا مصنف خود ان کا ایک بڑا ہیرو ہے۔ ایسے لوگ گویا اپنی ذات کی تعبیر اور اپنی بات کی تشریح کیلئے براہ راست ذرائع اختیار کرنے کے بجائے بالواسطہ طور طریقے سے کام لیتے ہیں۔ چنانچہ یہ بھی اظہار ذات کی ایک قسم ہوئی اور جدید دور میں اسکی مقبولیت میں اضافہ ہوا ہے۔

[1] مذکرات کرد علی، مطبعۃ الترقی، دمشق ۱۹۴۸ء ج ۱ ص ۳

[2] عبدالرحمان الرافعی، مذکراتی دار الہلال ۱۹۵۲ء ص ۳۔

اس طرز کی خود نوشت سوانح عمریوں میں جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے اپنے زمانے کے تمام ادبی، فکری اور سیاسی رجحانات موجود ہوتے ہیں۔ بس اسلوب اور طریقۂ کار کا فرق ہو جاتا ہے[1]۔ چنانچہ جسطرح انیسویں صدی عیسوی میں رفاعہ طہطاوی، علی مبارک اور شدیاق نے اپنی خود نوشت سوانح حیات میں تعلیم کی ضرورت اور نئی تہذیب کو اختیار کرنے کی دعوت دی اسیطرح موسیٰ نے اپنی ناول "حدیث علی بن ھشام" اور ابراھیم نے "لیالی سطیح" اسکی ضرورت و افادیت پر روشنی ڈالی۔ محمد حسین ھیکل کی کتاب "زینب" میں اصلاح و تنقید کا یہ رنگ مزید گہرا ہوا۔ اسمیں قاسم امین کی تحریک آزادی نسواں سے متاثر ہو کر معاشرتی اصلاح کی کوشش کی گئی ہے[2]۔ پھر توفیق الحکیم نے اپنی کتاب "عودۃ الروح" پیش کر کے اس فکری اضطراب اور بے چینی کی بھرپور عکاسی کر دی جس سے اس زمانے کے مفکرین دوچار تھے۔ اس کتاب میں انھوں نے اپنے ہم وطنوں کو فرعونیت کی طرف رجوع ہونے کا مشورہ دیا تھا[3]۔ اسکے بعد مازنی کے افسانوں اور ناولوں میں اس فکری اضطراب کی مزید تفصیلات ملتی ہیں۔ ان کی تحریروں میں روشن خیالی، مذہبی زندگی اور فکری دیوالیے پن کا مزید سامان ملتا ہے۔ ان تحریروں میں عورت کا رول کچھ زیادہ ہی ابھرا ہوا ہے۔ ھیکل کی ناول میں عورت اپنے محبت کے جذبات کا اظہار نہیں کر سکتی تھی لیکن یہاں وہ اظہار سے آگے بڑھ کر بقدر ضرورت اور حاجت لطف اندوز ہوتی ہے۔ عقاد کی ناول "سارہ" میں جدید عورت کا کردار اور زیادہ نمایاں ہوا ہے اب وہ صرف محبت ہی نہیں کرتی ہے بلکہ اپنے پسندیدہ محبوب کو اپنے دام محبت میں گرفتار کر لیتی ہے اور جب چاہتی ہے اسے اپنے دربار سے ٹھکرا دیتی ہے۔ گویا عقاد اپنے تجربات کی رو سے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ان کے زمانے کی عورت آزادی کے متوقع حدود سے بہت آگے بڑھ گئی ہے جدید افسانوی خود نوشتوں میں ایک ہی کردار کی جو مختلف شکلیں نظر آتی ہیں

---

[1] جدید مصری ناول اور افسانے، بدر الدین الخاطر، مکتبہ جامعہ نئی دہلی ۱۹۸۶ء ص ۱۴۰

[2] محمد حسین ھیکل، زینب، ۱۹۵۹ء [3] عودۃ الروح، قاہرہ ۱۹۶۷ء [4] الشعبۃ، قاہرہ ۱۹۷۰ء۔

اور مختلف امور و مسائل کے بارے میں متعدد فکری رخ نظر آتے ہیں اسکی وجہ یہ ہے کہ بیسویں صدی عیسوی کے ربع اول میں عرب اپنی شخصیت کی تلاش میں مختلف وادیوں کے چکر لگا رہے تھے اور کوئی ایک بات پر انکا اتفاق نہیں ہو پا رہا تھا گویا، ایک فکری اضطراب سے دوچار تھے۔ ظاہر ہے کہ انکی تحریروں میں اس اضطراب کی عکاسی تو ہونی تھی۔ خاص طور سے ان تحریروں میں جو دلی کیفیات اور اندرونی جذبات کی آئینہ دار ہوں۔ لیکن اسکا مطلب یہ نہیں کہ عربوں کا فکری انتشار آج بھی اسی طرح قائم ہے۔ بلکہ اب وہ کسی حد تک اپنی شخصیت اور حقیقت کی تلاش میں کامیاب ہو چکے ہیں۔

۴۔ کسی مخصوص گوشہ حیات سے متعلق خودنوشت سوانح حیات

اس صنف خودنوشت میں انشاپرداز اپنے کسی مخصوص گوشۂ حیات پر روشنی ڈالتا ہے۔ وہ گوشہ ادب، فن، سائنس یا اس کے علاوہ کوئی اور ہو سکتا ہے۔ جدید عربی ادب میں بہت سے لوگوں نے اپنے بارے میں لکھا ہے۔ ان میں سے زیادہ تر نے اپنی پوری زندگی کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ لیکن بعض نے اپنی زندگی کے کسی نمایاں پہلو کو۔ اسکی ایک مثال جرجی زیدان کی مذاکرات ہے جس میں انھوں نے اپنی خاندان کے فقر و فاقہ اور جہالت اور لاعلمی کا بڑی جرأت اور صاف گوئی سے تذکرہ کیا ہے[1]۔ یوسف وھبی کی مذاکرات کا شمار بھی اسی قسم میں ہوتا ہے۔ اس میں انھوں نے فن ڈرامہ سے اپنی دلچسپی کے اسباب اور اسکی پوری تاریخ بیان کر دی ہے۔ فن ڈرامہ ہی سے متعلق فاطمہ رشدی مذاکرات بھی ہے۔

اس قسم میں وہ یادداشتیں بھی شامل کر لی جائیں گی جنھیں ہمارے ادیبوں نے اپنے بیرونی اسفار کے دوران تحریری شکل دی۔ اس میں انھوں نے اپنے مشاہدات اور ملاحظات قلمبند کئے ہیں۔ اس میں انکی ذاتی زندگی کے کچھ احوال بھی آ گئے ہیں اسطرح کے ادباء میں ابن رحمانی، مازنی اور طٰہٰ حسین کے نام بطور مثال پیش کئے جا سکتے ہیں۔ حسین فوزی کی "سندبادی رحلۃ الحیاۃ"[2] بھی اس نوعیت

---

[1] عصامیون عظماء من الشرق والغرب، طاہر الطناحی، دار الہلال ۱۹۴۳ء

[2] سندبادی رحلۃ الحیاۃ، حسین فوزی، دار المعارف ۱۹۶۹ء

کی تصنیف ہے۔ اس میں انھوں نے ان حالات کی تصویر کھینچی ہے جن سے گزر کر زندگی کے اس مرحلے تک پہنچ چکے تھے۔

ان کے علاوہ شابی کی "مذکرات"[1] یحییٰ حقی کی "خلیہا علی اللہ"[2] اور توفیق الحکیم کی "یومیات نائب فی الأریاف"[3] بھی اسی قسم میں شمار کی جاتی ہیں۔ یہ تینوں ادبا حکومت کی تفویض کردہ ذمہ داریوں کے تحت مختلف دیہاتوں میں اپنی زندگی کا کچھ حصہ بسر کیا۔ انکی مذکورہ کتابوں میں بھی حصہ زیادہ غالب ہے۔ بقیہ زندگی کے دوسرے حصے برائے نام ہیں۔ ان سب نے دیہاتی زندگی کو مزید بہتر بنانے اور کسانوں کے حقوق و واجبات کا تحفظ کرنے کی پرزور وکالت کی ہے۔

مذکورہ بالا تصنیفات کے علاوہ بھی عربی زبان میں بہت سی دوسری تصنیفات ہیں جو اپنے لکھنے والے کی ایک مخصوص تصویر پیش کرتی ہیں۔ دور حاضر میں تحریک الاخوان المسلمون سے متعلقین میں سے بعض نے راہ حق میں ابتلاء و آزمائش کی روداد قلمبند کی ہیں۔ یہ گرچہ ان کی زندگی کے ایک مخصوص گوشہ (یعنی تحریک اور دعوتی جد و جہد) کو پیش کرتی ہیں لیکن چونکہ یہ تحریریں خلوص قلب اور دل کی یکسوئی کے ساتھ لکھی گئی ہیں اس لئے اثر انگیزی اور سحر بیانی میں اپنی مثال آپ ہیں۔ ان میں زینب الغزالی کی "أیام من حیاتی" احمد رائف کی "البوابات السوداء" اور عمر تلمسانی کی "من سجل ذکریاتی" خاص طور سے قابل ذکر ہیں

اس پوری بحث میں یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ جدید عربی ادب میں خود نوشت نگاری کی تقریباً تمام اقسام پائی جاتی ہیں۔ قدیم عربی سرمائے میں بعض اقسام کی طرف غفلت برتی گئی تھی یا ان پر توجہ دی گئی لیکن انکا حق ادا نہیں ہو سکا تھا۔ اسکی تلافی جدید عربی ادب سے کسی حد تک ہو جاتی ہے۔ اب یہ ادب اس قدر مالا مال ہو چکا ہے کہ بجا طور پر عالمی آداب کی صف میں کھڑا ہونے اور ان کی ہمسری کرنے کا اہل ہو گیا ہے۔

---

[1] الشابی، مذکرات الشابی، دار التونسیة للنشر ۱۹۶۶ء۔

[2] دار الکاتب العربی للنشر والطباعة (ب ت) [3] قاہرہ، مکتبة الآداب (ب ت)

جدید عربی خود نوشت سوانح نگاری کے نمایاں اوصاف

جدید عربی ادب میں خود نوشت سوانح عمری کا جو ذخیرہ موجود ہے اس میں بعض اوصاف سب میں کسی نہ کسی مقدار میں موجود ہیں۔ ان کا تتبع اور استقصا کرکے ایک جامع فہرست مرتب کی جاسکتی ہے۔ لیکن قبل اسکے کہ اسکا باقاعدہ آغاز کیا جائے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قدیم و جدید خود نوشت سوانح عمریوں کا ایک سرسری تقابلی مطالعہ کرکے ان ارتقائی مراحل سے واقفیت حاصل کی جائے جو جدید دور تک پہنچنے میں عربی خود نوشت نے طے کئے ہیں۔ جب ہم اس مقصد سے عربی زبان کے سوانحی سرمائے کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمارے سامنے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ یہاں مواد و موضوع اور شکل و ہیئت دونوں اعتبار سے نمایاں فرق واقع ہوا ہے۔

مواد اور موضوع کے لحاظ سے جو فرق واقع ہوا ہے وہ یہ ہے کہ قدیم عربی خود نوشت سوانح حیات عربی فکر کی بنیادی روح سے ہم آہنگ تھی۔ اس میں مروجہ افکار و خیالات کا پاس و لحاظ کیا گیا تھا اور اخلاقی و الٰہی تعلیمات کی بھی بھرپور عکاسی کی گئی تھی۔ ان اخلاقی تعلیمات کے غلبہ کی وجہ سے عیوب کی صراحت اور اخلاقی کمزوریوں کا اعلان میں حد درجہ احتیاط برتی جاتی تھی۔ ہاں البتہ ان امور میں سب کا معاملہ یکساں نہیں تھا۔ ابن جشم وغیرہ کی شکل میں بعض مستثنیات بھی ملتی ہیں۔ لیکن جدید عربی خود نوشت نگاروں نے معاصر افکار و نظریات سے متاثر ہوکر عربی معاشرے کی مسلم روایات سے انحراف اور بغاوت کی راہ اختیار کرلی ہے۔ انھوں نے قدیم مروجہ افکار سے صرف اپنی لاتعلقی ہی کا نہیں بلکہ انکے خلاف اعلان جنگ کرکے ان کے بالمقابل نئے اصلاح شدہ خیالات پیش کئے ہیں۔ مغربی خود نوشت نگاروں کا مقابلہ کرتے ہوئے انھوں نے صاف گوئی اور سچائی کے نام پر اپنے دھکے چھپے جذبات کا برہنہ اعلان کرکے انتہائی ڈھٹائی اور بیحیائی کا مظاہرہ کیا ہے۔

توفیق الحکیم کی "زہرۃ العمر" اور میخائیل نعیمہ کی "السبعون" اسکی واضح مثال ہے۔

ماہیت اور شکل کے اعتبار سے قدیم و جدید عربی خود نوشتوں میں سب سے پہلا فرق یہ واقع ہوا کہ مغربی خود نوشتوں سے اخذ و استفادہ کی وجہ سے موجودہ عربی خود نوشت اپنی ماہیت ترکیبی کے لحاظ سے بڑی حد تک متعین اور مشکل ہو گئی ہے۔ نیز اپنے مقصد سے ہم آہنگ ہو گئی ہے۔ قدیم ادباء خود نوشت کی بہت سی شکلوں حتیٰ کہ انسانوی شکل سے بھی واقف تھے۔ لیکن جدید دور کی طرح انکے پاس ان شکلوں کیلئے کوئی اصلاح نہیں تھی۔ جدید دور میں ہر شکل کیلئے ایک علیحدہ نام رکھ دیا گیا ہے جو بڑی حد تک اس کے مضمون کو متعین کر دیتی ہے[1]۔ جیسے یومیات، مذاکرات، ذکریات اور اعترافات وغیرہ۔

دور جدید کے عرب ادیبوں نے اپنی سوانح کیلئے مذکورہ اصطلاحات کا استعمال کیا اور حتی الامکان ان اصطلاحات کے مطالبات کی تکمیل کرتے ہوئے ان کی حدود و قیود کا پاس و لحاظ رکھا۔ لیکن کہیں کہیں کچھ شکلوں اور ماہیات کے باب میں گڈمڈ اور اشتباہ بھی ہوا ہے۔ مثلاً طٰہٰ حسین نے براہ راست اور بالاعلان اپنی سوانح حیات لکھنے کا قصد کیا۔ لیکن اسکیلئے انسانوی طرز اختیار کیا اسطرح شابی نے اپنی زندگی کے پانچ ہفتوں کی ڈائری مرتب کی لیکن اس میں اپنی دوسری یادداشتوں کو بھی شامل کر دیا۔ تاہم کچھ ادباء کو مستثنیٰ کر دیا جائے تو زیادہ تر نے ایسا ہی نام منتخب کیا جو ان کی غرض و غایت کو واضح کر دے۔ مثلاً عقاد کی "انا" اور "حیاۃ قلم" سلامہ موسیٰ کی "تربیۃ سلامہ موسیٰ" اور میخائیل نعیمہ کی "السبعون" وغیرہ

مضمون اور ماہیت میں قدیم و جدید کے درمیان مذکورہ بالا فرق کے علاوہ بھی بعض دوسرے پہلو ہیں جن پر گفتگو ہو سکتی ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جدید عربی

---

[1] عبدالکریم الاشتر، النثر المہجری، مطبعۃ اللجنۃ، قاہرہ ۱۹۵۵ء۔

خود نوشت اور قدیم عربی نوشت کے درمیان بعض مشترکہ پہلو بھی ہیں۔ خود مضمون کے اعتبار سے جو فرق بنایا گیا ہے وہ آخری لکیر نہیں ہے۔ جدید خود نوشتوں میں بھی بعض گوشے ایسے ہیں جو ان کے لکھنے والوں کی حمیت، غیرت اور حیا و شرم کے آئینہ دار ہیں۔ پھر بہت کچھ آگے بڑھ جانے کے باوجود ان کے اندر بے حیائی اور عریانیت کا وہ مظہر نہیں پایا جاتا جو مغربی خود نوشتوں کا طرۂ امتیاز ہے۔

قدیم و جدید عربی خود نوشت سوانح حیات اور عربی و مغربی خود نوشت سوانح حیات کے درمیان اتحاد و اتفاق اور اختلاف و مغایرت کے بہت سے ایسے نقاط ہیں جن پر تفصیلی غور و فکر، بحث و تمحیص اور تقریر و تحریر کی ضرورت ہے۔ لیکن فی الحال اس سے صرف نظر کرتے ہوئے ان خوبیوں اور اوصاف پر ایک نظر ڈالنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ جو جدید خود نوشت نگاری کے ساتھ مخصوص ہے۔ ان کا وجود اس کے علاوہ اور کہیں نہیں پایا جاتا۔ وہ امتیازی خوبیاں اور اوصاف درج ذیل ہیں۔

۱۔ اسالیب تعبیر

جدید عرب خود نوشت نگاروں کے یہاں اپنے تجربات اور افکار و خیالات کی ادائیگی کے لئے تین اسالیب زیادہ معروف ہیں۔ ان اسالیب کی سب سے پہلی خوبی یہ ہے کہ یہ خود نوشت کی فنی ترکیب اور تشکیل سے مکمل طور سے ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ ان کی مختصر تفصیل پیش کی جا رہی ہے

اول: تفسیری و تحلیلی اسلوب

اس میں انشا پرداز مقالہ نگاری کی طرح تفسیر و توضیح اور تحلیل اور تجزیہ سے

کام لیتا ہے۔ وہ اپنے واقعات، مشاہدات اور افکار کو پیش کرتے ہوئے تحلیل اور تجزیہ کا ایک ایسا انداز اختیار کرتا ہے جس سے مختلف بکھری اور منتشر کڑیوں کے درمیان ربط پیدا ہو جاتا ہے اور خود نوشت اپنے حقیقی مفہوم اور مدعا کے ساتھ سامنے آتی ہے۔ وہ بظاہر ایک طویل مقالے کی شکل لئے ہوتی ہے جس میں متعدد چھوٹی چھوٹی فصلیں شامل ہوتی ہیں[۱]

جدید عربی زبان کے بہت سے ادباء نے یہ اسلوب اختیار کیا ہے۔ انھوں نے اپنی سوانح حیات لکھتے وقت اس امر پر پوری توجہ مرکوز رکھی کہ ان کی فکری، عقلی اور نفسیاتی ارتقا کی پوری صورتحال بالکل واضح ہو جائے۔ اس کے لئے مقالے کا اسلوب ہی بہتر تھا۔ اس میں توضیح و تحلیل اور اس سے بڑھ کر تقریر کی گنجائش ہوتی ہے۔ خود نوشت نگاری میں مقالہ نگاری کا اسلوب اختیار کرنے کی سب سے بڑی وجہ اسکی فصلوں کے مابین رابطہ اور تعلق پیدا کرنے کی کوشش ہوتی ہے۔ کیونکہ خود نوشت میں زندگی کی ہر ادا اور حرکت کو سمیٹنا مشکل ہے اس لئے کاٹ چھانٹ اور اختیار و انتخاب کا عمل ناگزیر ہے۔ اس کے باعث مختلف واقعات کے مابین جو فصل زمانی یا فصل مکانی ہو جاتا ہے اسے مقالہ نگاری کے اسلوب ہی سے دور کیا جا سکتا ہے۔ اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں کہ تحلیل و تجزیہ اور تاویل و تفسیر کے انداز بیان سے عبارتوں کا ظاہری حسن دوبالا ہو جاتا ہے اور آرائش و زیبائش میں بیحد مدد ملتی ہے

تفسیر و تحلیل کا یہ اسلوب عربی زبان کے ان ادیبوں کے یہاں زیادہ پایا جاتا ہے جو مقالہ نگاری میں مہارت رکھتے ہیں۔ خاص طور سے وہ ادباء جن کی مقالہ نگاری میں تحلیل و تجزیہ کا رنگ و آہنگ غالب ہو۔ مقالہ نگاری سیاسی، صحافتی، فلسفیانہ یا ادبی کسی نوعیت کی ہو وہ اس اسلوب کیلئے میدان ہے۔ جدید عربی ادب میں لطفی السید، عبدالعزیز فہمی، محمد حسین ہیکل،

۱۔ Modern Arabic Literature. J.A. Hayood. PP. 137-138

عباس محمود عقاد، سلامہ موسیٰ اور احمد امین کی خود نوشت سوانح عمریاں مذکورہ اسلوب کی بہترین نمائندہ ہیں۔ اول الذکر تین ادباء کی سوانح پر سیاسی رنگ اور مؤخر الذکر تین کی سوانح پر فکری رنگ غالب ہے۔[1]

دوم: تفسیری و تصویری اسلوب

یہ وہ اسلوب ہے جو مقالہ کے تفسیری و تحلیلی اسلوب اور ناول کے تصویری و تخیلاتی اسلوب کے درمیان جمع و تطبیق کی ایک شکل ہے۔ مقالہ نگاری کے اسلوب کا تذکرہ ابھی ہو چکا ہے اور ناول نگاری کے اسلوب کا ذکر اسکے بعد ہونے والا ہے۔ زیر نظر اسلوب ان دونوں اسالیب کے درمیان ایک ایسی شکل کا نام ہے جو ادیب سے تصویر کشی کے وقت ناول کیطرف قصد کرنے کا مطالبہ کرتی ہے اور فکری و نفسیاتی حالت کی ترجمانی کے وقت مقالہ نگاری کے اسلوب کیطرف متوجہ کرتی ہے۔ پس وہ اپنی خود نوشت میں بیک وقت ان دونوں مطالبات کی تکمیل کرتا ہے۔ اور اسطرح وہ ایک ایسا طرز بیان اختیار کر لیتا ہے جو مقالہ اور ناول کے درمیان ایک تیسرا راستہ ہوتا ہے۔

اس مخلوط اسلوب کے ذریعہ جو نہ خالصتاً مقالہ کا ہے اور نہ ہی خالصتاً ناول کا، ایک مستقل بالذات اسلوب جنم لیتا ہے۔ اسے زیادہ تر خود نوشت میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اس اسلوب کا زیادہ تر استعمال ان ادیبوں نے کیا ہے جو مقالہ نگاری کے ساتھ ناول نگاری میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ انھوں نے دونوں سے استفادہ کر کے ایک مخلوط طرز کی بنا ڈالی۔ ان میں میخائیل نعیمہ[2] اور توفیق الحکیم کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

---

[1] ان تمام ادباء پر بحث کے وقت ان کے اسلوب تحریر پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

[2] میخائیل نعیمہ کی کتاب "السبعون" پر اس مقالے میں مفصل بحث موجود ہے۔

سوم: افسانوی اسلوب

یہ اسلوب زیادہ تر وہ ادباء اختیار کرتے ہیں جنھیں ناول نگاری یا افسانہ نویسی پر عبور ہوتا ہے۔ ادیب جب اس اسلوب میں اپنی زندگی کی تصویر کشی کرنی چاہے تو اسے سب سے پہلے اپنی غرض وغایت واضح کر دینی چاہئے۔ یعنی اسے یہ بتا دینا چاہئے کہ وہ اس ناول کے ذریعہ اپنی حقیقی زندگی پیش کر رہا ہے۔ ظاہر اسے اس وقت اپنے ناول یا افسانہ میں حقیقت کے عناصر جمع کرنے ہونگے۔ صرف ناول کا انداز اختیار کر کے تصورات کی دنیا میں بہہ جانے سے کام نہیں بنے گا۔ اگر اس نے ایسا نہیں کیا تو اسکی خودنوشت اپنے مفہوم اور مدعا سے بہت دور ہو جائیگی اور اسے سوانحی ناول میں شمار کرنا مشکل ہوگا۔

جدید عربی ادب میں ہمیں بعض ایسی ناولیں ملتی ہیں جن میں انشاء پرداز کی ذاتی زندگی کی تصویر کھینچی گئی ہے مثلاً عقاد کی "سارہ"[1] مازنی کی ابراہیم الکاتب اور ابراہیم الثانی[2] اور توفیق الحکیم کی "عصفور من الشرق"[3] وغیرہ۔ ان سب میں انکے مؤلفین نے اپنے ذاتی تجربات سے فائدہ اٹھایا ہے اور اسطرح عربی خودنوشت لٹریچر میں ایک بیش بہا اضافہ کیا ہے، لیکن ظاہر ہے کہ تمام مؤلفین کا معاملہ یکساں نہیں ہے۔ بعض کی ناولیں فنی اصولوں پر پورا نہ اترنے کیوجہ سے خودنوشت سوانح کی فہرست سے خارج ہونگی۔

۲۔ غرض وغایت کی وضاحت

خودنوشت نگار کیلئے اپنی تالیف کی غرض وغایت کی وضاحت بہت پسندیدہ مانی گئی ہے۔ اس لئے کہ اس سے اسکے موضوع کا رخ متعین ہوتا ہے اور خودنوشت

---

۱ قاہرہ، مصر ۱۹۵۹ء ، ۲ مکتبۃ الشبیبۃ قاہرہ ۱۹۷۰ء ۳ قاہرہ، مصر ۱۹۳۸ء

کے مشمولات میں اختیار و انتخاب اور حذف و اثبات میں آسانی ہوتی ہے۔ بعض خودنوشت نگار قاری کے ذہن پر اعتماد کرتے ہوئے غرض و غایت کی وضاحت نہیں کرتے۔ عام خودنوشت سوانح حیات میں تو اسکی کسی حد تک گنجائش ہے لیکن افسانوی طرز میں تحریر کردہ سوانح میں غرض و غایت کی وضاحت لازم ہے تاکہ حقیقی اور فرضی کردار میں التباس پیدا نہ ہو سکے۔ یہ وضاحت ہی فی الواقع ایک فنی ناول اور ناول کے اسلوب میں تحریر کردہ سوانح کے درمیان حد فاصل کھینچتی ہے۔

جدید عرب ادباء کا ایک نمایاں وصف یہ ہے کہ انھوں نے اپنی خودنوشت سوانح حیات میں اپنی غرض تالیف واضح کر دی ہے۔ بہت کم لوگ ایسے ہیں جنھوں نے اسے مخفی رکھ کر اسکی تلاش کا کام قارئین کے حوالہ کر دیا ہو۔ جن ادیبوں نے اپنی غرض و غایت واضح کر دی ہے ان کی ایک تعداد اسے اپنی شخصی زندگی کے حوالے سے پورے دور کی تصویر کشی قرار دیتی ہے۔ ان میں عبدالرحمان رافعی[1]، احمد امین[2]، حسین فوزی[3] اور سلامہ موسیٰ[4] ہیں۔ بعض دوسرے ادیبوں نے اپنا مقصد تالیف یہ واضح کیا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر پیش کریں۔ ان میں عبدالرحمان شکری، میخائیل نعیمہ اور توفیق الحکیم کے نام قابل ذکر ہیں۔

جن ادباء نے اپنی خودنوشت سوانح حیات میں افسانوی اسلوب اختیار کیا ہے ان میں زیادہ تر نے اپنی غرض تالیف واضح نہیں کی ہے۔ ان کی سوانح میں ناول نگاری کے فن اوصاف زیادہ غالب ہیں۔ وہ اپنے آپ کو واقعات و حادثات کے پیچھے چھپا لینے میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔ خودنوشت سوانح میں افسانوی اسلوب اختیار کرنے والوں میں لویس عوض کے علاوہ کسی نے اپنی تالیف کی غایت متعین نہیں کی ہے۔ بقیہ دوسرے ادیبوں کا حال یہ ہے کہ غرض

---

[1] رافعی، مذکرات ص ۳، [2] احمد امین، حیاتی ص ۶-۷ [3] سندباد، ص ۹۳

[4] سلامہ موسیٰ، تربیۃ سلامہ موسیٰ ص ۵

غرض تالیف تو کجا۔ توریہ و اخفا کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ ان میں سے بعض نے بعد میں اسے اپنی خود نوشت ہونے کا اعتراف کر لیا لیکن بعض آخر عمر تک انکار کرتے رہے۔ جن سوانحی ناولوں کی غرض و غایت واضح نہیں ہے ان میں عقاد کی "سارہ" توفیق الحکیم کی "عودۃ الروح" اور "عصفور من الشرق" اور میخائیل نعیمہ کی "مرداد" قابل ذکر ہیں۔

۳۔ وراثت اور ماحول کے اثرات کی وضاحت

عربی زبان کے جدید ادباء نے اپنی سوانح حیات میں وراثت اور ماحول کے ان عوامل پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے جن کا ان کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں بنیادی رول رہا ہے۔ البتہ ان میں سے بعض ادباء نے موروثی عوامل کے بالمقابل ماحولیاتی عوامل پر زیادہ زور دیا ہے یعنی ان لوگوں نے آباء و اجداد سے حاصل کردہ صفات کے بالمقابل اپنے ماحول اور گرد و پیش سے حاصل کردہ تعلیم و تربیت اور تجربات و مشاہدات کو زیادہ تفصیل سے بیان کیا ہے یا موروثی عوامل کو بالکل نظر انداز نہیں کیا ہے۔ ان ادباء میں میخائیل نعیمہ، حسین فوزی، مازنی، اور شکری کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان میں بعض ادباء ایسے ہیں جنھوں نے صرف ماحول کا اثر واضح کیا۔ مثلاً طٰہٰ حسین۔ یہ اپنی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں ماحول کے اثرات۔ خاص طور سے گاؤں اور ازہر کے ماحول۔ کا ذکر کیا ہے۔[1] بعض ادباء کی توجہ ان دونوں عوامل پر یکساں طور سے ہوتی ہے مثلاً احمد امین اور عقاد۔ احمد امین نے اپنی خود نوشت سوانح "حیاتی" کے آغاز ہی میں یہ لکھ دیا تھا کہ "انھوں نے اپنی تعمیر خود نہیں کی ہے وہ جو کچھ ہیں سب اللہ تعالیٰ کے قانون وراثت اور ماحول کے تحت ہوا"[2] عباس محمود عقاد نے تفصیل سے "ماں" اور "باپ" وغیرہ کا الگ الگ عنوان کر کے ان کے ماخوذ اور مستفاد صفات کا ذکر کیا ہے۔ اس دوران

---

[1] طٰہٰ حسین، الایام ج ۱ ص ۵/۱۱۵ [2] احمد امین، حیاتی ص ۱۱

ماں باپ اور دوسرے لوگوں کا بڑا تجزیاتی مطالعہ بھی کیا ہے۔[1]

جدید ادباء میں توفیق الحکیم کو اس اعتبار سے امتیاز حاصل ہے کہ انھوں نے ماحول اور وراثت کے عوامل پر الگ الگ کتابیں لکھی۔ چنانچہ ان کی شخصیت کی تعمیر میں موروثی عوامل کا جو حصہ تھا اس کی وضاحت انھوں نے اپنی کتاب "سجن العمر" میں کیا ہے۔ اور ماحولیاتی عوامل کی وضاحت "زہرۃ العمر" میں کیا ہے۔ ان کا انداز بیان علمی اور معروضی ہے۔ ان دونوں عوامل کے بارے میں ان کی سوچ کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان ان ہی عوامل کا پروردہ اور غلام ہوتا ہے۔ اسے فکری دنیا میں بہت ہی محدود پیمانے پر آزادی حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ وراثت کے عوامل کے بارے میں وہ وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "اگر کوئی شخص وراثت کی بندشوں سے آزاد ہونا چاہے تو کامیاب نہیں ہو سکے گا کیونکہ وہ وراثت کی ابدی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے"۔[2]

۴۔ عہد طفولت کی تصویر کشی

جدید خود نوشت سوانح نگاروں کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ وہ اپنے دیگر مراحل حیات کی طرح اپنے بچپن کے حالات کی بھی تصویر کشی کرتے ہیں۔ اور اسمیں تدریج، تسلسل اور ترتیب کا پورا خیال رکھتے ہیں اس طرح ان کی خود نوشت ایک مکمل، مستحکم اور مربوط کتاب کی شکل میں سامنے آتی ہے۔ اس حقیقت کے اعتراف کے باوجود کہ بچپن کی یادداشتوں کا استحضار ایک مشکل امر ہے۔ انسانی شخصیت کی تشکیل کے مختلف مراحل میں اسکی اہمیت اور ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ بلاشبہ عہد طفولت کے اثرات کا شخصیت کی نشاونما میں کلیدی رول ہوا کرتا ہے۔ اس کا اعتراف آج کی علم نفسیات میں ایک تسلیم شدہ حقیقت کے طور پر کیا جا رہا ہے۔ اگر خدانخواستہ انسان کا بچپن فقر و فاقہ اور دیگر مشکلات و مصائب میں گذرا ہو تو

---

[1] عباس محمود العقاد، أنا ص ۱۴ - ۱۵، دار الہلال قاہرہ (ت ب)

[2] توفیق الحکیم، سجن العمر ص ۱۱۔

اس وقت خاص طور سے اسکے منفی اثرات بعد کی زندگی پر مرتب ہوتے ہیں[1]۔

جدید عربی زبان کے خود نوشت نگاروں نے عہد طفولت کی مذکورہ اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے اس کی مشکلات کے باوجود اس پر بھرپور توجہ دی ہے۔ یہاں تک کہ بعض نے اس کیلئے پوری کتاب ہی مخصوص کر دی۔ مثلاً ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے اپنی کتاب "الأیام" کے پہلے حصہ میں اس بے سہارا اور بدقسمت عہد طفولت کی تصویر کھینچی ہے جو دیہات کے جاہل اور جامد ماحول میں بسر ہوا تھا۔ اسیطرح ابراہیم عبدالحلیم نے بھی مختلف طبقات میں تقسیم دیہات کے اندر اپنے گذرے ہوئے بچپن کی تصویر پیش کی ہے۔ انکی کتاب "ذکریات الطفولۃ" دیہاتی زندگی طبقاتی کشمکش کی بہترین صورت گری کرتی ہے۔

یادداشت ہی وہ واحد ذریعہ ہے جس پر بچپن کی یادوں کی ترتیب کے سلسلے میں اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ مغربی اور عربی دونوں زبانوں میں یاد ماضی کی واپسی کا یہی بنیادی ذریعہ ہے۔ البتہ کبھی کبھی دوسروں کی روایت کردہ باتوں کو بھی نقل کر دیا جاتا ہے۔ خاص طور سے اس صورت میں جب یہ باتیں نوادر کے ساتھ بتائی جا رہی ہوں۔ دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ جن ادباء کا بچپن اچھے حالات میں نہیں گذرتا ہے وہ بعض نفسیاتی عوامل کی وجہ سے خفگی اور چڑچڑاپن کے شکار ہو جاتے ہیں اور پھر اگر وہ اپنی خود نوشت مرتب کرتے ہیں تو اس میں ان کے مزاج کی پوری عکاسی ہو جاتی ہے۔ طٰہٰ حسین کی کتاب "الأیام" میں یہ مزاج ہر جگہ نمایاں نظر آتا ہے[2]۔

جدید عربی خود نوشت نگاروں نے عہد طفولیت کی جو تصویر کھینچی ہے اسمیں بڑی سنجیدگی، متانت، صبر، استقلال اور شدت ملتی ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ زیادہ تر ادباء کا تعلق متوسط طبقے سے تھا۔ اور واقعی ان کی پرورش کافی دیکھ بھال اور سختی سے کی گئی تھی۔ یہی وجہ

---

[1] یوسف مراد، مبادئ علم النفس، دار المعارف قاہرہ ۱۹۵۳ء۔

[2] طٰہٰ حسین، الأیام، ص ۴۳ - ۱۲۰۔

ہے کہ یہ ادباء صحیح پرورش پانے کی وجہ سے بعد کی کامیابیوں اور کامرانیوں کی منزلوں سے ہمکنار ہوئے۔ طٰہٰ حسین، احمد امین اور عقاد اسی پرورش کے عملی مظاہر تھے۔ ان میں خاص طور سے احمد امین نے اپنے والد محترم کی جس توجہ اور نگرانی کا ذکر کیا ہے وہ بہت کم بچوں کو مل پاتی ہے۔ اسکی بعض تفصیلات ان کی کتاب "حیاتی" میں موجود ہے اور پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے[1]۔

۵۔ سچائی، صاف گوئی اور معروضیت

عربی زبان کے جدید خود نوشت نگاروں کا ایک اہم وصف یہ بھی ہے کہ وہ اپنے یا دوسروں کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے اپنی بساط بھر سچائی، صاف گوئی، امانت داری، وسعت نظری، سائنٹفک تجزیہ اور معروضی مطالعہ پر توجہ دیتے ہیں۔ لیکن چونکہ ماضی کو ہو بہو نقل کر دینا ایک کار مشکل ہے اسلئے دوسری زبانوں کی طرح عربی زبان کے ادباء پر سچائی اور صاف گوئی کے عنصر کی کمی کا الزام لگایا جاتا رہا ہے۔ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ یادداشتوں کو محفوظ رکھنے کے تمام ذرائع بروئے کار لانے کے باوجود بعض کمیاں باقی رہ جاتی ہیں۔ اسمیں قوت حافظہ کی کمزوری کے علاوہ بعض دوسرے عوامل مثلاً فخر و غرور اور پارسائی کا زعم وغیرہ بھی کارفرما ہو جاتے ہیں۔ لیکن ان تمام دقتوں اور مشکلات کے باوجود عربی زبان کے جدید خود نوشت نگاروں کا یہ دعوی ہے کہ انھوں نے اپنی کتابوں میں سچائی، صاف گوئی اور معروضی نظر کا اہتمام کیا ہے۔ اس دعوی کے سو فیصد صحیح ہونے کا امکان تو بالکل معدوم ہے البتہ بعض ادباء کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اپنی خود نوشتوں میں خاص طور سے سچائی وغیرہ کا اہتمام کیا ہے ان میں احمد امین، میخائیل نعیمہ، توفیق الحکیم اور عبد القادر مازنی قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے بھی احمد امین کا معاملہ منفرد ہے۔ وہ اپنے والدین، ازدواجی اور

---

[1] احمد امین، حیاتی ص ۵۲ - ۵۸۔

احباب کے بارے میں بڑی صاف گوئی اور سچائی سے وہ باتیں بیان کرتے جاتے ہیں جو بالعموم لوگ بیان نہیں کرتے۔[1] خاص طور سے معاصرین اور وہ بھی وہ معاصرین جن سے آدمی کے اختلافات ہوں۔ کے بارے میں اظہار کرتے ہوئے بڑی آسانی سے قلم بھٹک جاتا ہے۔ لیکن احمد امین نے طٰہٰ حسین سے اپنے شدید اختلاف کے باوجود ان کا ذکر بڑے اچھے انداز میں کیا ہے اور ان سے تعلقات کے ختم ہونے پر اپنی ندامت اور حیرت کا اظہار کیا ہے۔[2]

اسیطرح کی صاف گوئی اور معروضی انداز بیان میخائیل نعیمہ اور توفیق الحکیم کے یہاں بھی ملتا ہے بلکہ یہ دونوں اس حیثیت سے تمام عرب ادباء میں ممتاز ہیں کہ انھوں نے اپنی زندگی پر جنس کے اثرات کے غلبہ کا اعتراف کیا ہے اور کئی ایک عورتوں سے اپنے غلط تعلقات کی تفصیلات فراہم کی ہیں۔ ان کے علاوہ بھی بعض ادباء نے عورت اور جنس کا تذکرہ کیا ہے لیکن ان کا انداز بالعموم سرسری ہوتا ہے اور اسکی تمام تفصیلات بھی فراہم کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ ایسے ادباء میں خود طٰہٰ حسین اور احمد امین کا بھی نام آتا ہے۔ ان دونوں نے عورت سے آشنائی کے بعض واقعات بیان کئے ہیں لیکن ان کا انداز بیان بالکل سرسری ہے۔

جدید دور کے عرب ادباء میں سے جن پر سچائی اور صاف گوئی کے تعلق سے شدید الزامات ہیں ان میں عباس محمود عقاد اور سلامہ موسیٰ کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ان دونوں نے ہمیشہ اپنے آپ کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور اپنی پوری زندگی میں اپنی تصویر کو کہیں مخدوش نہیں ہونے دیا ہے۔ عقاد کا معاملہ اسمیں اور زیادہ نازک ہے۔ فخر و غرور اور عجب و تعلی سے ان کی پوری خود نوشت بالکل لبریز ہے۔ اس کا اندازہ انکی کتاب کے کئی صفحہ کے مطالعہ سے بخوبی کیا جا سکتا ہے۔[3]

---

[1] احمد امین، حیاتی ص ۲۹۷-۲۹۹ [2] ایضاً ص ۲۹۵-۲۹۷

[3] عقاد کی "انا" پر اس کتاب میں تفصیلی بحث موجود ہے۔

صاف گوئی، صراحت اور سچائی یقیناً ایسے اوصاف ہیں جنکی اہمیت پر کلام نہیں کیا جاسکتا ہے۔ لیکن انسان کو فطری طور سے حیاء و شرم کا جو حصہ ملا ہے اس کا تقاضا ہے کہ وہ اپنے جرائم کا اعتراف دبے الفاظ میں کرے۔ جرائم کے اشتہار اور اعلان سے ان کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے اور دوسروں کو شہ ملتی ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ عرب خود نوشت نگار اپنی تمام تر سچائی کے باوجود بے شرمی اور بے حیائی کا وہ مظاہرہ نہیں کر سکے جو مغربی ادیبوں کے یہاں پائی جاتی ہے۔ ان مغربی ادباء نے تو واقعہ یہ ہے اپنے سیاہ کارناموں کو مزے لے لے کر اس طرح سے بیان کر دیا ہے کہ ان کے مطالعہ سے انسانی سر شرم سے جھک جاتا ہے۔ یہ عجیب معاملہ ہے کہ ان لوگوں کی اس بے حیائی پر انھیں داد دی جاتی ہے۔ حالانکہ یہ انتہائی لائق ملامت عمل ہے۔ ان سے جنسی آوارگی اور اباحیت پسندی کے فروغ کا قوی اندیشہ ہوتا ہے۔ ظاہر ہے اسکی گنجائش خواہ مغرب کی مادہ پرست تہذیب میں کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو مشرق کی انسانیت دوست اور مذہب پسند تہذیب میں ہرگز نہیں ہے

۶- اندرونی تصادم کی تعبیر

کسی خود نوشت سوانح حیات کی بقا اور دوام کا دارومدار زیادہ تر اس بات پر ہوتا ہے کہ اسکے مؤلف نے مختلف نوعیتوں کی کشمکش اور تصادم کو قارئین تک کس مقدار میں منتقل کیا ہے۔ اس مقدار کے ساتھ ہی قارئین کے جذبات کی برانگیختی اور انشراح پذیری کے ساتھ اسکی شرکت اور ہم آہنگی مشروط ہوتی ہے۔ عربی زبان کے جدید ادباء کی ایک قابل ذکر تعداد نے اپنی خود نوشت سوانح حیات میں اس تصادم اور کشمکش کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے خاص طور سے ان خود نوشت سوانح حیات میں جنکی حیثیت فکری یا سیاسی نوعیت کی

ہوتی ہے۔ کیوں کہ ان کے مؤلفین مختلف فکری، روحانی اور نفسیاتی کشمکش سے دوچار ہو چکے ہوتے ہیں۔ ادب و ثقافت اور سیاست و معاشرت کی دنیا میں جب وہ اپنے نئے خیالات لیکر داخل ہوئے ہیں تو انھیں ہر طرف سے عداوتوں اور تنقیدوں کا ہدف بنایا گیا۔ اس کے باعث مختلف محاذوں پر کشمکش اور ٹکراؤ کا ہونا فطری تھا۔ یہ کشمکش چونکہ بیحد شدید تھی اور خود اس کا احساس بھی ان ادیبوں اور مفکروں کو زیادہ تھا اس لئے ان کی خودنوشت سوانح حیات پر سرکشی اور بغاوت کا رنگ غالب آگیا اور اسی لئے بعض ادیبوں میں اپنے ماحول پر اضطراب، بے چینی اور بیگانگی بھی پیدا ہوئی۔ وہ اپنے قدیم ماحول سے اپنے آپ کو مانوس نہیں کر سکے۔[1] بعض دوسرے ادیبوں نے اپنے ماحول سے اجتناب، بدگمانی، ناراضگی، ریب و تشکیک اور استہزا کی روش اختیار کی۔ جیسا کہ طٰہٰ حسین اور مازنی کی تحریروں میں ملتا ہے۔ بعض ادبا نے اپنے ماحول کے بارے میں بہت سخت موقف اختیار کیا اور اسکے رسوم و رواج میں تبدیلی لانے پر اصرار کیا۔ مثلاً لطفی السید اور عبدالعزیز فہمی۔ بعض دوسرے ادبا نے معاشرے کے بالمقابل اپنے آپ کو بلند و بالا ثابت کرنے کی کوشش کی کیونکہ ان کی نظر میں انکے پاس ایسی صلاحیتیں موجود تھیں جو انھیں دوسرے ہم عصروں پر فوقیت عطا کرتی تھیں۔ جیسے سلامہ موسیٰ اور عباس محمود العقاد۔

۷۔ اسلوب کی شخصیت پر دلالت۔

جدید دور کے ادبا کا ایک نمایاں وصف یہ بھی ہے کہ ان کی خودنوشت سوانح حیات کا اسلوب ان کی شخصیت پر دلالت کرتا ہے اور اس سے انکی فکری اور روحانی زندگی کے نقوش ابھر کر سامنے آجاتے ہیں۔ ایسی شکل میں صرف اسکی لغوی استعمالات کے ذریعہ اسکی شخصیت کے خدوخال واضح ہو جاتے ہیں۔ انیسویں صدی عیسوی کے ادبا کا بھی معاملہ کچھ ایسا ہی ہے۔ انھیں

---

[1] بطور مثال ملاحظہ ہو: توفیق الحکیم، زہرۃ العمر ص ۷۱ - ۷۶

سے ہر ایک کا ایک امتیازی وصف ہے اور وہ اسکی شخصیت کے مختلف گوشے اجاگر کرتا ہے۔ بیسویں صدی کے ادباء کے یہاں یہ وصف کچھ زیادہ ہی نمایاں ہے۔ مثلاً احمد لطفی السید، عبدالعزیز فہمی اور محمد حسین ہیکل چونکہ قانون کے آدمی تھے اور فقہ شریعت کے اسرار و رموز سے واقف تھے۔ اس لئے انکے اسلوب میں قانونی رنگ غالب ہے۔ اسمیں تحلیل، تفسیر، تذلیل اور اشتہار کی وہی خوبیاں ملتی ہیں جو عدالتی فیصلوں پر جرح اور بحث کرنے میں درکار ہوتی ہیں۔[1] ان میں لطفی السید کا اسلوب اس حیثیت سے بھی ممتاز ہے کہ اسمیں مزاح اور غیر سنجیدگی کے عناصر بہت کم ملتے ہیں۔ اس سے انکی سنجیدہ اور پروقار شخصیت کیطرف غمازی ہوتی ہے۔ ان ادباء کے علاوہ شکری، عقاد اور توفیق الحکیم کے اسلوب پر غور کرنے سے بھی کچھ ایسے ہی نتائج سامنے آتے ہیں۔ مثلاً شکری کے اسلوب میں شدت اور انفعالیت ہے۔ اس سے انکی مضطرب شخصیت ابھر کر سامنے آتی ہے۔[2] عقاد کے اسلوب میں منطقی جدل، عقلی احتجاج اور دقیق تحلیل ملتی ہے۔ وہ بلند و بالا الفاظ کے انتخاب میں بھی مہارت رکھتے ہیں۔ اس سے انکی فکری شخصیت کے خدوخال ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ توفیق الحکیم کے اسلوب میں موجز عبارت اور قلیل الفاظ پر ملتا ہے۔ اس سے انکی فکری شخصیت کے نقوش ابھرتے ہیں جو تجدید اور اختصار کو حد سے زیادہ پسند کرتی ہے۔ یہی معاملہ طٰہٰ حسین، احمد امین، سلامہ موسیٰ اور میخائیل نعیمہ کا بھی ہے۔[3] ان سب کے اسلوب میں کچھ خوبیاں ہیں جو ان کی شخصیت کی ترجمانی کرتی ہیں۔

---

[1]، [2]، [3] : ان جدید ادباء کا اجمالی یا تفصیلی تعارف اس مقالے میں موجود ہے۔

باب چہارم

فصل اول : ۱۹۵۲ء سے قبل

مطبوعہ چند اہم عربی خود نوشت سوانح حیات

الایام

طٰہٰ حسین

طٰہٰ حسین کی خود نوشت سوانح عمری "الایام" جو صرف بچپن سے لیکر جوانی تک کے حالات پر مشتمل ہے اپنی گوناگوں خصوصیات کی وجہ سے بہت مقبول سوانح عمری شمار کی جاتی ہے۔ دنیا کی کئی مؤثر زبانوں میں اسکا ترجمہ کیا گیا ہے اور لاکھوں نسخے بازار میں فروخت ہو چکے ہیں۔ کتاب کی اشاعت پر نصف صدی گزر جانے کے باوجود اس میں نہ کہیں قدامت کا گمان ہوتا ہے اور نہ اس کی شہرت و مقبولیت میں کوئی کمی واقع ہوئی ہے۔

آپ بیتی سے ہٹ کر یہ کتاب ایک نئے اسلوب میں لکھی گئی ہے۔ دراصل یہ ایک طویل قصہ ہے جو باپ اپنی بیٹی کو سنا رہا ہے۔ داستان قصہ گو کی ہے لیکن اس نے پورا قصہ صیغۂ غائب میں لکھا ہے[1]۔ اس میں انھوں نے پیدائش، گھریلو ماحول، ماں باپ اور بھائی بہن کا اس کے ساتھ سلوک، گاؤں کے حافظ جی سے قرآن پاک کی شروعات، مدرسہ کی مشغولیت، حافظ جی کا تمسخر آمیز اور مضحکہ خیز تعارف، تکمیل حفظ قرآن کے بعد امتحان، پھر مدرسہ میں اسکی ناکامی کی خفت، حافظ جی کی ڈانٹ پھٹکار، مدرسہ کے مانیٹر کی نگرانی میں آموختہ کا اعادہ، ازہر میں داخلہ کی تیاری، اس کے لئے ایک دوسرے شیخ سے رابطہ، ازہر کا طریقہ تعلیم، رہائش اور ازہر کے ماحول اور نظم و انصرام پر تبصرے بڑے موثر، دلچسپ اور دلنشین انداز میں بیان کیا ہے۔ یہ کتاب کسی راجہ رانی کی کہانی نہیں بلکہ خود مصنف کی آپ بیتی ہے۔ اس درمیان اسکو جو بڑی بڑی مصیبتوں سے گزرنا پڑا، جو کچھ دیکھا اور سمجھا اور ان کے بارے میں اپنی جو رائے قائم کی ان سب کی تفصیلات اس نے بڑی جرأت

---

[1] عبد المحسن طٰہٰ بدر، تطور الرواية العربية الحديثة في مصر ص ۳۲، دار المعارف مصر ۱۹۷۰ء

وبے باکی سے بڑے پرزور اور لطیف انداز میں بیان کیا ہے[1]۔ مؤلف کی زندگی کا سب سے بڑا دردناک حادثہ بینائی کا ضائع ہونا ہے اس عظیم نعمت سے محرومی کا ان کو شدید احساس تھا اور اسے بڑے کربناک انداز میں بیان کیا ہے[2]۔

طٰہٰ حسین کے قلم کے بارے میں یہ بات بیحد مشہور ہے کہ وہ جرأت اور بے باکی میں اپنی مثال آپ تھا۔ اور واقعہ بھی یہی ہے۔ اپنی دوسری تصنیفات میں دینی اور ملکی مسائل پر انھوں نے جو افکار اور خیالات پیش کئے ہیں ان کی وجہ سے اس صدی کے نصف اول میں کافی ہنگامہ آرائی ہو چکی ہے۔ اپنی خود نوشت میں بھی ان کا انداز بیان اور اسلوب تعبیر تقریباً ویسا ہی رہا۔ انھوں نے اس میں بڑی سے بڑی بات کہہ دینے میں کوئی جھجھک محسوس نہیں کی۔ ماں باپ، اساتذہ، شیوخ، علماء الغرض جس کے بارے میں جو کہنا چاہا کہہ دیا۔ موسم سرما کی آمد پر ان کے دادا کے اوپر دینداری کا جو ماحول طاری ہو جاتا تھا اس پر بھی انھوں نے اپنی ناگواری کا اظہار کیا ہے اور اس کا مذاق اڑایا ہے[3]۔ اپنے استاد حافظ جی کی عادات و اطوار کو مختلف مقامات میں انتہائی تمسخر آمیز انداز میں تبصرہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ اپنی کلاس کے مانیٹر، ہوسٹل کے نگراں اور دوسرے احباب و اساتذہ اور اعزہ و اقارب کی حرکتیں اور اعمال مزے لے لے کر بیان کیا ہے۔ اور ہر ایک کی نقل اتاری ہے[4]۔ اس طرح یہ کتاب طٰہٰ حسین کے اپنے مزاج، طبیعت اور نفسیات کی بہترین ترجمان بن گئی ہے۔ چونکہ ان کا بچپن عسرت اور تنگی میں بسر ہوا تھا۔ گھر کا ماحول روایت پسند اور دینی امور میں تشدد کا قائل تھا۔ اور خود قدرت کی طرف سے بعض نعمتیں ودیعت نہیں کی گئی تھیں۔ اس لئے ان سب کا ان کی شخصیت پر اثر پڑا تھا اور وہ منفی رجحان اور انفعالی کیفیت میں ہمیشہ کے لئے گرفتار ہو گئے تھے۔ اس کا اظہار دوسری تحریروں کی طرح "الایام" میں بھی جگہ جگہ ہوا ہے[5]۔

---

[1] طٰہٰ حسین، الایام، دار المعارف ۱۹۳۳ء، [2] ایضاً ج ۱ ص ۱۵۔ [3] ایضاً ص ۲۲۔

[4] ایضاً ج ۱ ص ۲۸، ج ۲ ص ۱۲۰، ۱۲۳۔ [5] مجلۃ المجمع العلمی الھندی ج ۱ ص ۱۸۶۔

تاہم اس کے باوجود طٰہٰ حسین کی یہ کتاب جدید عربی خود نوشت سوانح عمریوں میں اپنی گوناگوں اور نوع بنوع خصوصیات کی وجہ سے امتیازی شان کی مالک ہے۔ انھوں نے اس میں اپنی تعلیم و تربیت کے عوامل و اسباب، اس میں ماحول کی کارفرمائی، اپنی زندگی کے اہم تجربات و حادثات اور اپنی زندگی میں پیش آمدہ امور و مسائل پر بڑی دیانت داری، سچائی اور معروضی انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ یہ کتاب عربی زبان میں عہد طفولیت کی تصویر کشی کے باب میں ایک نابلِ نمونہ کوشش تصور کی جاتی ہے۔ سچائی اور صاف گوئی کا عالم یہ ہے کہ اسکا مصنف اپنے نقائص اور عیوب کے اظہار میں بھی کوئی جھجک محسوس نہیں کرتا ہے۔ حتیٰ کہ اپنے عشق و معاشقے کی بعض داستانیں بھی قلمبند کر جاتا ہے۔ اپنی ان خصوصیات کی بنیاد پر یہ کتاب شہرت اور مقبولیت کے اُس اعلیٰ مقام تک پہنچی جو اس کے علاوہ دوسری ہم موضوع کتابوں کو نصیب نہیں ہو سکا۔[1] اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اس کے تعلق سے ادباء و ناقدین نے سب سے زیادہ دلچسپی کا اظہار کیا ہے۔ اور اس کے مضمون، مواد اور اسلوب پر ہر پہلو سے کھل کر تبصرہ کیا ہے۔ چنانچہ انیس المقدسی اپنی کتاب "الفنون الأدبیہ" میں لکھتے ہیں :-

"طٰہٰ حسین واقعات بیان کرتے وقت فنی خوبیوں کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے اس لئے الایام کو طٰہٰ حسین کا شاندار کارنامہ اور بہترین قصہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ الفاظ و عبارت کی وضاحت کے ساتھ ساتھ ان میں نزاکت و لطافت کا ایک خاص ملکہ ہے جو ان کی تحریر کو سحر حلال کے زمرہ میں لا کھڑا کرتا ہے۔ اس سحر حلال کے بنیادی عناصر کا تجزیہ اگرچہ مشکل ہے البتہ ناقدین ادب نے زمانہ قدیم ہی سے اس کو حسن بیان، بھرپور رعنائی اور اشراق دیباچہ سے تعبیر کیا ہے"[2]

---

[1] Modern Arabic literature. J. A. Hayood pp. 195

[2] انیس المقدسی، الفنون الادبیۃ ص ۵۱۰ .

اور ڈاکٹر احسان عباس اس کے فنی اسلوب پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

" میری رائے میں " الایام " کو خود نوشت سوانح حیات کی حیثیت سے وہ مقام حاصل ہے جو دوسری سوانح حیات کو حاصل نہیں ہے۔ خصوصاً اس کا جزء اول متعدد خوبیوں کا حامل ہے۔ فصلوں میں انکا حسین وجمیل انداز اور خوبصورت اسلوب ان کی رگ و پے میں چھپے ہوئے جذبوں کو عیاں کرتا ہے "[1]

اس کتاب کے بارے میں ڈاکٹر شوقی ضیف نے اپنے گرانقدر خیالات کا اظہار اس طرح کیا ہے :-

" یہ دقیق خود نوشت سوانح عمری عربی زبان میں نفیس و نادر سوانح عمری شمار کی جاتی ہے۔ کیونکہ اس کے مصنف نے اس میں اپنے اور مصری ماحول کو ہر زاویہ سے پیش کیا ہے خواہ شہری ماحول ہو، یا دیہات و مدرسہ کا ماحول ہو، مسجد کا ہو یا ازہر کا ہو، جامعہ کا ہو یا جامعہ کے اساتذہ کا۔ انھوں نے یہاں وہاں ہر جگہ کے ماحول کا نقشہ فنی انداز میں کھینچا ہے "[2]

---

[1] احسان عباس، فن السیرۃ ص ۱۲۲ ۔

[2] شوقی ضیف، الترجمۃ الشخصیۃ ص ۱۲۰ ۔

حیاتی

احمد امین

احمد امین کی خود نوشت سوانح حیات "حیاتی" دراصل ان کی ان یادداشتوں کا مجموعہ ہے جو وہ وقتاً فوقتاً لکھ لیا کرتے تھے۔ بعد میں انھیں یادداشتوں کو انھوں نے کتابی شکل دے دی۔[1] انھوں نے اس میں بچپن، گھر، خاندان، والدین، اعزہ و اقربا، ابتدائی مدارس، جامعہ ازہر، دوست و احباب، اساتذہ، سفرنامے، علمی ارتقا، تجربات، ملازمت، مرض الغرض تمام چیزوں کو انتہائی سلیس اور دلنشیں انداز میں بیان کر دیا ہے۔ اس کتاب کا ہر اقتباس پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ان کا انداز بیان ملاحظہ کرنا ہو تو درج ذیل پیراگراف کا مطالعہ کافی ہوگا۔ یہ پیراگراف انھوں نے اپنے ایک عربی شیخ عبدالحلیم سے ملاقات اور ان سے اخذ و استفادہ کی تفصیلات بیان کرنے کے بعد لکھا ہے:—

"ان کی ملاقات نے میری خامیوں کو دور کر دیا۔ میرے نفس میں وسعت پیدا کر دی۔ اور میرے افق کو روشن کر دیا۔ میں کتاب کے علاوہ کوئی دوسری چیز نہیں جانتا تھا۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ دنیا کتاب میں نہیں ہے۔ مجھ پر غنودگی طاری تھی۔ انھوں نے مجھے بیدار کر دیا۔ میں اندھا تھا انھوں نے مجھ کو بصیرت بخشی۔ اور میں تقلید کا عادی تھا۔ انھوں نے مجھے حریت فکر اور آزادی رائے سے روشناس کرایا۔"[2]

پوری کتاب اسی انداز میں لکھی گئی ہے۔ احمد امین کی علمی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ فی الواقع یہ کتاب ان کی اسی علمی شخصیت کی تاریخ ہے۔ اس کا ہر صفحہ مطالعہ کرنے کے

---

[1] احمد امین، حیاتی، ص ۶ - ۷، مکتبۃ الآداب قاہرہ ۱۹۵۲ء۔

[2] ایضاً ص ۷۶ - ۷۸۔

لائق ہے۔ اس میں بیک وقت عقل کی چمک دمک، جذبات کا اضطراب اور فن کی رنگ آمیزیاں شامل ہیں۔

یوں تو احمد امین کی خود نوشت میں بہت سی خوبیاں ہیں لیکن اپنی تربیت کے ضمن میں کار فرما موروثی اثرات اور ماحول کے اثرات کی تشریح، عہد طفولت کے واقعات کی منظر کشی اور صدق و صراحت اور معروضی انداز میں انھوں نے اپنے کمال اور دسترس کا سکہ تقریباً ہر ایک پر بٹھا لیا ہے۔ ماحول اور وراثت کے بارے میں ان کی یہ وضاحت کس قدر پیاری لگتی ہے کہ "وہ جو کچھ ہیں سب کچھ اللہ تعالیٰ کے قانون وراثت اور کے تحت ہوئے ہیں"۔ انھوں نے اپنی نمایاں صفات مثلاً سنجیدگی، چشم کی کمزوری، صبر، استقامت، خوشی کے بالمقابل غم کے عوامل کا غلبہ، ایمان باللہ، قوت گویائی، اسلوب بیان، سادگی اور تکلفات سے دوری۔ الغرض ہر خصوصیت کو ماحول یا اپنے والدین کی طرف منسوب کیا ہے۔[1] اپنی فکری تربیت میں موروثی اثرات کے عمل دخل پر انھیں اس قدر ایمان تھا کہ وہ یہاں تک لکھ گئے "ہم تو محض اپنے آباء و اجداد کی نئی شکلیں ہیں جو ہمارے اجسام و نفوس میں حلول کر گئے ہیں"۔[2]

انھوں نے اپنے عہد طفولت کی جو تصویر کھینچی ہے اس میں سنجیدگی، متانت اور وقار معلوم ہوتا ہے۔ بلاشبہ ان کی پرورش ایک دیندار اور روایت پسند خاندان میں ہوئی تھی اس لئے ان کی بہترین تربیت کے پیش نظر انھیں کھیل کود کے مواقع بہت کم دیئے گئے۔ اور شروع سے رسوم و روایات کی پابندی اور پاسداری پر مجبور کیا گیا۔ احمد امین نے خاص طور سے اپنے والد کی سختیوں کا تذکرہ کیا ہے۔ دیگر تفصیلات کے علاوہ وہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ جمعرات کی شام اور جمعہ کے دن انھیں تھوڑی سی فرصت ملتی تھی۔ کبھی کبھی جمعہ کے دن بھی ہوم ورک کی کثرت ہو جاتی تھی۔

---

[1] احمد امین، حیاتی ص ۱۱ — ۱۵

[2] ایضاً ص ۱۶۶۔

والد صاحب کی سختیوں سے بچنے کیلئے یہ بار بار بیماری کا سہارا لیتے تھے۔ لباس وغیرہ میں ان کی سختی کا یہ عالم تھا کہ انھیں بچپن ہی میں اعمہ اور عمامہ پہنا دیا گیا۔ لوگ اس لباس میں انھیں بوڑھا سمجھنے لگے تھے[1]

سچائی، صاف گوئی، غیر جانبداری اور معروضی طرز بیانی خود نوشت سوانح عمری کی اہم خوبیاں ہیں۔ احمد امین ان خوبیوں سے متصف تھے۔ وہ اپنی سوانح میں ان صفات کا اس حد تک پاس و لحاظ رکھتے ہیں کہ کبھی کبھی جبار دیواری کے خفیہ راز بھی ظاہر کر جاتے ہیں۔ مثلاً انھوں نے اپنے والد اور والدہ کے درمیان عدم مطالعت اور غیر ہم آہنگی کا ذکر کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ "ان کی والدہ ان کے والد کی سختیوں کی وجہ سے ہمیشہ غمگین رہتی تھیں۔ جب یہ ان کے رحم میں تھے اس وقت خاص طور سے تعلقات کشیدہ تھے۔ ان کی کشیدگی اور افسردگی کا اثر ان کے مزاج وغیرہ پر مرتب ہوا۔ اور یہ بھی افسردہ و غمگین رہتے ہیں"[2] اس کے علاوہ انھوں نے اپنے اوپر اعتماد کی کمی، بڑھاپے میں بعض اخلاقی خوبیوں میں تنزل اور اپنی ازدواجی زندگی کے بعض ناخوشگوار پہلوؤں کی طرف بھی واضح اشارات دیئے ہیں۔[3]

یہ احمد امین کی خود نوشت کا ایک اجمالی تعارف تھا۔ ورنہ سچ بات تو یہ ہے کہ یہ خود نوشت جدید عربی زبان کی ایک مکمل، بھرپور اور علمی و فنی خوبیوں پر پوری اترنے والی خود نوشت سوانح حیات ہے۔ اس کی اہمیت اور افادیت ہی کی وجہ سے اس پر عربی اور غیر عربی زبان کے ادباء اور ناقدین نے اظہار خیال کیا ہے۔ اور اسے خراج تحسین پیش کیا ہے۔ چنانچہ عربی زبان کے مشہور ادیب اور نقاد انیس المقدسی اس کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"احمد امین کی یہ کتاب انتہائی شاندار اسلوب، نادر وصف اور سچے لہجے میں منظر عام پر آئی ہے۔ مطالعہ کرنے والا جب ان کا مطالعہ

---

[1] احمد امین، حیاتی ص ۵۲ - ۵۴ [2] ایضاً ص ۲۹۹

[3] ایضاً ص ۳۵۶ - ۳۵۹.

کرتا ہے تو وہ دیکھتا ہے کہ مؤلف کی پرورش، پرداخت، نشو ونما اور مختلف مراحل کا ارتقا کیسے مکمل ہوا۔ اور کیسے اس دنیائے علم و ادب میں ایک شاندار مقام بنا لیا۔"[1]

"حیاتی" کے بارے میں ایک عام خیال یہ ہے کہ اس کی تربیت و تدوین میں ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی کتاب کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ دونوں کی سیرت میں کافی مشابہت ہے۔ دونوں کی پرورش ایک ایسے ماحول میں ہوئی جس پر جدید تہذیب و تمدن کی روشنی نہیں پڑی تھی۔ دونوں نے پہلے ازہر میں تعلیم حاصل کی اور جبہ و عمامہ پہنا۔ لیکن پھر اسے اتار پھینکا اور مغربی زندگی اختیار کر لی۔ پھر دونوں نے آخیر عمر میں اپنی زبان اور اپنی قوم کی گراں قدر خدمات انجام دیں۔ لیکن دونوں کی سیرت میں اشتراک کے باوجود طرز تالیف اور بعض دیگر امور میں کافی تفاوت ہے۔ احمد امین نے علمی اسلوب میں بات پیش کی ہے اور طٰہٰ حسین نے شعری اسلوب میں۔ دراصل دونوں کی طبیعت اور مزاج کافی فرق تھا۔ طٰہٰ حسین زندگی اور اس کے ہنگاموں سے ربط و تعلق قائم کر کے رہنا پسند کرتے تھے اور احمد امین زندگی سے بھاگتے تھے۔[2] اس لئے پروفیسر عربی ادب کے ایک مورخ انور الجندی اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں:-

"احمد امین اپنی زندگی کے واقعات کو ایک سچے مورخ کی طرح پیش کرتے ہیں۔ انھیں اس سے کوئی مطلب نہیں ہوتا کہ عبارت کی خوبصورتی اور حسن باقی ہے یا نہیں؟ جبکہ طٰہٰ حسین پہلے زندگی کے کچھ واقعات کو لیتے ہیں پھر ان کی ملمع کاری کرتے ہیں اور انھیں آراستہ کر کے پیش کرتے ہیں۔"[3]

---

[1] انیس المقدسی، الفنون الادبیۃ ص ۵۶۰ - ۵۶۱۔

[2] انور الجندی، اضواء علی الادب العربی المعاصر ص ۷۲ [3] ایضاً ص ۷۳۔

عربی زبان کے ایک دوسرے ادیب احمد حسن زیات دونوں کتابوں کے بارے میں اپنا تاثر یوں ظاہر کرتے ہیں :-

"میں "حیاتی" کو پڑھ کر وہی لذت محسوس کرتا ہوں جو مجھے "الایام" کو پڑھ کر ہوئی تھی ..... اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ دونوں کتابیں ایک ہی طرز پر لکھی گئی ہیں بلکہ اسکا مطلب یہ ہے کہ دونوں اسلوب اور فن کے علاوہ کسی دوسری چیز کے علاوہ ہمارے دلوں اور احساسات کو موہ لیتی ہیں۔ میرے نزدیک یہ چیز نفسانی جمال، صراحت اور تفصیل ہے"[1]

احمد امین کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ انشا پرداز نہیں تھے بلکہ وہ ایک عالم، مؤرخ اور ادیب تھے۔ ان کی کتاب "حیاتی" پر بھی مذکورہ قول کا اطلاق ہوتا ہے۔ انھوں نے اس میں سنجیدگی، وقار، علمیت اور تاریخ نویسی کو پوری طرح ملحوظ رکھا ہے۔

---

[1] احمد حسن زیات ج ۳ ص ۲۱۱ - ۲۱۲، مکتبۃ النہضۃ المصریۃ قاہرہ ۱۹۵۵ء

مذکرات
محمد حسین ہیکل

محمد حسین ہیکل کی یہ کتاب مصری سیاست پر مشتمل ہے۔ اسے انھوں نے اپنی یادداشتوں کی بنیاد پر ترتیب دیا ہے۔ یہ دو جلدوں پر مشتمل ہے[1]۔ پہلے حصے میں مصری تاریخ کے ۱۹۱۲ء سے ۱۹۳۷ء تک کے حالات و واقعات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ یہ تقریباً ربع صدی کا زمانہ ہے۔ اس کے دوسرے حصے میں ۱۹۳۷ء سے ۱۹۵۲ء تک کے حالات و واقعات قلمبند کئے گئے ہیں۔ پہلے حصے میں ابھی مؤلف کی سیاسی زندگی کا آغاز ہوا ہے۔ وہ فرانس سے واپسی کے بعد پیشہ وکالت سے منسلک ہونے کے باوجود سیاسی امور میں دلچسپی لینے لگے تھے۔ پھر وہ وکالت سے علیحدہ ہو کر اپنی سیاسی جماعت کے ترجمان اخبار "السیاسۃ" کے مدیر ہو گئے اور پندرہ سال تک یہ فریضہ انجام دیتے رہے۔ اسکی تفصیلات بھی پہلے حصہ میں مذکور ہیں۔ دوسرے حصہ میں مؤلف کی سرگرم سیاسی زندگی کی تفصیلات مذکور ہیں۔ خود مصر کے حالات بھی بدل چکے تھے۔ اب وہ ایک حد تک آزاد ہو چکا تھا۔ اس مرحلے میں مؤلف کو پارلیمنٹ کی ممبرشپ اور وزارت میں شمولیت کا موقع بھی ملا۔

اس کتاب میں مؤلف نے سیاسی اور سماجی امور و مسائل کے علاوہ اپنی سوانح بھی بیان کی ہے۔ چنانچہ اپنی پرورش، اپنے گاؤں، مصر میں تعلیم و تربیت، فرانس کا سفر، وہاں سے واپسی، پیشہ وکالت کا آغاز اور اختتام اور دیگر اہم مراحل زیست سے اپنے قارئین کو واقف کیا ہے۔ اس میں ان شخصیات کا خصوصی تذکرہ ہے جنھوں نے مؤلف کی تعمیر و تشکیل میں حصہ لیا تھا۔ تاہم اس کتاب کا

---

[1] محمد حسین ہیکل، مذکرات فی السیاسۃ المصریۃ، مکتبۃ النہضۃ قاہرہ ۱۹۵۱ء

اصل موضوع جیسا کہ نام سے واضح ہے مصری سیاست ہے۔ اس لئے یہی پہلو پوری کتاب پر غالب ہے مؤلف چونکہ مصری سیاست میں بیحد سرگرم تھے جس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی پارٹی کے ترجمان اخبار کے مدیر تھے۔ خود ایک مختصر مدت کے لئے انھیں اپنی پارٹی کی صدارت کا موقع بھی ملا۔ اس لئے اس کتاب کو بیحد اہمیت دی گئی اور اسے مصری سیاست سے واقفیت کا ایک اہم مأخذ تسلیم کیا گیا ہے۔ لیکن یہ کتاب صرف سیاسی امور و مسائل کی حد تک ہی مفید ہے۔ اس میں مصر کی سماجی، معاشی اور ثقافتی صورتحال پر بہت کم روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کی وجہ جہاں ایک یہ ہے کہ یہ امور اس کتاب کے موضوع سے خارج تھے وہیں دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ اس کتاب کے مؤلف کی زندگی کا بیشتر حصہ سیاست میں گزرا تھا اور سیاست ہی اسکا اوڑھنا بچھونا تھی۔

حسین ھیکل اپنے مذاکرات کی ابتدا ہی میں یہ وضاحت کرتے ہیں کہ وہ اس کتاب میں کسی مخصوص رائے یا نظریہ کی تائید نہیں کریں گے بلکہ وہ تمام واقعات کے بارے میں ایک غیر متعصب مؤرخ کا رویہ اختیار کریں گے۔ وہ مختلف مواقف کا تجزیہ کرتے ہوئے ہر فریق کے زاویۂ نظر کو ایمانداری سے نقل کریں گے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:-

"میرا معمول ہے کہ میں حق کی تلاش کرتا ہوں پھر اس کی اتباع کرتا ہوں خواہ اس کے نتائج کچھ بھی ہوں۔ چنانچہ یہ مذاکرات مختلف حادثات و واقعات کی سچی تصویر پیش کرتے ہیں۔ میں نے اپنی بساط بھر یہ کوشش کی ہے کہ یہ تصویر دقیق اور مبنی بر حق ہو۔"[1]

انھوں نے اس کتاب کے مقدمے میں تفصیل سے اپنا طریقہ بحث واضح کیا ہے وہ بہت زور دیکر کہتے ہیں کہ وہ زندگی کے مختلف مراحل میں ہمیشہ ایک مخصوص ذاتی موقف کے حامل

---

[1] محمد حسین ھیکل، مذکرات، ج ۱ ص ۴-۵

رہے۔ وہ کبھی کسی دوسرے شخص کے موقف سے متاثر نہیں ہوئے۔ یہاں تک کہ اپنی پارٹی کے اصولوں سے بھی جس پر وہ ایمان لائے تھے۔ وہ مقدمے کے علاوہ کتاب کے دوسرے مقامات میں بھی اپنی آزادیٔ رائے اور انفرادیت کا دعویٰ کرتے ہیں۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ چونکہ انھوں نے یہ کتاب اس کے اندر منقول واقعات و حادثات کے رونما ہونے کے طویل عرصہ گزر جانے کے بعد لکھی ہے۔ ان کے درمیان تیس سال یا اس سے کچھ کم یا زیادہ کا فاصلہ ہے اس لئے ان واقعات سے جذباتی ہم آہنگی ختم ہوگئی ہے۔ اور ان کے بارے میں حقیقت پسندی کا زیادہ امکان ہے[1]۔ اب وہ ایک مؤرخ کی طرح معروضی انداز بیان اختیار کریں گے۔ انھوں نے اپنی اس بات کو ثابت کرنے کے لئے اپنی کتاب میں ایک سے زائد مقامات پر مختلف مسائل میں پارٹی مؤقف سے ہٹ کر ذاتی موقف اختیار کرنے اور پیش کرنے کا حوالہ دیا ہے۔ وہ اختلاف رائے کو ہر فرد کا بنیادی حق سمجھتے ہیں۔ اور اسے دوستی اور تعلق کے ختم ہونے مترادف نہیں سمجھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ وطن کی خدمت کا میدان ہر فرد اور ہر نظریے کیلئے بالکل کھلا ہوا ہے[2]۔ ہر ایک کو وطنی مصالح کیلئے کام کرنا چاہئے اور اگر اس کی کوئی رائے وطن کے مفاد میں ہو تو اسے پارٹی رائے پر ترجیح دینا چاہئے۔

لیکن ان تمام دعاوی اور اصول و ضوابط کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ وہ اپنی پارٹی کے اثرات سے اپنے آپ کو آزاد نہیں کر سکے اور پارٹی سیاست ان کے افکار پر اثر انداز ہوتی رہیں۔ یہ صحیح ہے کہ انھوں نے آزادیٔ رائے، دستور اور قوم کے حقوق کی مدافعت کی لیکن اس کے باوجود وہ اپنے افکار میں اپنی پارٹی کی فکر اور نظریے سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ خاص طور سے اس وقت کے افکار میں جب وہ اخبار "السیاسۃ" کے مدیر تھے۔ ان کی فکر پر پارٹی سیاست کی کارفرمائی کا اندازہ ان خیالات سے ہو سکتا ہے جو سعد زغلول اور ان کی پارٹی کے بارے میں انھوں نے ظاہر کئے ہیں۔ اس میں

---

[1] محمد حسین ہیکل، مذکرات ج ۱ ص ۵ – ۶

[2] ایضاً ص ۲۲۔

عصبیت اور جارحیت کا پوری طرح غلبہ ہے۔[1]

ان کا انداز بیان سیاسی مقالہ نگاری جیسا ہے اس میں تفسیر، تحلیل اور تعلیل سب کچھ ہے۔ مصیکل کو فن مقالہ نگاری میں پہلے سے دسترس حاصل تھی۔ بہ لطفی السید کی عدم موجودگی میں ان کے اخبار "الجریدہ" کے افتتاحی کلمات لکھتے تھے۔ پس اس طرح فطری طور پر ان کے مذاکرات طویل سیاسی مقالات پر مشتمل ہیں۔ ہر مقالے کا نام انھوں نے "فصل" رکھا ہے۔ اور ہر دو فصلوں کے بیچ انھوں نے ربط قائم کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ مذاکرات کل دس فصلوں پر مشتمل ہیں۔ اس میں زمانی ترتیب کا پورا لحاظ کیا گیا ہے۔ ہر فصل میں ایک مخصوص سیاسی مسئلے سے بحث کی گئی ہے۔

اپنے مذاکرات میں ربط قائم کرنے کی شدید خواہش اور کوشش کے سبب یہ ایک منظم اور مستحکم و مربوط کتاب بن گئی۔ اپنے اس وصف کی وجہ سے یہ اپنے زمانے کی دوسری خود نوشت عربوں سے بہت آگے نکل جاتی ہے۔ اس کتاب کو اس حیثیت سے بھی امتیاز حاصل ہے کہ اس میں واقعات و مواقف کے بیان میں زمنی تدریج کا پورا خیال رکھا گیا ہے۔ حالانکہ یہ کتاب زیادہ تر حافظے کی مدد سے لکھی گئی تھی۔ اور اس میں اخبارات وغیرہ سے بہت کم مدد لی گئی تھی۔ اس کے مؤلف کی کوشش تو یہی تھی کہ بے جا تکرار اور تفصیل سے گریز کریں۔ لیکن کہیں کہیں پارٹی مصالح کے پیش نظر بعض ایسی تفصیلات بیان کر جاتے ہیں جن سے واقعات کے تسلسل میں خلل پڑتا ہے اور اس کے اجزاء میں بے ربطی پیدا ہوتی ہے۔ یہ کتاب اس حیثیت سے بھی ممتاز ہے کہ اس کے واقعات میں معروضی انداز بیان اختیار کیا گیا ہے لیکن ساتھ ہی اس کے مؤلف نے ان واقعات کے ضمن میں اپنی نفسیاتی کیفیت اور دلی حالت کا بھی ذکر کر دیا ہے۔[2]

محمد حسین مصیکل نے ان مذکرات میں اپنے اور دوسروں کے درمیان بہت سے

---

[1] محمد حسین مصیکل، مذکرات ج ۱ ص ۱۱۹ - ۱۲۳، ص ۱۷۰ - ۱۷۳۔

[2] بطور مثال ملاحظہ ہو۔ مذکرات ج ۲ ص ۱۹۰ - ۲۰۱

مکالمات بیان کر دیتے ہیں۔ ان سے پورے واقعے کی حقیقی صورتحال واضح ہو جاتی ہے۔ گویا وہ ایک مؤرخ کی طرح صرف اثبات اور تقریر ہی پر اعتماد نہیں کرتے بلکہ وہ ایک ادیب کی طرح تحلیل اور تصویر سے بھی کام لیتے ہیں۔ اس کی وجہ سے اور بعض دوسرے عوامل کی وجہ سے ان کے مذکرات کو خود نوشت کی اوّل قسم میں کامل کیا جا سکتا ہے۔ بلاشبہ اس سے ان کی شخصیت کے مختلف مراحل اور اس پر رونما ہونے والے تغیرات وغیرہ کا علم ہو جاتا ہے۔

لہ بلور رنال ملاحظہ ہو۔ محمد حسین ہیکل، مذکرات ج ۱ ص ۱۹۲ - ۲۱۰، ج ۲ ص ۲۲۲-۲۲۳

مذکرات کرد علی

کرد علی کی مکمل سوانح حیات ان کی کتاب "خطط الشام" اور "مذکرات" سے مل کر بنتی ہے۔ "خطط الشام" کے آخیر میں انھوں نے اپنے احوال قلمبند کر دیئے ہیں[1]۔ علامہ ابن خلدون کی طرح انھوں نے بھی اپنی کتاب کے آخیر میں اپنی سوانح لکھ دی ہے۔ لیکن یہ بیحد مختصر اور چند صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کی تفصیل ان کی کتاب مذکرات میں آگئی ہے۔

کرد علی نے دوسرے خود نوشت نگاروں کی طرح اپنے لقب، حسب و نسب، خاندان گاؤں، ابتدائی تعلیم، اہم واقعات زندگی، نمایاں کامیابیاں اور دیگر ضروری تفصیلات بیان کر دی ہیں وہ اپنی خاندان کا اصل تعلق شمالی عراق کے ایک شہر "سلیمانیہ" سے بتائے ہیں[2]۔ اپنے زمانے کی نسلی اور قومی تحریکوں سے متاثر ہو کر وہ اپنے کرد ہونے اور آریائی نسل سے متعلق ہونے پر فخر و مباہاۃ کا اظہار کرتے ہیں۔ اپنی تعلیمی زندگی کی ضروری تفصیلات بتانے کے ساتھ ساتھ انھوں نے خاص طور سے اس پر زور دیا ہے کہ وہ ابتداء ہی سے غیر ملکی زبانیں سیکھنے کیلئے کوشاں تھے۔ چنانچہ انھیں ان میں کامیابی ملی اور وہ اسطرح مغربی تہذیب، علوم اور افکار سے براہ راست مستفید ہو سکے

خود نوشت کی تردید میں سب سے اہم مسئلہ نسیان کا ہوتا ہے۔ زندگی کے بہت سے اہم واقعات خاص طور سے بچپن کے واقعات اس کی وجہ سے دائرہ تحریر میں نہیں آپاتے۔ لیکن کرد علی کا یہ کمال ہے کہ انھوں نے اپنی کم عمری کی بہت سی باتیں نقل کی ہیں۔ جن میں پانچ چھ سال کی عمر کی یادیں بھی ہیں[3]۔

---

[1] کرد علی، خطط الشام، مطبعۃ المعید بدمشق ۱۹۲۹ء۔ ص ۲۱۰ - ۲۶۵۔

[2] کرد علی، مذکرات، مطبعۃ الترقی بدمشق ۱۹۴۹ء۔ ج ۱ ص ۵ [3] ایضاً ص ۱۰

کرد علی کے اندر اپنے وطن کی محبت اور الفت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ ہمیشہ عربوں کے مفاد کیلئے کام کرتے رہے۔ اور کبھی غیر ملکی طاقتوں کے آلہ کار نہیں بنے۔ حالانکہ انھیں کئی بار خریدنے کی کوششیں کی گئیں۔ غیر ملکی طاقتوں میں انھیں کسی حد تک ترکوں سے الفت تھی۔ انھوں نے ان کے لئے کچھ کام بھی کئے لیکن اسکا مطلب یہ نہیں کہ وہ ان کی عرب مخالف پالیسیوں سے بھی متفق تھے۔ صحیح بات یہ ہے کہ انھوں نے خلافِ حق اقدامات میں ڈٹ کر مخالفت کی اور اس کی وجہ سے انھیں شام چھوڑ مصر میں پناہ لینی پڑی۔ پس ترکوں کے بارے میں ان کی پالیسی اعتدال پر مبنی تھی۔ وہ کبھی ان کا ساتھ دیتے تھے اور کبھی ان پر تنقید کرتے تھے۔[1]

کرد علی خود بھی وطنی جذبے سے سرشار تھے۔ اور دوسروں کے اندر بھی قومیت اور وطنیت کی روح پھونکنا چاہتے تھے۔ وہ اپنی قوم کی فلاح اور بہبود کیلئے ہر ممکن ذریعہ استعمال کرنے کے قائل تھے۔ چنانچہ وہ اس مقصد کیلئے اپنے ہم وطنوں کو مغربی تہذیب سے استفادہ کی دعوت بھی دیتے تھے۔ ان کا یہ خیال تھا کہ چونکہ اس تہذیب کے پاس دنیوی ترقیات کے اسباب فراہم ہیں۔ اس لئے امت مسلمہ کو اس کے تعلق سے وسعت قلبی کا مظاہرہ کرنا چاہئے۔ مغربی تہذیب کے علاوہ دیگر مختلف امور کے بارے میں ان کا موقف یہی تھا۔ وہ ہر اچھے کام کی تعریف کرتے تھے اور اس کی تکمیل میں اپنا تعاون پیش کرتے تھے۔ اس مقصد کیلئے وہ بہت سی انجمنوں، پارٹیوں اور کمیٹیوں میں شامل ہوئے۔ بلکہ بعض کی خود داغ بیل ڈالی۔ وہ کئی ایک انجمنوں کی صدارت پر بھی فائز رہے۔[2]

کرد علی کی کتاب، "مذکرات" عربی ثقافت کی تاریخ میں اس حیثیت سے بیحد اہمیت کی حامل ہوگئیں کہ اسمیں مختلف واقعات اور سیاسی و ادبی شخصیات کے بارے

---

[1] کرد علی، خطط الشام ج ۶ ص ۲۲۴ [2] ایضاً ص ۲۲۳۔

میں بڑے واضح اور صاف خیالات پیش کئے گئے ہیں۔ کرد علی نے خود اس کی صراحت کی ہے کہ ان کے مذکرات کی بذات خود کوئی اہمیت نہیں ہے وہ تو اس کے ذریعہ صرف اپنے زمانے کی ایک تصویر پیش کرنا چاہتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ:۔ "میں اس کے ذریعہ اپنے معاصرین اور ہم مشربوں کی ایک سچی تصویر پیش کرنا چاہتا ہوں اور ہر حق بات کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں"[1]

کرد علی نے جیسا کہ مذکورہ بیان میں خود اعلان کیا ہے اپنی تحریر میں راست گوئی اور صاف گوئی کو اپنا طرۂ امتیاز بنایا تھا اور واقعہ یہ ہے کہ یہ وصف ان کی کتاب میں ہر جگہ نمایاں ہے۔ اس کی وجہ سے انھیں سماج کے بہت سے طبقات کی ناراضگی اور خفگی بھی مول لینی پڑی اور اس کی وجہ سے انھیں بعض نقصانات کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ لیکن مجموعی طور سے انھیں آزادیٔ رائے، حق گوئی، عدل و انصاف اور سادگی سے الفت تھی۔ اور ان صفات کو انھوں نے ہمیشہ ملحوظ رکھا۔ وہ ظلم و عدوان اور تعصب و ریاکاری کے سخت مخالف تھے۔ وہ گروہ بندی اور فرقہ بندی کو بھی سخت ناپسند کرتے تھے۔ اور ان کی بنیاد پر تشکیل پانے والی جماعتوں کے سخت مخالف تھے۔[2]

مذکرات میں کرد علی کے اسلوب کئی رنگ لئے ہوئے ہیں۔ وہ کبھی تنقید کی اختیار کر لیتے ہیں اور کبھی تمسخر و استہزاء کا لہجہ۔ کبھی ہنستے ہنساتے ہیں اور کبھی رونے رلانے لگتے ہیں وہ نرمی اور سختی دونوں کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ غصے کی حالت میں ان کی تنقید بیحد جارحانہ ہو جاتی ہے۔ وہ لوگوں کی ناراضگی کا خیال کئے بغیر ان کے سیاہ کارنامے بیان کر جاتے ہیں[3]۔ صحیح بات یہ ہے کہ وہ سخت اور اعصابی مزاج کے آدمی تھے۔ یہ مزاج ان کے مذکرات میں ہر جگہ غالب ہے۔ اپنے مزاج کی وجہ سے وہ بہت سے واقعات، حادثات اور شخصیات کے بارے میں متضاد

---

[1] کرد علی، مذکرات، ج ۱ ص ۳۔ [2] ایضاً ص ۴۷۔

[3] ایضاً ص ۴

باتیں کہہ جاتے ہیں۔ اسکا اعتراف انھوں نے خود کیا ہے۔ اور وضاحت کی ہے کہ اپنی اندرونی کیفیات کی وجہ سے یہ کسی ایک رائے پر قائم نہیں رہ پاتے۔[1]

چونکہ انھوں نے اپنے مذکرات میں بہت سی ادبی اور سیاسی شخصیتوں پر تنقید کی ہے اس لئے یہ کتاب فکری حلقوں میں بیحد مقبول ہوئی۔ اس پر بحث و مباحثہ ہوا۔ گرچہ ان کی تنقید میں کہیں کہیں بے جا تشدد نظر آتا ہے لیکن مجموعی طور سے یہ کتاب ایک دور کی حقیقی تصویر پیش کرتی ہے۔ جسمیں لوگوں کی عادات و اطوار اور اخلاق و کردار کا پورا ریکارڈ ہے۔ اس کے مؤلف نے ہر چیز انتہائی ایمانداری اور دیانتداری سے پیش کردی ہے۔ اور مختلف سیاسی و ادبی مسائل پر اظہار کرتے ہوئے کمال درجہ کی شجاعت اور بہادری کا مظاہرہ کیا ہے۔ یہ اوصاف ایسے ہیں کہ جو بہت کم ادباء اور مؤرخین کے یہاں پائے جاتے ہیں۔

کرد علی ایک صحافی کی حیثیت سے بھی کافی مشہور ہوئے۔ صحافت سے ان کا تعلق بچپن ہی سے قائم ہوگیا تھا۔ شام میں صحافت کے عروج و ارتقا میں ان کا بڑا نمایاں رول ہے۔ اس کی وجہ سے ان کے مذکرات میں بھی صحافتی خبروں اور صحافی لوگوں کا کافی تذکرہ ہے ان کی طرز نگارش پر بھی صحافت کی چھاپ ہے۔ مذکرات کے اکثر مقالات پر صحافیانہ مزاج اور طبیعت کا غلبہ ہے۔ اس لئے انھیں سیاسی مقالات کی صف میں شامل کرنا زیادہ مناسب ہے۔

کرد علی نے اپنے مذکرات میں اپنی داخلی دنیا سے بہت کم بحث کی ہے۔ وہ صرف اپنے فکری ارتقا کی تاریخ بیان کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان شخصیات کا ذکر کرتے ہیں جنھوں نے ان کی تعمیر و تشکیل میں حصہ لیا ہے۔ وہ دوسروں کے اپنے تعلقات کا حوالہ بھی دیتے ہیں اور ان کے ساتھ باہمی دلچسپی کے امور کا خصوصی تذکرہ کرتے ہیں۔[2] ان کے اوپر ایک گرفت یہ بھی کی جاتی ہے کہ

[1] کرد علی، مذکرات، ج ۲ ص ۵۹۱۔

[2] ایضاً ص ۲۲۷۔

انھوں نے واقعات بیان کرنے میں زمانی تشکیل کا پاس و لحاظ کم رکھا۔ اور ان کو مربوط و منظم بنانے کی سعی بھی بہت کم کی۔

اس کتاب کے بارے میں بحث و تمحیص اور جرح و تعدیل کی بہت سی گنجائش ہے۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ جدید عربی ادب کی تاریخ میں اسے ایک اہم ادبی کتاب کی حیثیت سے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ اپنی ادبی خصوصیات کی بنیاد پر اسے بیسویں صدی کے نصف اوّل میں مذکرات کی نوعیت کی سب سے نمایاں ادبی کاوش قرار دیا جاتا ہے۔ یہ اپنی ضخامت کی وجہ سے پورے عربی لٹریچر میں سب سے طویل اور معلوماتی مذکرات کی حیثیت رکھتی ہے۔[1]

---

[1] عبدالغنی حسن، التراجم والسیر ص ۲۶۔ دارالمعارف مصر ۱۹۵۵ء۔

تربیۃ سلامہ موسیٰ

سلامہ موسیٰ

یہ خود نوشت سوانح عمری مشہور مصری قبطی ادیب اور صحافی سلامہ کی لکھی ہوئی ہے ابتدا میں یہ مؤلف کے ساٹھ سال کے حالات پر مشتمل تھی[1]۔ بعد میں انھوں نے اپنی زندگی کے آخری دس سالوں کے احوال ضمیمہ کے طور پر شامل کر دیئے[2]۔ جس کے ایک سال بعد ان کا انتقال ہوگیا۔ اس طرح یہ کتاب ان کی ستر سالہ زندگی کی مکمل خود نوشت سوانح عمری بن گئی۔ یہ کتاب صرف مصنف کے ذاتی و خاندانی، نشو و نما، ترتیب و تعلیم، بیرونی اسفار اور علمی سرگرمیوں کی ایک داستان ہی نہیں ہے بلکہ ایک بامقصد سیاسی، ادبی، ثقافتی، فکری اور اجتماعی جد و جہد کا ریکارڈ بھی ہے۔ اس کا مؤلف سلامہ موسیٰ جدید مصر میں ایک مفکر، دانشور اور انسانیت کے غم خوار و ہمدرد کی حیثیت سے کافی مشہور ہے۔ معاشرت، معیشت اور ادب کے بارے میں ان کے مخصوص خیالات ہیں۔ جن سے واقفیت مصنف کی شخصیت سے تعارف ضروری ہے۔

وہ فرقہ پرستی، ملوکیت اور جاگیردارانہ نظام کے خلاف تھے۔ مصر میں ان کے زمانے میں قبطیوں اور مسلمانوں کے درمیان آئے دن تنازعات ہوتے رہتے تھے۔ انھوں نے ہمیشہ اپنا دامن ان جھگڑوں سے بچائے رکھا۔ اور بعض امور میں اپنی قوم ہی کی سرزنش کی۔ ملوکیت کے بارے میں ان کی نفرت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ جنگ عظیم اول کے دوران وہ پورے اس استبدادی نظام کے خاتمہ کیلئے سب سے زیادہ بیچین تھے۔ انھوں نے زرعی اصلاحات کا علم بلند کیا

---

[1] سلامہ موسیٰ، تربیۃ سلامہ موسیٰ، موسسۃ الخانجی قاہرہ ۱۹۲۷ء۔

[2] طبع دوم قاہرہ ۱۹۵۶ء۔

اور کسانوں کو جاگیرداروں کے شکنجے سے نکالنے کی کوشش کی۔[1]

ادب اور فن کے بارے میں وہ آزادیٔ رائے کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ وہ عربی ادب اور ثقافت میں تجدید کے قائل نہ تھے۔ اور اس مقصد کیلئے اس میں فلم اور ڈرامہ کی شمولیت کے حامی تھے۔ انھوں نے اس کی ضرورت کا احساس اس وقت دلایا جب لوگ متنبی اور جاحظ کے مطالعہ سے آگے نہیں بڑھتے تھے۔ جدید عربی ادب کے بارے میں ان کے نظریات کا خلاصہ یہ ہے کہ اسے قدیم عربی ادب سے الگ ہونا چاہئے۔ طرزِ تعبیر بھی جدید ہو۔ عربی تنقید میں جرجانی اور ابن رشیق کے بجائے یورپی اصولوں کو پیشِ نظر رکھنا چاہئے۔ اور یہ کہ ادب کو معاشرے کی مشکلات اور مسائل کا احاطہ کرنا چاہئے۔ اس میں انسانیت اور آفاقیت کا پاس و لحاظ بھی ہونا چاہئے۔[2]

معاشرتی مسائل میں سے عورت کے بارے میں ان کا خیال یہ تھا۔ اسے صنعت اور حرفت میں دلچسپی لینی چاہئے اور کارزارِ حیات میں مزید گرم رول ادا کرنا چاہئے۔ وہ پورے مصر میں چھوٹی بڑی صنعتوں کا جال بچھا دینا چاہتے تھے۔ انھوں نے مصری آبادی پر کنٹرول کرنے کی پرزور حمایت کی۔ وہ بڑھتی ہوئی آبادی کو ملکی معیشت کیلئے خطرہ سمجھتے تھے۔ سیاسی اعتبار سے وہ مشرقِ اوسط میں ترکوں کے غلبہ سے سخت متنفر تھے اور مصطفیٰ کامل کی اس تحریک کے حامی تھے جس کا مقصد ترکوں کو مشرق سے کاٹ کر مغرب سے قریب کرنا تھا۔[3]

سلامہ موسیٰ اپنے مذکورہ خیالات اور ان کے علاوہ بھی بعض دوسرے خیالات کی وجہ سے مصر اور عالمِ عرب میں بحث و مباحثہ اور تنقید و تعریض کے نشانہ بنے۔ وہ اپنی وسعتِ نظری اور علمی تفوق کی وجہ سے یوں بھی اپنے معاشرے میں اجنبیت اور بیگانگی محسوس کرتے تھے لیکن اس کے باوجود وہ اپنے حال پر راضی اور قانع تھے اور اپنے موقف میں کسی طرح کی تبدیلی کے قائل نہیں تھے

---

[1] سلامہ موسیٰ، ترجمہ سلامہ موسیٰ ص ۷۲ ۔ [2] محمد شرقاوی، سلامہ موسیٰ المفکر والانسان، ص ۱۰ دار الہلال قاہرہ ۱۹۶۹ء ۔ [3] ایضاً ص ۹ ۔

وہ بظاہر پرسکون اور خاموش آدمی تھے لیکن بباطن مشتعل اور انقلاب پسند تھے۔ وہ بغیر کسی خوف و خطر کے جو کچھ سوچتے تھے بیان کر دیتے اور جو بیان کرتے تھے اس پر عمل کرتے تھے۔ دنیا کے بارے میں ان کا مسلک یہ تھا کہ اس سے لینے سے زیادہ اسے دینے کی کوشش کرنی چاہئے۔ انھوں نے اپنی خودنوشت فی الواقع اپنے خیالات اور افکار کی وضاحت کیلئے لکھی ہے۔ وہ اس کے ذریعے اپنا دفاع کرنا چاہتے تھے اور ان عوامل کی وضاحت کرنا چاہتے تھے جو ان کی فکری اور علمی ارتقا کے سبب بنے۔ چنانچہ وہ خود لکھتے ہیں:۔

"یہ میری سوانح حیات ہیں۔ اسے میں نئی نسل کے قارئین کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ تاکہ وہ ۱۸۹۵ء سے ۱۹۲۷ء تک کے ان حادثات و واقعات سے واقف ہو جائیں جنکو انھوں نے دیکھا اور پرکھا نہیں ہے"[1]

اس لئے وہ ان عوامل کی تصویر کھینچتے ہیں جو ان کی تربیت اور شخصی ارتقا کے سبب بنے۔ خاص طور سے مغربی تہذیب پر روشنی ڈالتے ہیں جس کی بدولت انھیں علم، ادب اور معاشرت کے نئے افکار و خیالات نصیب ہوئے اور جدید سائنسی تہذیب سے براہ راست واقفیت کا موقع ملا۔ چنانچہ وہ فکری اور تہذیبی اعتبار سے اپنی بالاتری اور برتری کے احساس کا برملا اعلان کرتے ہیں اور اپنے معاشرے کو اپنے بالمقابل بیحد پچھڑا ہوا قرار دیتے ہیں[2]۔

اس خودنوشت سوانح کا ایک اختصاص یہ ہے کہ یہ عربی زبان کی ان خودنوشت سوانح میں سے ایک ہے جو طویل عرصۂ حیات کی عکاسی کرتی ہیں۔ اسکا اسلوب تفسیری اور تحلیلی ہے۔ اس میں مؤلف نے اپنے افکار کو تحلیل و تجزیہ کے انداز میں پیش کیا ہے۔ کتاب

---

[1] سلامہ موسیٰ، ترجمہ سلامہ موسیٰ، ص ۵۔

[2] ایضاً ص ۳۔

کا اسلوب اس کے مؤلف کی شخصیت کے خدوخال کو واضح کرتا ہے۔ وہ ایسے الفاظ کا بکثرت استعمال کرتے ہیں جن سے ان کی وسیع علمی دنیا کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ مختصر اسلوب اور عبارت کے داعی تھے ان کی خواہش تھی کہ یہی انداز دوسرے ادبا بھی اختیار کرلیں[1]۔

سلامہ موسیٰ کی پوری خودنوشت کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ عرب مسلم معاشرے میں اپنے آپ کو اجنبی محسوس کرتے رہے تھے۔ ان کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے یہ بات مخفی نہیں رکھی وہ خود لکھتے ہیں

"میں بڑی حد تک یہ محسوس کرتا ہوں کہ میں اس معاشرے سے کٹا ہوا ہوں جس میں رہتا ہوں۔ میں اس کے عقائد جذبات اور خیالات کا ساتھ نہیں دے پا رہا ہوں"[2]

سوال اسکا ہے کہ ان کی یہ کیفیت کیوں تھی؟ اسکا ایک جواب تو یہ ہے کہ وہ چونکہ نسلاً قبطی اور مسلکاً عیسائی تھے اس لئے مسلم معاشرے سے ان کا تال میل نہیں ہو سکا۔ یہ برابر اس معاشرے کے خلاف سازشیں کرتے رہے اور بیرونی افکار و نظریات کو نام نہاد اصلاحات کے نام پر پیش کرتے رہے۔ انھوں نے فرقہ پرستی کو ہوا دی اور عربی زبان کے رسم الخط کی تبدیلی کا فلسفہ پیش کیا۔ لیکن اسکا دوسرا جواب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اپنے وسیع علم اور اعلیٰ تہذیب و تمدن کی وجہ سے ان کے اندر جو تبدیلی آئی وہ ان کے ماحول و معاشرے کے مطابق نہیں تھی۔ یہ ہر جگہ جدت پسندی کے قائل تھے۔ اور ذاتی و اجتماعی زندگی کا اسلوب بدل دینا چاہتے تھے۔ اور اس طرح فکر و ادب کی قدیم عمارت کے ملبے پر ایک نیا محل تعمیر کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے قدامت پسند معاشرہ ان کی راہ میں حائل ہو گیا۔ اور ان دونوں

---

[1] محمود شرقاوی، سلامہ موسیٰ المفکر والانسان ص ۸ - ۱۰

[2] سلامہ موسیٰ، تربیۃ سلامۃ موسیٰ، ص ۶۔

کے مابین کشمکش کا آغاز ہوا۔ یہ کشمکش اسی نوعیت کی ہے جس کا سامنا مصر کے دوسرے تجدید پسند مسلم ادباء کو بھی کرنا پڑا تھا۔

گرچہ مذکورہ بالا دونوں جوابات میں سے دوسرے جواب کی معقولیت زیادہ سمجھ میں آتی ہے لیکن ساتھ ہی اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سلامہ موسیٰ اپنے معاصر دوسرے ادباء کی طرح بیرونی سازشوں کے آلۂ کار بنے اور تجدید پسندی اور روشن خیالی کے نام پر مغربیت کی وکالت کی۔ اب اس کی صراحت مشکل ہے کہ انھوں نے یہ طرزِ عمل قوم کی فلاح و بہبود کیلئے اختیار کیا یا مذہب اسلام کی بیخ کنی کیلئے۔

فصل دوم:

۱۹۵۲ء کے بعد

مطبوعہ چند اہم عربی خودنوشت سوانح حیات

السبعون — میخائیل نعیمہ

میخائیل نعیمہ کی کتاب "سبعون" جدید عربی ادب کی ایک ممتاز خود نوشت سوانح حیات ہے۔ قدیم و جدید عربی خود نوشتوں میں اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی ہے۔ نعیمہ نے اس میں اپنی زندگی کی پوری داستان کھول کھول کر بیان کر دی ہے۔ لبنان سے لے کر دیارِ مغرب تک جو کچھ روحانی، جسمانی، علمی اور ادبی ارتقاء ہوا اس کی پوری تصویر اس کتاب میں آ گئی ہے۔ تصوف کی طرف مائل ہونے کے باوجود انھوں نے اپنی خواہشات نفسانی کی تفصیلات پوری وضاحت، سچائی، جرأت اور معروضیت سے پیش کر دی ہے۔

میخائیل نعیمہ جب ستر سال کی عمر کو پہنچے تو انھوں نے اپنی سوانح کی تکمیل کی چونکہ یہ ان کی ستر سالہ زندگی کے تجربات و مشاہدات پر مشتمل ہے اس لئے اس کا نام "سبعون" رکھا۔ انھوں نے اس کتاب کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے اور ہر حصے میں اپنی زندگی کے ایک مرحلے کی داستان قلمبند کی ہے۔ پہلے حصے میں بچپن اور آغاز شباب (۱۸۸۹ء سے ۱۹۱۱ء تک) کی تصویر کھینچی گئی ہے[1] دوسرے حصے میں ایام شباب (۱۹۱۱ء سے ۱۹۳۲ء تک) کی تصویر[2] اور تیسرے حصے میں ادھیڑ عمری اور بڑھاپے (۱۹۳۲ء سے ۱۹۵۹ء تک) کی داستان قلمبند کی گئی ہے[3]۔

ظاہر ہے ستر سال کی زندگی کی روداد بڑی طویل ہوتی ہے۔ اگر ہر بات کا تذکرہ کیا جائے تو اس کے لئے کئی ہزار صفحات درکار ہوں گے۔ پھر بھی بہت سی باتیں تحریر میں آنے سے رہ جائیں گی۔ اس لئے ان میں اختیار اور انتخاب ضروری ہوتا ہے۔ چنانچہ خود نعیمہ کے قول "اس میں زندگی کے اہم حصے بیان کئے گئے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی چیز زیادہ اہم نہ محسوس ہوتی ہو لیکن چونکہ اس سے مقصد اور غرض و غایت کی ہوتی ہے اس لئے اس کا بھی ذکر ضروری تھا"۔ پس نعیمہ نے اس کتاب میں اپنی زندگی کی وہ تجربات بیان کئے ہیں جو ان کے تصارف کیلئے مفید ہوں اور جن سے لوگوں کو فائدہ پہنچتا ہو۔

---

[1] میخائیل نعیمہ — سبعون، حکایۃ عمر (۱۸۸۹-۱۹۵۹) المرحلۃ الاولی (۱۸۸۹-۱۹۱۱) دار صادر دار بیروت، ۱۹۵۹ء

[2] ایضاً المرحلۃ الثانیۃ ۱۹۱۱-۱۹۳۱ء ، [3] میخائیل نعیمہ — المرحلۃ الثالثۃ ۱۹۳۲-۱۹۵۹ء

وہ اپنی خود نوشت کی غرض و غایت ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں ۔

"میں اپنے قارئین کیساتھ دنیا کی سیر کرنا چاہتا ہوں، تاکہ انہیں اپنی زندگی میں سے کچھ دے سکوں میں انہیں اپنے افکار کے وہ ہدیے جن میں میرے خیال کے مطابق ان کے دماغ اور قلب کیلئے غذا کا سامان ہو"[1] ۔

وہ اپنی کتاب کی تالیف کی غرض و غایت دوسرے الفاظ میں اس طرح بھی ادا کرتے ہیں کہ وہ اس کے ذریعہ کائنات اور اپنی ذات کی حقیقت کے متلاشی انسان کو سیدھا سچا راستہ بتانا چاہتے ہیں ۔ اس کے ذریعہ وہ کائنات کی مختلف گھاٹیوں اور گھاٹیوں میں بھٹکنے کے بجائے اطمینان اور یکسوئی سے سفر کر سکے گا ۔ اور اس کے پاس ضرور سامان سفر بھی ہوگا ۔ اپنی یادداشتوں کے جمع کرنے کے بعد ان کے لئے یہ ممکن ہوا کہ وہ اپنی ذات، کائنات اور لوگوں سے اپنا حساب چکائیں، اور اس لذت سے لطف اندوز ہوں جو انسان کو اپنے بھائیوں کے سامنے اپنے تمام رازہائے سربستہ اگل دینے کے بعد طمانیت اور بے حجابی کے عالم میں حاصل ہوتی ہے[2] ۔

اس خود نوشت کا گہرائی سے مطالعہ کرنے کے بعد یہ حقیقت واضح ہوتی ہے اسکی تالیف کا اصل محرک لوگوں کو ان نتائج فکر سے آگاہ کرنا ہے جو اس کے مصنف کے سامنے زندگی کی پر پیچ اور پر خطر گھاٹیوں میں اپنی ذات کی معرفت کی مسلسل اور پیہم کوششوں کے بعد سامنے آئے ۔ چنانچہ مصنف نے اپنی اس کتاب میں اس بنیادی سوال سے بحث کی ہے کہ انسان کائنات سے اور کائنات کا انسان سے کیا تعلق ہے؟ انسان کے وجود کی غرض و غایت کیا ہے؟ اس کا آخری ٹھکانہ کہاں ہے؟[3]

اس کا مطلب یہ ہوا کہ مصنف کے سامنے بڑے اہم بلند ترین اور اعلیٰ مقاصد تھے ۔ وہ ان کے ذریعہ فی الواقع انسانیت کی ایک بڑی خدمت انجام دینا چاہتے تھے ۔

---

[1] میخائیل نعیمہ ــ السبعون ، المرحلۃ الاولیٰ ص ۱۲ [2] ایضاً ص ۱۲ ۔ [3] ایضاً ص ۱۲-۱۳

میخائیل نعیمہ نے اپنی خود نوشت کے پہلے حصے میں اپنے بچپن اور عنفوان شباب کی بڑی دقیق تصویر پیش کی ہے چنانچہ سب سے پہلے انھوں نے "لسکنتا" گاؤں میں اپنے گھر، خاندان اور متعلقین کے بارے میں تفصیل سے گفتگو کی ہے اور انھوں نے بچپن کی یادوں میں سے فقر اطرماں کے وہ احساسات ہم تک منتقل کئے ہیں جو گاؤں کے کلیسا کی زیارت کے بعد ان کے اندر پیدا ہوا کرتے تھے۔ اس کے بعد انھوں نے اپنے حسب ونسب اور آباء واجداد کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے اپنے دادا اور دادی کی مہر ومحبت اور الفت ومشقت کا ذکر کیا ہے پھر انھوں نے لسکنتا گاؤں اسکی وادی "شخروب" اور اپنی تربیت کے سلسلے میں ان دونوں کے اثرات کا جائزہ لیا ہے۔ وہ اپنے گاؤں اور علاقے کی ہر چیز سے بیحد متاثر نظر آتے ہیں اور بار بار انتہائی مؤثر انداز میں ان کا تذکرہ کرتے ہیں[1]۔

پھر وہ گاؤں کے اسکول میں اپنے داخلے کا ذکر کرتے ہیں اور وہاں اپنی کتابوں، قلم، دوات، استاذ اور ساتھیوں کے بارے میں معلومات فراہم کرتے ہیں۔ اپنے استاذ کے ڈانٹنے اور متنبہ کرنے کا انداز اور طلبہ کو چند متعین جملے رٹانے کا طریقۂ تعلیم ان کے ذہن میں ہمیشہ کیلئے محفوظ ہو گیا تھا۔ ان کے والد امریکہ سے اپنی دو بہنوں کے ساتھ واپس آئے تو ان کا گھر خوشیوں اور مسرتوں کا گہوارہ بن گیا۔ انھوں نے اسکی منظر کشی کے علاوہ اپنے والد محترم کی شخصیت کے بہترین پہلوؤں کا بھی تعارف پیش کر دیا ہے[2]۔

روس نے آرتھوڈکس (Orthodox) عیسائیوں کیلئے دیار شام میں اسکولس قائم کرنے کا فیصلہ کیا تو ان کے گاؤں "لسکنتا" کے حصے میں بھی ایک اسکول آیا۔ میخائیل نعیمہ نے اسمیں داخلہ لیا۔ انھوں نے اس اسکول کے نظام تعلیم وغیرہ پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور اس کے بعض جلسوں اور پروگراموں کا منظر بھی پیش کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ صدق وجرأت سے محبت اور نفاق اور کذب وافتراء سے نفرت انہیں اسی اسکول کی زندگی سے ہوئی تھی۔ اس کے بعد وہ اپنی خاموش طبیعت، سنجیدگی

---

[1] میخائیل نعیمہ ـــ السبعون، المرحلۃ الاولیٰ ص ۵۱-۱۵ [2] ایضاً ص ۷۳-۱۲

گوشہ نشینی، علیحدگی پسندی اور فطرت و اسرارِ فطرت میں اپنے انہماک و غور و فکر کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ وہ بچپن ہی سے مذکورہ خصلتوں کے مالک ہو چکے تھے۔ برتری اور بالادستی کی خواہش اسی وقت سے ان کے اندر پیدا ہو چکی تھی۔ عربی زبان سے محبت اور اس کے مفردات کو یاد کرنے کا شوق بھی ان کے اندر اسی وقت پیدا ہو گیا تھا۔[1]

پھر انھوں نے اپنے بھائی "نجیب" کی پیدائش اور دوسرے بھائی "ادیب" کی امریکہ ہجرت کا ذکر کیا ہے۔ اسی تعلق سے انھوں نے اس زمانے کی مالی مشکلات اور حصولِ دولت کیلئے ہجرت جیسی تکلیف دہ منزل کا نقشہ کھینچ دیا ہے۔ مہاجرین کو رخصت کرتے وقت آہ و بکا، سلام و پیام، مصافحہ و معانقہ اور دعا و مناجات کی جو فضا بن جاتی تھی اس کا بھی دلنشین اور دلکش انداز میں تذکرہ کیا ہے۔[2]

اس کے بعد انھیں اپنے گاؤں سے دور "ناصرۃ" شہر میں "دار المعلمین الروسیۃ" کے اندر داخلہ لینے کا موقع ملا۔ یہ ۱۹۰۲ء کی بات ہے۔ اس اسکول میں داخلے کیلئے انھیں برتھ سرٹیفکیٹ (Birth Certificate) کے حصول اور ناصرہ تک کے سفر میں جو کچھ پیش آیا تھا اس کی تفصیلات سے انھوں نے قارئین کو آگاہ کیا ہے۔ وہ اس اسکول کے ماحول، نظامِ تعلیم، پرنسپل، طلباء اور اساتذہ کے بارے میں ضروری اور دلچسپ باتیں بتاتے ہوئے ان پریشانیوں کا تذکرہ کرتے ہیں جو وہاں روسی زبان کے ذریعۂ تعلیم ہونے کی وجہ سے انھیں پیش آئی تھیں۔ ان کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا تاہم مسیحی عقائد کے مطابق چونکہ ناصرہ شہر مسجدِ مقدس شہر تھا اس لیے وہ اسمیں قیام اور تعلیم کو غنیمت سمجھتے رہے۔[3] ناصرہ میں تعلیم کے دوران ہی ان کے گھر میں ایک بیٹا اور ایک بیٹی (نسیب اور غالبہ) کی پیدائش ہوئی۔ اس کی وجہ سے ان کو اپنے گھر کی معاشی حالت کی درستگی کا خیال آیا۔ ان کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ کاش کہ انھیں مدرسہ میں تعلیم حاصل کرنے کیلئے

---

[1] میخائیل نعیمہ ــــ السبعون، المرحلۃ الأولیٰ ص ۷۴-۹۳ [2] ایضاً ص ۹۴-۱۱۴

[3] ایضاً ص ۱۱۷-۱۳۹

منتخب کر لیا جائے[1]۔ انھوں نے اپنے مدرسے کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے بتایا ہے کہ انھوں نے خاموشی کا تجربہ اسی مدرسے سے کرنا شروع کر دیا تھا، چنانچہ وہ دس دن تک مسلسل خاموش رہے۔ اس سے ان کی عقل کو حرکت ملی اور وہ دنیا کے معاملات میں غور و فکر کرنے لگے۔ جب وہ خاموشی سے بات چیت کی طرف لوٹے تو اب معلوم ہوا کہ وہ بہت دور کی مسافت طے کر کے آ رہے ہیں۔ اس عمل سے ان کو یہ فائدہ ہوا کہ وہ مسلسل غور و فکر کے عادی ہو گئے۔ وہ بظاہر اپنے ماحول اور معاشرے سے جڑے ہوئے تھے لیکن وہ اس سے الگ ایک نئی دنیا میں رہتے تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کیفیت میں اضافہ ہوتا گیا۔ اس اسکول کے مختلف مضامین سے انھیں ان مضامین سے زیادہ دلچسپی تھی جو ان کی زندگی کی مشکلات سے بحث کرتے ہوں۔ اشعار کے معاملے میں خاص طور سے ان کا طرزِ عمل یہی تھا۔ وہ فخریہ اشعار کے بجائے حزنیہ اور رزمیہ اشعار پر رضا زیادہ پسند کرتے تھے۔ غزل کے بھی ان اشعار سے انھیں دلچسپی تھی جو دل کا درد بیان کرتے ہوں[2]۔

اس اسکول میں تعلیم کے دوران ہی ان کی زندگی کی سب سے بڑی آرزو پوری ہوئی، یعنی یہ کہ انھیں روس میں تعلیم جاری رکھنے کے لئے منتخب کر لیا گیا۔ وہ سفر کی تیاری کیلئے گاؤں لوٹتے ہوئے راستے میں ایکیرات لبنانی ساحل پر گزارتے ہیں۔ وہاں وہ چاند، تاروں، سمندر اور آسمان کو دیکھ کر بہت سے سوالات کا جواب تلاش کرتے ہیں۔ یہ سوالات ان کے ذہن میں پہلے سے گردش کر رہے تھے۔ ان میں سے زیادہ کا تعلق مذکورہ چیزوں کی حقیقت، وجود اور مقصدِ وجود سے تھا[3]۔

وہ بیروت سے گھر کی طرف ریل گاڑی سے واپس آ رہے تھے کہ ان کی ملاقات دو طالبات سے ہو گئی۔ ان دونوں کو کسی طرح یہ معلوم ہو گیا تھا کہ ان کا انتخاب روس میں حصولِ تعلیم کیلئے ہو گیا ہے۔ چنانچہ وہ ان سے گفتگو میں دلچسپی لے رہی تھیں اور ان کی شخصیت سے متاثر تھیں۔ جب وہ

---

[1] میخائیل نعیمہ۔ السبعون، المرحلۃ الاولیٰ ص ۱۲۱-۱۲۰ [2] ایضاً ص ۱۵۳-۱۲۲

[3] ایضاً ص ۱۶۰-۱۵۲

دونوں چھوڑ کر چلی گئیں تو ان کے بقول "ان کی دنیا تاریک ہو گئی۔ آنکھوں سے بینائی جاتی رہی۔ ان کے اندر ایک ایسا احساس پیدا ہو چکا تھا جس کی تعبیر ممکن نہیں"[1]۔ خلاصۂ کلام یہ کہ وہ پہلی بار صنف نازک کے اختلاط اور تکلم سے بہکنا رہے تھے۔ اور اس کی وجہ سے ان کے اندر ایک برقی لہر دوڑ گئی تھی۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کے اندر گناہ کا کوئی داعیہ پیدا ہوا ہو۔ نہیں! ان کے بقول وہ ایک پاکیزہ لطف محسوس کر رہے تھے۔ بہرحال! اس پورے واقعے کی انھوں نے بڑی دلکش اور جاذب نظر تصویر پیش کی ہے اس سے ان کے لطیف جذبات کا اندازہ ہوتا ہے[2]۔

انھوں نے ۱۹۰۶ء کے تعلیمی سال کے آغاز میں "شخروب" سے روس کی طرف سفر کا قصد کیا ان کے گھر بار کے لوگوں نے بہت پرتاثر الوداع کیا۔ یہ سمندری ذریعہ سے روس پہنچے اور "بولتاما" میں "السمنار الروحی" میں داخلہ لیا۔ وہ وہاں اسکول کا پینیارم اور اس کی تہذیب اور کلچر کو اختیار کر کے وہاں کے ماحول میں بالکل ضم ہو گئے۔ اپنی محنت، صلاحیت اور لگن کی وجہ سے اسکول کے اساتذہ سے بے حد قریب ہو گئے تھے۔ اسکول میں انھوں نے فنون لطیفہ کی طرف توجہ دی چنانچہ موسیقی اور رقص میں مہارت حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن اپنی مخصوص عزلت پسند طبیعت کی وجہ سے وہ بہت دنوں تک ان کو نہیں برت سکے اور اس طرح مشق و ممارست میں عدم تسلسل کی وجہ سے ہی دلچسپی بھی ختم ہو گئی[3]۔

"سمنار" میں تعلیم کے دوران انھوں نے باضابطہ اپنی ڈائری مرتب کی تھی۔ اس کے منتخب حصے انھوں نے اپنی خود نوشت میں نقل کر دیئے تھے۔ ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ روسی اشعار کو صرف پڑھنے اور سمجھنے ہی پر قادر نہیں تھے بلکہ اس زبان میں شاعری کرنے کی پوزیشن میں بھی تھے۔ ان کے بعض اشعار وہاں بہت پسند کئے گئے۔ وہ روسی مفکر "ٹولسٹوی" سے بہت زیادہ متاثر تھے۔

---

[1] میخائیل نعیمہ ــ السبعون المرحلۃ الاولیٰ ص ۱۶۱ [2] ایضاً ص ۱۶۳-۱۶۱

[3] ایضاً ص ۱۶۵-۱۶۱

دونوں میں قدر مشترک اپنی اور کائنات کی حقیقت کی تلاش تھی۔ انجیل مقدس تولستوی اور نعیمہ دونوں کی رہنما کتاب تھی۔ دونوں نے گرجا گھر جانا چھوڑ دیا تھا۔ نعیمہ خاص طور سے گرجا گھروں کے اندر انجام دیئے جانے والے مراسم عبادت سے نالاں تھے۔ ان کو یہاں خلوص کی کمی نظر آتی تھی۔ پھر ان کا یہ بھی خیال تھا کہ خدا کی یاد کیلئے ایک مخصوص طرز کے تعمیر کردہ گھر اور متعین عبادات و رسوم کی ضرورت نہیں ہے آدمی جہاں اور جس حال میں ہو خدا کو یاد کر سکتا ہے[1]۔

امتحانات کے بعد یہ ایک دوشیزہ کے ساتھ تفریح کرنے نکلے۔ اس نے ان پر اپنے حسن کا جال پھیلانا چاہا۔ یہ اس کے دام میں آنا ہی چاہتے تھے کہ ضمیر کی آواز نے انھیں روک دیا اور عفت کی زندگی کی اہمیت ان پر واضح کی۔ ۱۹۰۶ء[2] کا موسم گرما انھوں نے مدرسہ میں گزارا۔ یہ اپنے سابقہ "ڈالیوشا" کے ساتھ اس کے کنبوں کی زیارت کرنے جایا کرتے تھے اور وہاں کی دن میں تفریح کرتے تھے۔ اس دوران بہت سی دوشیزاؤں نے ان پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کی لیکن سب ہی کو ناکامی ہوئی۔ ان اوقات میں وہ برابر اپنے مستقبل کے بارے میں سوچا کرتے تھے، اور ہر بار اس کا نتیجہ یہی نکلتا تھا کہ وہ ایک مصنف اور صاحب طرز انشا پرداز ہوں۔ ان کی نثر کا ایک اچھوتا اسلوب ہو اور شعر میں چاشنی، سلاست اور موسیقیت ہو[3]۔

اس دوران "ڈالیوشا" کی بہن "ماریا" جو شادی شدہ تھی لیکن اپنے شوہر کو پسند نہیں کرتی تھی، ان پر عاشق ہو گئی۔ وہ برابر انھیں بہلاتی اور پھسلاتی رہی۔ وہ گرمجوشی سے ان کو بوسے لیتی تھی اور ہر بار یہ کہتی تھی "لیجئے۔ لیجئے۔ یہ ماریا کی یاد کے تحفے ہیں"۔ لیکن وہ اسے ٹال کر "ڈالیوشا" واپس چلے آئے۔ ماریا نے ان کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ وہ خود اپنے شوہر کے پاس آ گئی اور موقعے پاکر اپنی محبت کا اظہار کرنے لگی۔ وہ ان کو بوسہ لیتی تھی اور ان سے شادی کا مطالبہ کرتی تھی،

---

[1] میخائیل نعیمہ ــ السبعون المرحلة الأولى ص ۱۹۸-۱۷۹ [2] ایضاً ص ۱۹۴-۱۹۱

[3] ایضاً ص ۱۹۸-۱۹۵

لیکن وہ اپنے روحانی تجربے میں کامیاب رہے اور فاریا ناکام و نامراد واپس ہوگئی۔ مگر ایک بار ایسا ہوا کہ وہ "فاریا" کی تدبیروں کے سامنے ڈھیر ہوگئے۔ ان کے خون میں گرمی آگئی اور جذبات میں ابال پیدا ہوا۔ پھر کیا تھا؟..... فاریا نے اپنے شوہر کو کسی گرجا گھر میں بھیجنے کی کوشش کی تاکہ وہ ان کے ساتھ مکمل طور سے عیش کرے۔ یہ بھی ایسی صورت میں اس کے ساتھ شادی کرنے پر آمادہ ہوگئے تھے لیکن یہ تمام تدبیریں کام نہیں آئیں[1]۔

وہ "بولتافا" میں تعلیم کے تیسرے سال ہی سے زہد و تصوف کی طرف مائل ہوگئے اور لوگوں سے دور رہ کر مطالعۂ کتب اور تالیف و تصنیف میں مصروف رہنے لگے۔ اور اپنی اندرونی دنیا کی تلاش و جستجو میں منہمک ہوگئے۔ وہ برابر خیر و شر اور اصلاح و فلاح کے امور میں غور و فکر کرتے رہے۔ اسی کے ساتھ وہ علوم و فنون میں اپنی ترقی کے امکانات پر بھی توجہ دیتے رہے۔ چنانچہ عربی زبان میں ڈرامہ نگاری کا شوق بھی ہوا۔ لیکن خود ان کے بقول "اپنے ملک سے دو سال کی دوری کی وجہ سے عربی زبان پر قدرت پہلے کی طرح باقی نہیں رہ گئی تھی"۔ اسی دوران انھوں نے بہت سے روسی مفکرین اور انشاء پردازوں کی نگارشات کا مطالعہ کیا، ان کا بیان ہے کہ وہ ان میں فن سے زیادہ اس پہلو پر توجہ دیتے تھے کہ کس حد تک انسانی مشکلات کا احاطہ کرتی ہیں[2]۔

وہ سمنار میں تعلیم کے دوران مختلف خیالات و افکار کا مطالعہ کرتے رہے۔ وہ ان میں سے صالح اور اعلیٰ عناصر سے متاثر بھی تھے اور ان کی یہ خواہش تھی کہ وہ انھیں اپنے ملک میں عام کریں، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ مکمل مغربی تہذیب اختیار کر لینے کے داعی تھے۔ بلکہ وہ صرف اس تہذیب کی خوبیوں اور اعلیٰ اقدار تک استفادہ کے قائل تھے۔ وہ عربی ادب اور عربی معاشرے کی زبوں حالی سے بہت پریشان و مایوس تھے اور چاہتے تھے کہ یہ مغربی ادب اور معاشرے سے استفادہ کرکے اپنی حالت زار

---

[1] میخائیل نعیمہ ـــ السبعون، المرحلۃ الاولیٰ ص ۲۱۷-۱۹۹، ۲۲۸-۲۲۵، ۲۶۸-۲۶۵،

[2] ایضاً ص ۲۲۱-۲۱۸

درست کریں اور اپنے اندر امنگ و حوصلہ پیدا کریں۔[1]

روس میں تعلیم کے آخری زمانے میں ان کی ملاقات ایک اور روسی دوشیزہ "مارو سیا" سے ہوئی۔ یہ ان کو دل و جان سے چاہنے لگی اور دونوں میں بوس و کنار کا تبادلہ بھی ہونے لگا، لیکن وہ برابر اپنے اوپر کنٹرول کرتے رہے۔ اس سلسلے میں ان کے بیان کے مطابق انجیل کی تعلیمات بہت کام آئیں۔[2]

وہ گرمی کی تعطیلات گزارنے اپنے گاؤں چلے آتے ہیں۔ یہاں وادی "شخروب" کے قدرتی مناظر پر برابر غور و فکر کرتے ہیں اور ان کے بارے میں طرح طرح کے تصورات قائم کرتے تھے۔ پھر وہ اپنی تعلیم مکمل کرنے کے لیے "بولشافا" واپس آجاتے ہیں۔[3] یہاں طلبہ کی ایک اسٹرائک منظم کرنے میں حصہ لیا، اس کی وجہ سے انھیں ایک سال کیلئے اسکول سے نکال دیا گیا۔[4] یہ ماسکو چلے آئے اور یہاں مختلف نوعیت کی تعلیم حاصل کرتے رہے پھر وہ ایک سال بعد "بولشافا" امتحان میں شرکت کیلئے واپس لوٹے۔ انھیں ماسکو کے سفر سے روسی حکمرانوں اور سربرآوردہ لوگوں پر سخت غصہ آیا تھا کیونکہ وہ ان کے اعمال سے مطمئن نہیں تھے۔[5]

"بولشافا" میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ لبنان واپس چلے آئے۔ اب انھیں اس بات کا احساس ہو چکا تھا کہ کلیسا نے انھیں روحانیت کا جو لبادہ پہنایا ہے وہ ان کے تنگ ہو رہا ہے اور یہ کہ ان کی عقل زندگی کے پیچیدہ مسائل کے حل کیلئے بے چین ہے۔ کلیسا کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ اس نے انجیل کے بعض حصوں پر اصل توجہ دیکر اور بعض کو نظر انداز کر کے زیادتی کی ہے وہ ہر حصے کو مفید اور گوہر نایاب سمجھتے ہیں۔ وہ اپنی شخصیت کے بنانے میں کلیسا کا صرف اتنا رول مانتے ہیں کہ ان کے اندر ظاہراً نصرانیت آگئی۔ لیکن جہاں روحانی بلندی اور باطنی ترقی کا معاملہ ہے تو وہ آج تک تشنۂ تکمیل ہے اور کلیسا اس کے لئے کسی طرح کی مدد فراہم نہیں کر رہا ہے۔[6]

گھر واپس آکر وہ قانون کی تعلیم کیلئے پیرس جانے کا پروگرام بنا رہے تھے کہ تقدیر بیچ

---

[1] میخائیل نعیمہ ـ السبعون، المرحلۃ الاولیٰ ص ۲۴۳-۲۳۳، [2] ایضاً ص ۲۴۰-۲۳۶، [3] ایضاً ص ۲۵۲-۲۴۲

[4] ایضاً ص ۵۵-۵۲، [5] ایضاً ص ۲۷۲-۲۶۸، [6] ایضاً ص ۲۸۱-۲۷۳،

میں حائل ہوگئی۔ ان کے ایک بھائی "ادیب" امریکہ سے وطن واپس آئے تھے۔ انھوں نے ان کو امریکہ جانے پر راضی کرلیا۔ اس طرح پیرس جانے کے بجائے واشنگٹن جانے کی راہ ہموار ہوگئی[1]۔

اپنی خودنوشت کے دوسرے حصے میں انھوں نے فی الواقع اپنی مہجری زندگی کی داستان قلمبند کی ہے۔ اس کا آغاز ۱۹۱۱ء سے ہوتا ہے اور اختتام ۱۹۳۲ء پر۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ وہ لبنان چھوڑ کر امریکہ کے "والاوالا" نامی شہر میں اپنے دونوں بھائیوں۔ ادیب اور میکل۔ سے جا ملتے ہیں۔ یہ شہر واشنگٹن کے مشرقی جانب واقع ہے۔ وہ شروع میں اس شہر میں وحشت اور اجنبیت محسوس کرتے تھے۔ یہاں کی ترقی یافتہ شہری زندگی اور اس کے لوازمات سے انھیں نفرت تھی۔ اسی زندگی نے انسان کے اندر سے عدل و محبت کے جذبات نکال کر اسے خالص مشینی آدمی بنا دیا تھا۔ لیکن اس ناپسندیدگی کے باوجود انھیں یہاں رضا تھا۔ چنانچہ انھوں نے سب سے پہلے انگریزی زبان سیکھنا شروع کیا۔ پھر انھوں نے قانون کی تعلیم کے لئے واشنگٹن یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ ساتھ ہی ادب بھی زیر مطالعہ رکھا۔ وہ اس یونیورسٹی اس کی روایات، نظام تعلیم اور یونیفارم وغیرہ کی بہت تفصیلی خاکہ پیش کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہاں ان کا سب سے بڑا شغل مطالعۂ کتب تھا۔ جس طرح روس میں انھوں نے روسی ادب کا مطالعہ کیا اسی طرح یہاں انگریزی ادب کی امہات کتب کا مطالعہ کرڈالا[2]۔

واشنگٹن یونیورسٹی میں داخلے کے دوسرے سال ان کے پاس ڈاک کے ذریعہ مجلہ "الفنون" کا پہلا شمارہ پہنچا۔ اسے "ناصرہ" کے ان کے دوست "نسیب عریضہ" نے نکالا تھا۔ اس مجلہ سے ان کو ایک نیا میدان مل گیا۔ وہ اسمیں مقالات کی شکل میں مجدد کا وہ پیغام پیش کرنے لگے جسکی تبلیغ کا خواب انھوں نے بہت پہلے سے دیکھ رکھا تھا۔ ان کا اس پر ایمان تھا کہ تحریر کا تقدس ہمیشہ ملحوظ رکھنا چاہئے اسمیں ریاکاری، چاپلوسی اور مفاد پرستی کا شائبہ نہیں ہونا چاہئے۔ بلکہ اس سے حق و انصاف اور

---

[1] میخائیل نعیمہ ـ السبعون، المرحلۃ الاولی ص ۲۸۱-۲۸۲ ، [2] ایضاً المرحلۃ الثالثۃ ص ۶۲-۷۰

ذوق سلیم کی خدمت کرنی چاہئے ۔ وہ اور ان کے ساتھی برابر اسمیں اپنے مشن کی تبلیغ کرتے رہے اور اسی کو سامنے رکھ کر مختلف نوعیت کے مقالات تحریر کرتے رہے ۔ لیکن کچھ دنوں کے بعد مجلہ "الفنون" بند ہو گیا اور اس کی جگہ مجلہ "السائح" نے سنبھال ۔ وہ اس مجلے میں بھی اپنی نگارشات پیش کرتے رہے[1] ۔

اسی دوران جنگ عظیم اول چھڑ جاتی ہے اور لبنان و شام قحط اور فاقہ کی لپیٹ میں آ جاتے ہیں ۔ اس صورت حال سے نمٹنے کیلئے مہجری ادباء نے بھی اپنا تعاون پیش کیا اور ایک ریلیف کمیٹی بنائی ۔ میخائیل نعیمہ اسمیں شامل تھے ۔ اس کے علاوہ وہ شام کی آزادی کی تحریک میں بھی کچھ دنوں سرگرم رہے ۔ پھر انھوں نے مالی مشکلات پر قابو پانے کیلئے ایک روسی کمپنی کا نسولیٹ میں کام کرنا شروع کر دیا[2] ۔ ان تمام مشاغل کے باوجود وہ اپنی اس اندرونی آواز کو دبا نہیں سکتے جو ان سے برابر زندگی اور اس کے مفہوم، موت اور اس کے بعد کی زندگی، یہ وسیع و عریض کائنات اور اس کی غرض و غایت سے واقفیت اور ان کی معرفت کا مطالبہ کرتی تھی ۔ یہ اس آواز کے مطالبے پر توجہ دیتے رہے اور اس کی تکمیل کیلئے سرگرداں رہے ۔ اتفاق سے یونیورسٹی میں ان کی ملاقات اسکاٹ لینڈ کے ایک طالب علم سے ہو گئی جس کا تعلق ایک صوفی جماعت سے تھا جو "تقمص" کے اصولوں پر یقین رکھتی تھی ۔ اس کا مفہوم یہ تھا کہ "انسان مرنے کے بعد دوبارہ زندگی پائے گا ۔ اسکی مثال اناج کی طرح ہے جو فنا ہی اس لئے ہوتا ہے تاکہ دوبارہ زندگی حاصل کرے" ۔ اس نظریے کا نعیمہ پر بہت زیادہ اثر ہوا ۔ ان کا ایک ایسی طاقت پر مضبوط ایمان ہوا جو وسیع، عدل پرور، منتظم اور مہربان ہے ۔ جس کے نظام میں کوئی کجی نہیں ۔ اس عقیدے سے انھوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ زندگی مسلسل حرکت سے عبارت ہے درمیان میں ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف منتقل ہونے کے وجود تنے ہیں اور جن کا نام موت ہے ان سے گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں ۔ نعیمہ فکر و معرفت کیلئے مزید یکسو ہو گئے، کیونکہ اب زندگی کے ختم ہونے کا اندیشہ جاتا رہا تھا[3] ۔

---

[1] میخائیل نعیمہ ۔ السبعون، المرحلۃ الثانیۃ ص ۱۰۸-۶۵ ، [2] ایضاً ص ۱۱۲-۱۰۹

[3] ایضاً ص ۲۵-۲۴

انھوں نے اپنی خود نوشت میں مذکورہ عقیدے پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اس کے بعد انھوں نے بہت سے باطنی نظریات اور سماوی وغیر سماوی ادیان کا مطالعہ کیا۔ انھیں سب کے درمیان ایک گہرا رابطہ نظر آیا۔ اور ان کا اس امر پر راسخ یقین ہوگیا کہ یہ سب ایک ہی چشمے سے سیراب ہو رہے ہیں[1]۔

اس کے بعد وہ مجلہ "الفنون" کی دوبارہ اشاعت کا تذکرہ کرتے ہیں اور مختلف ادبی و سیاسی مسائل پر "نسیب عریضہ" کے ساتھ ہوئی مراسلت کا ذکر کرتے ہیں، اس میں سے بعض خطوط کا انتخاب کرکے انھیں نقل بھی کرتے ہیں۔ ان خطوط میں اور مسائل کے علاوہ ایک ایسی خفیہ انجمن کے قیام کی تجویز بھی پیش کی ہے جو نوجوانوں کی ادبی صلاحیتوں کو مجتمع کرے اور انھیں حکمت و دانائی کیساتھ شام کے اندر روشنی پھیلانے اور اس کے باشندوں کو زندگی کے مفہوم سے آشنا کرنے کیلئے استعمال کرے۔ ان کا یہ خیال ہے کہ مغربی ممالک میں بسنے والے ادباء مہاجر اگر اپنے ہم وطنوں کیلئے کام نہیں کریں گے تو ان کی صلاحیتیں بے کار ہو جائیں گی اور مغرب سے اختلاط کے نتیجہ میں ان کو جو حرکت، حرارت اور حیات ملی ہے اس کا کوئی افادی مفہوم باقی نہیں رہے گا۔ یہ اور اس طرح کے دوسرے خیالات جو ان کے مراسلات میں آئے ہیں فی الواقع کچھ دنوں کے بعد "رابطۂ قلمیہ" کی تشکیل کے موجب بنے[2]۔

مجلہ "الفنون" سے ان کی دلچسپی اس قدر بڑھی کہ یہ "والاوالا" چھوڑ کر نیویارک منتقل ہوگئے "والاوالا" میں قیام کے دوران جامعہ واشنگٹن سے قانون اور ادب (Arts and Law) کی ڈگریاں حاصل کی تھیں۔ ان کے بھائیوں نے ان سے وکالت کرنے کی خواہش کا اظہار کیا، لیکن ادب تنقید اور زبان کی محبت انھیں "نیویارک" کھینچ لائی۔ وہ "الفنون" میں برابر لکھتے رہے۔ ان کی تحریروں کا اصل مقصد ادب کو تقلید اور جمود کے طور طریقوں سے آزاد کرکے کھلا اور صاف ماحول فراہم کرنا تھا۔ ان کے خیالات، کوششوں اور خدمات کی وجہ سے مجلہ "الفنون" کی ادارت

---

[1] میخائیل نعیمہ ۔ السبعون، المرحلۃ الثانیۃ ص ۱۲۳ ، [2] ایضاً ص ۱۶۳-۱۲۶

میں شامل کر لیا گیا۔ اسمیں نسیب عریضہ، عبد المسیح حداد اور خلیل جبران پہلے سے موجود تھے۔ ان کے لئے ایک مکان رہائش کی خاطر فراہم کر دیا گیا لیکن نیویارک کا شور و غوغا انھیں پسند نہیں آیا اور انھوں نے یہاں سے دور کسی جگہ رہنا زیادہ پسند کیا۔ نیویارک چھوڑنے سے پہلے انھوں نے اپنے قصیدہ "النہر المتجمد" کا انگریزی زبان میں ترجمہ کیا جسے لوگوں نے بہت پسند کیا۔ خلیل جبران نے بھی اس پر مبارکباد دی۔[1]

اسی دوران ۱۹۱۷ء میں جرمنی کے خلاف امریکہ نے اعلان جنگ کر دیا۔ پس میخائیل نعیمہ کا نام بھی رضا کار سپاہیوں میں درج کر لیا گیا۔ وہ ان دونوں "ارقش" کے بارے میں اپنے خیالات مجتمع کر رہے تھے اور اپنی "مذکرات الارقش" کا پہلا حصہ لکھ رہے تھے۔ وہ دوبارہ نیویارک واپس آ گئے۔ ابھی مجلۃ الفنون کی ادارت سنبھالی ہی نہیں تھی کہ ۱۹۱۸ء میں فوج کے اندر ان کی خدمات طلب کر لی گئیں۔ ان کی زندگی کا یہ صبر آزما مرحلہ تھا۔ انھیں مختلف قسم کے لوگوں کے ساتھ فرانس بھیج دیا گیا۔ جنگ کے خاتمہ کے بعد بھی ان کی واپسی ممکن نہیں ہوئی بلکہ انھیں جامعہ رین (Rennes) بھیج دیا گیا وہاں ان کے تعلقات ایک فرانسیسی دوشیزہ سے بڑے گہرے ہو گئے تھے۔ اگر انھوں نے کنٹرول نہ کیا ہوتا تو معاملہ حد سے آگے بڑھ جاتا۔ انھوں نے اس فوجی زندگی کے تمام تفصیلات (واقعات، مشکلات، کھانے پینے، ساتھیوں کی باتیں وغیرہ) بیان کر دی ہیں۔[2]

وہ اس مہم کو سر کر کے "والاولا" واپس آتے ہیں اور کچھ دن یہاں قیام کر کے "نیویارک" واپس چلے جاتے ہیں۔ یہاں اُن کے ساتھی ان کا شدت سے انتظار کر رہے تھے۔ ان کی واپسی سے ادبی حلقوں میں زندگی کی لہر دوڑ گئی اور جدید ادبی تحریک کے اغراض و مقاصد وغیرہ پر بحث و گفتگو ہونے لگی۔ اسی دوران انھیں ایک تجارتی کمپنی میں ملازمت مل گئی۔ وہ پانچ سال تک کام کرتے رہے اور ایک چھوٹی سی جھونپڑی میں زندگی بسر کرتے رہے۔ اس پانچ سال کے عرصے میں اور واقعات و حادثات کے ساتھ دو حسین و جمیل عورتوں کے ساتھ عشق و محبت کے واقعات بھی ہیں ان میں سے ایک کے ساتھ یہ اخلاقی حدود کو پامال کر گئے اور کم و بیش پانچ سال تک عیش و عشرت کی زندگی بسر کی ان

---

[1] میخائیل نعیمہ ـ السبعون، المرحلۃ الثانیۃ ص ۱۶۴-۱۸۷ ، [2] ایضاً ص ۱۶۳-۱۲۶

ان دونوں عورتوں کی انھوں نے جو تصویر کھینچی ہے۔ وہ پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ بیحد فصیح، جامع اور مؤثر تصویر[1]۔

مذکورہ مباحث کے درمیان انھوں نے بعض دوسری باتوں کا بھی ذکر کیا ہے مثلاً یہ کہ رشید ایوب اور ایلیا ابو ماضی پر ان کے کیا اثرات ہیں؟ اور نسیب عریضہ اور امین ریحانی کا جدید مہجری ادبی انقلاب میں کیا رول ہے؟ پھر وہ اس کے بعد تحریک "رابطۂ قلمیہ" کے قیام، اس کے اغراض و مقاصد، اس کے ممبران، ان کے مزاج اور علمی استعداد اور تصنیف و تالیف کے میدان میں ان کے کردار کے بارے میں تفصیل سے روشنی ڈالتے ہیں۔ وہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ ایک بار امریکی صدر "ولسن" کو شامی مہاجرین نے ایک عریضہ پیش کیا تھا۔ یہ بھی ان کے ساتھ ولسن کے پاس گئے تھے اور ان کی طرف سے گفتگو کی تھی۔ بیچ میں وہ پھر سابقہ عورت سے محبت کی داستان بیان کرتے ہیں اور پھر کتاب "الغربال" کے ادبی اصولوں پر اور اس وقت اس کے بارے میں اپنے خیال اور تنقید کے بارے میں بعض دوسرے امور پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اسی دوران انھوں نے اپنے کئی افسانوی، شعری، تنقیدی اور ادبی مجموعوں کا تعارف پیش کیا اور ان کے اہم نکات سے قارئین کو واقف کیا[2]۔

۱۹۲۵ء میں انھوں نے اپنا تجارتی کام چھوڑ دیا، کیونکہ یہ ان کے مزاج سے میل نہیں کھاتا تھا۔ اس کے بعد کچھ دوسرے کام بھی کئے لیکن کہیں دل نہیں لگا۔ ان کے اوپر مجموعی طور سے اب بھی زہد و تقشف کا غلبہ تھا۔ اتفاق سے ان کی ملاقات ایک ہندوستانی نوجوان سے ہوگئی جس نے انھیں تصوف کی دو کتابوں کی طرف رہنمائی کی۔ اس کا ان کی فکری زندگی پر بڑا گہرا اثر پڑا۔ زندگی گزارنے کی خاطر بہت سے کام کرنے کے بعد ان کا دل تمام چیزوں سے اچاٹ ہوگیا تھا۔ اب یہ کوئی پرسکون جگہ چاہتے تھے جہاں ان کی روح کی تسکین کا سامان فراہم ہو اور جو زمان و مکان کی بندشوں سے بھی آزاد ہو۔ اس احساس سے مجبور ہو کر انھوں نے "والاداللا" لوٹنے کا عزم کر لیا[3]۔

"والاداللا" میں انھوں نے اپنے بھائی کے ساتھ پہاڑوں کے درمیان تعمیر کردہ ایک گھر میں گرمی کا موسم گزارا۔

---

[1] میخائیل نعیمہ — السبعون، المرحلۃ الثانیۃ ص ۲۹۹-۲۸۶، [2] ایضاً ص ۱۶۲

[3] ایضاً ص ۲۲۵-۲۱۶،

وہاں فطرت کے مناظر سے لطف اندوز ہونے کا بہترین اور سنہرا موقعہ ملا۔ اور اپنے اور کائنات کے بارے میں بہت سے سوالات کا جواب ڈھونڈنے کا ماحول فراہم کیا۔ انھوں نے مچھلی کے شکار کا قصد کیا لیکن مچھلی کی زندگی سے کھیلنے پر ان کے ضمیر نے ان کی ملامت کی اور انھوں نے ہمیشہ کیلئے شکار سے توبہ کر لیا[1]۔

"ولادالا" میں موسم گرما گزارنے کے بعد یہ پھر نیویارک واپس آ گئے۔ یہاں انھوں نے کسی اخبار میں ملازمت کرنی چاہی لیکن اس میں کامیابی نہیں ملی مجبوراً کسی شامی تاجر کے یہاں ملازمت کر لی[2]۔

اس کے بعد وہ اپنے دوست تھیوں اور چھوٹے بھائی "نسیب" جو فرانس میں زیر تعلیم تھا کے بارے میں بہت تفصیل سے گفتگو کرتے ہیں اور ان کے درمیان ہوئی مراسلت کا ذکر کرتے ہوئے بعض خطوط کو نقش کیا ہے۔ ان خطوط میں ادب، انشاء پردازی اور زندگی کے بارے میں بحث کی گئی ہے۔ وہ اس کے بعد فن تصویر پر گفتگو کرتے ہیں اور پھر ایک دوسری خاتون سے اپنی آشنائی کا ذکر کرتے ہیں اس خاتون سے بھی ان کے تعلقات قابل اعتراض حد تک پہنچ گئے تھے۔ انھوں نے اپنی بے راہ روی پر سخت افسوس کا اظہار کیا ہے اور طویل ریاضت و ممارست کے باوجود ضمیر کی آواز کا پاس و لحاظ نہ رکھنے پر ندامت اور شرمندگی ظاہر کی ہے[3]۔

اس کے بعد وہ ۱۹۳۱ء پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اور اس میں خلیل جبران کے سانحۂ انتقال، ان کی تدفین، تدفین کے مراسم، اس کے بعد کے بعض نئے دوستوں کا تذکرہ اور خلیل جبران کے چھوڑے ہوئے کام کی تکمیل وغیرہ پر گفتگو کرتے ہیں۔ پھر وہ مہجر میں اپنے بعض آخری ایام کا ذکر کرتے ہیں اور اس مرحلۂ حیات کا خاتمہ کر دیتے ہیں۔ وطن واپسی کے اور اسباب کے علاوہ ایک سبب مغربی تہذیب کی مادہ پرستانہ سوچ تھی۔ وہ اس سے سخت پریشان تھے۔ یہاں کی ہر چیز ان کے بقول "ایک سراب ہے اور ان کا اپنا اصل مقصود یہاں کبھی نہیں پا سکے گا" اور اس کے بالمقابل ان کے وطن میں ان کے بقول "انھیں کھلی فضا میسر ہوگی فطرت

---

[1] میخائیل نعیمہ ـ السبعون۔ الثانیہ ص ۲۳۲-۲۲۲۔ [2] ایضاً ص ۲۸۵-۲۸۰

[3] ایضاً ص ۲۹۹-۲۸۰

اپنے پورے حسن کے ساتھ سامنے ہوگی اور اس پر غور و فکر کر کے اپنی ذات کی معرفت حاصل کرنا آسان ہوگا"۔ وہ اس مرحلہ کا خاتمہ اپنے بھائی نسیب کے نام لکھے بعض مراسلات اور میجر میں ادب و تنقید کے سلسلے میں اپنی خدمات کے تذکرہ پر کرتے ہیں۔ مجموعی طور سے وہ ادب اور انسانیت کے سلسلے میں اپنی ادا کردہ خدمات سے مطمئن ہیں[1]۔

اپنی خود نوشت کے تیسرے حصے میں میخائیل نعیمہ نے امریکہ سے وطن لوٹنے کے بعد سے لیکر سترہ سال کی عمر تک پہنچنے کے احوال قلمبند کیا ہے۔ وہ واپسی کے وقت سمندر کے سفر کے دوران یہ سوچ رہے تھے کہ وہ گھر لوٹ کر اپنے بھائی کیساتھ کھیتی باڑی کے کاموں میں حصہ لیں گے۔ سمندر کے سفر نے ان کے اندر بہت سے احساسات اور صوفیانہ حقائق کا القاء کر دیا تھا۔ ان تمام کی انھوں نے کتاب میں آغاز ہی میں تصویر کشی کی ہے۔ بیروت پہنچ کر انھیں اپنے گھر پہنچنے کا اشتیاق اور زیادہ مضطرب کر دیتا ہے۔ وہ اپنے دیار کی ہر چیز کی یاد تازہ کرتے ہیں اور ان کی تعریفوں میں اپنا پورا زور بیان صرف کر دیتے ہیں۔ لیکن بیروت ہی انھیں اپنے بھائی نسیب کی بیماری کی اطلاع ملتی ہے جس سے وہ چند ثانیے کیلئے پریشان ہو جاتے ہیں لیکن پھر قدرت کے پورے نظام کو دیکھ کر وہ اطمینان کر لیتے ہیں کہ جسطرح یہ پورا نظام چل رہا ہے اسیطرح ان کے گھر کا نظم بھی چلے گا[2]۔

پھر وہ بیروت اور بیروت سے اپنے گھر کی طرف بذریعہ کار روانگی کا نقشہ کھینچتے ہیں۔ وہاں ان کے گھر کے لوگوں نے ان کا گرمجوشی سے استقبال کیا۔ پھر وہ "شخروب" اور "صنین" جاتے ہیں اور وہاں اپنی قدیم یادیں تازہ کرتے ہیں۔ پھر وہاں کے مناظر کا ایک نقشہ پیش کرتے ہیں۔ گھر واپسی کے بعد ان کے گاؤں کے لوگوں نے ان کے اعزاز میں ایک تقریب منعقد کی۔ انھوں نے یہاں جو خطبہ دیا اور اس کے علاوہ دوسری تقریبات میں جو خطبے دیئے ان کو اپنی کتاب "زاد المعاد" میں شائع کر دیا[3]۔

---

[1] میخائیل نعیمہ ـ السبعون، الثانیہ، ص ۲۹۹-۳۲۵ ، [2] ایضاً ص ۳۳-۷

[3] ایضاً ص ۳۴-۴۷

انھوں نے شخروب میں تنہائی اختیار کرلی ۔ وہاں درخت کی شاخوں کا ایک خیمہ بنایا اور اسمیں اپنے ہی ہاتھ لکھنے پڑھنے کیلئے ایک منبر اور کرسی بنائی ۔ وہاں کے پورے ماحول سے انھیں بے پناہ سرور حاصل ہوا لوگ ان سے ملنے کیلئے وہیں جاتے تھے ۔ ان کی گوشہ نشینی اور تنہائی پسندی کو دیکھ کر ان کے ایک ساتھی توفیق عواد نے ان کا لقب ہی "ناسک الشخروب" دے دیا ۔ انھوں نے اپنی اس زندگی اور اس کے بارے میں اپنے ساتھیوں کے احساسات پر مشتمل ایک مقالہ تحریر کیا جسے اپنی کتاب "صوت العالم" میں شائع کیا[1] ۔ لیکن ان کی یہ تنہائی اور فارغبالی بہت دنوں تک باقی نہیں رہ سکی ۔ ان کے بھائی کی طبیعت اور زیادہ خراب ہوگئی اور ان کے علاج معالجہ اور دوسرے کاموں میں ان کے پاس جمع تقریباً تمام پیسے ختم ہوگئے چنانچہ انھوں نے اپنے عزیز مطبوعہ مقالات اور افسانوں کو نکال کر "الراحل" نامی کتاب میں جمع کیا اور اسے اپنے خرچ پر شائع کیا ۔ اس کام میں انھیں کچھ مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑا ۔ اس کے بعد وہ اپنی کتاب "زاد المعاد" میں اپنے ان خطبات کو جمع کرتے ہیں جو انھوں نے بیروت ، دمشق اور فلسطین میں مختلف اجتماعات کے دوران دیئے تھے[2] ۔

۱۹۳۲ء کے موسم گرما میں ان کا سب سے بہترین معمول یہ تھا کہ وہ جبل صنین کے اردگرد کچھ دیر ٹہل کر اسکی چوٹی پر چڑھ جاتے تھے پھر وہاں سے وسیع و عریض کائنات کا مشاہدہ کرتے تھے ۔ اس وقت یہ تمنا ہوتی کہ اے کاش ان کے اختیار سے ان کے ایک اشارے ، ایک بات یا ایک احساس کے نتیجے میں اس کائنات کی طرح لوگوں کے دل بھی ایک ہو جائیں ۔ اور اس کے اندر محبت ، طمانیت اور مسرت کی کیفیت پیدا ہو جائے اور پھر وہ دل دنیا میں اور دنیا اس دل میں تحلیل ہو جائے ۔ اور ان سب کے تحلیل ہونے سے ایک ایسی خوبصورتی پیدا ہو جائے جسے کبھی فنا یا زوال نہ ہو[3] ۔

پھر موسم سرما آتا ہے اور وہ اسی حال میں گزر جاتا ہے کہ ان کے بھائی کا مرض دن بدن

---

[1] میخائیل نعیمہ ۔ السبعون ، المرحلۃ الثانیۃ ص ۵۲-۵۸ ، [2] ایضاً ص ۵۳-۵۵ ،
[3] ایضاً ص ۸۳-۷۲ ،

شدید ہوتا جاتا ہے۔ اس کے بعد موسم بہار میں ان کی طبیعت بالکل خراب ہوگئی۔ ان سے موت کو قریب دیکھ کر نعیمہ پہلے خوف و ہراس محسوس کرتے ہیں لیکن پھر وہ موت کی حقیقت کو یاد کرکے اپنے آپ کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ آخر کار ان کے کھانسی کا وقت آن پہنچا اور وہ موت کی ابدی نیند سو گئے۔ نعیمہ نے اس ابدی نظام کی ایک حقیقت سمجھ کر آسانی برداشت کرلیا۔ لیکن ان کے گھر کے لوگوں کا برا حال تھا۔ انھوں نے اس پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔[1]

موسم بہار غم و اندوہ کے عالم میں گزر گیا۔ اس کے بعد کے موسم گرماں میں وہ اپنے خاندان کیساتھ وادی "شخروب" میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ یہاں وہ ایک اونچی چٹان کو اپنا گرجا گھر بنا کر اسمیں غور و فکر کرتے ہیں، لکھتے پڑھتے ہیں اور زائرین کا استقبال کرتے ہیں۔ وہ اپنے زائرین سے اسی چٹان پر بیٹھنے کیلئے اصرار کرتے تھے۔ وہ اس چٹان کو دریا میں رواں دواں اس کشتی سے تشبیہ دیتے ہیں جس سے پانی کی لہریں آکر ٹکراتی ہیں اور پھر ناکام و نامراد واپس چلی جاتی ہیں۔ دنیا اور اس کی شہوات و لذات کے سامنے ان کی مثال اس کشتی سے بہت زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے۔ انھوں نے اپنی خواہشات کو دفن کر دیا تھا۔ صرف خلود کی خواہش باقی تھی کیونکہ دوام اور ابدیت تمام افکار و خیالات کا آخری انجام ہے۔ باقی دوسری خواہشات۔ مثلاً کسی ادارے کی صدارت، انتخاب میں حصہ لینا اور پیسے کمانا۔ ان سب سے انھوں نے اپنے آپ کو الگ کرلیا تھا۔ مال و دولت کو وہ ایک آزمائش تصور کرتے ہیں اور فقر و فاقہ کو روحانی ترقی کیلئے مفید اور کارآمد سمجھتے ہیں۔ انھوں نے جنسی خواہشات کی تکمیل سے بھی اپنے آپ کو روک رکھا تھا۔ اب اس کا خیال بھی ان کے دل میں نہیں آتا تھا۔[2]

وہ مذکورہ چٹان پر اپنی کتاب "جبران خلیل جبران" کی تالیف کرتے ہیں۔ اس کا انھوں نے اپنی خود نوشت میں تفصیلی تعارف پیش کیا ہے۔ انھوں نے اپنے منہج تالیف اور اغراض تالیف سے قارئین کو

---

[1] میخائیل نعیمہ ـــ السبعون، المرحلة الثانية ص ۸۳-۷۲ ، [2] ایضاً الثالثة ص ۱۰۰-۹۲ ،

واقف کیا ہے۔ اور یہ بتایا ہے کہ اس سے انھوں نے کس طرح اپنے دوست کے اوپر عائد کئے گئے الزامات اور تہمتوں کا ازالہ کیا ہے۔ اپنی اس کتاب کے بارے میں انھوں نے خلیل جبران کے بعض قریبی ساتھیوں کے تاثرات بھی نقل کیے ہیں جنہوں نے مجموعی طور سے اسے کافی پسند کیا تھا۔[۱]

وہ اس کے بعد گاؤں کی اپنی پرسکون اور اطمینان بخش زندگی کی تصویر کشی کرتے ہیں اور گاؤں میں اپنی بعض مصروفیات کا تذکرہ کرتے ہیں۔ خاص طور سے اپنے کھیت میں پانی لانے کیلئے نالی کھودنے کی زحمتوں کا وہ تذکرہ کرتے ہیں۔ یہ ان کے والد کی شدید خواہش تھی لیکن جب اس کا انتظام ہوا تو وہ انتقال کر چکے تھے۔ وہ اس موقعہ کی مناسبت سے انھیں یاد کرتے ہیں اور کھیتی باڑی سے ان کی دلچسپیوں کا تذکرہ کرتے ہیں[۲]۔ اس کے بعد وہ بہت تفصیل سے کائنات، فطرت اور انسان کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں اور اپنے نتائجِ فکر پیش کرتے ہیں[۳]۔ پھر جنگ عظیم دوم کا اعلان ہو جاتا ہے۔ نعیمہ اپنی رہائش کیلئے ایک مکان کی تعمیر کا پروگرام بناتے ہیں اور جنگ کے باعث اشیاء کی قیمتیں زیادہ ہونے سے پہلے ہی یہ تعمیر کے تمام سامان خرید لیتے ہیں۔ چنانچہ وہ اپنے گھر کے تمام لوگوں کی رہائش کے قابل ایک مکان تعمیر کر لیتے ہیں۔ اس طرح ان کی والدہ کی ایک دلی تمنا پوری ہوتی ہے۔ لیکن نعیمہ کا حال یہ تھا کہ وہ سہولیات اور آسائشوں سے آراستہ اس گھر میں رہنے سے گھٹن محسوس کرتے تھے۔ ان کا یہ خیال تھا کہ ان کو حقیقی سکون وسہولیات کی فراہمی سے نہیں ملا کرتا ہے۔ یہ سکون تو صرف روحانیت کے ذریعہ حاصل کیا جا سکتا ہے پھر وہ جنگ کی ہلاکت خیزی اور تباہ کاری کا تفصیل سے تذکرہ کرتے ہیں اور اسے پوری انسانیت کی پیشانی پر کلنک تصور کرتے ہیں[۴]۔ لیکن اس جنگ کی بدولت ان کو ذاتی طور سے جو فائدہ ہوا اس کا بھی تذکرہ کرتے ہیں۔ انھیں لبنان کی فرانسیسی ریڈیو سروس میں کام کرنے کا موقعہ ملا، بہت سے اخبارات سیاسی وادبی ادارے اور انجمنیں قائم ہوئیں۔ ان سب میں ان کو کسی نہ کسی حیثیت میں شرکت

---

[۱] میخائیل نعیمہ ـ السبعون الثالثة، ص ۲۲۲-۱۰۱، [۲] ایضاً ص ۱۳۲-۱۲۳، [۳] ایضاً ص ۱۳۸-۱۳۵
[۴] ایضاً ص ۱۶۰-۱۵۹،

کا شرف حاصل ہوا۔ اسطرح انھیں کچھ مالی فائدے ہوئے جس کو انھوں نے گھر کی تعمیر، زمین کی اصلاح اور بھتیجوں کی تعلیم و تربیت پر صرف کیا۔[1]

۱۹۴۱ء میں ان کی والدہ کا انتقال ہو جاتا ہے۔ اس موقعہ پر انھوں نے ان کی یاد میں ایک مقالہ لکھا جسمیں ان کی شفقت، محبت اور توجہ کا بڑے اچھے انداز میں تذکرہ کیا ہے۔ وہ ان کے مسلسل پڑھنے کی وجہ سے ان کی صحت کے بارے میں سخت متفکر تھیں۔ ان کی تجرد کی زندگی پر بھی انھیں بیحد افسوس تھا۔[2]

جنگ عظیم دوم کے دوران انھوں نے جو مقالات لکھے تھے ان کا بعض منتخب حصے بھی انھوں نے اپنی خودنوشت میں نقل کر دیا ہے۔ اسی طرح اپنی ان ادبی تخلیقات کا تعارف پیش کیا ہے جو "بیادر"، "صوت العالم"، اور "البؤس والدیجور" کی شکل میں لوگوں کے سامنے آئیں۔ وہ اپنے دوست "نسیب عریضہ" کی وفات (۱۹۴۷ء) کے موقعہ پر ان کی زندگی اور خدمات پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہیں اور دونوں کے درمیان ہوئی مراسلت کے بعض حصے بھی نقل کرتے ہیں۔ خاص طور سے وہ خط جسے انھوں نے وفات کی خبر پاکر "میخائیل حداد" کے نام لکھا تھا۔[3]

اس کے بعد انھوں نے خواب، خوارق اور مصادفات کے نام سے بعض ایسے احوال یا واقعات کا ذکر کیا ہے جو ان کے ساتھ یا ان کے علاوہ کسی اور کے ساتھ پیش آئے۔ وہ اپنے مخصوص تجربات کی روشنی میں ان کی صداقت کے قائل ہیں اور اس کی معرفت بھی انسان کے لئے ممکن بتاتے ہیں۔ اس کا ایک باقاعدہ فلسفہ انھوں نے اپنے عالمی نقطۂ نظر کی مدد سے پیش کیا ہے۔[4] اس کے بعد وہ لبنان کی آزادی پر گفتگو کرتے ہیں۔ ۱۹۴۳ء میں اس کے آزاد ہونے کے بعد یہاں کے لوگوں میں انارکی، فرقہ پرستی، لاقانونیت رشوت خوری اور ظلم و زیادتی کے جو مظاہر دیکھنے میں آئے ان پر بڑی سخت تنقید کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اس وقت لبنان اور پورے عالم عرب میں سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ

---

[1] السبعون — میخائیل نعیمہ الثالثہ ص ۱۶۰-۱۶۳، [2] ایضاً ص ۱۶۹-۱۷۲، [3] ایضاً ص ۱۶۹-۱۷۰
[4] ایضاً ص ۱۸۶-۱۸۰،

لوگ سرحدوں، مکانات، فوجوں اور کارخانوں کی تعمیر سے پہلے انسانیت، آزادیت، شرافت اور وقار کی تعمیر و تحصیل میں لگ جائیں۔ یہ چیز پیسے، خواہشات، دعاؤں اور وعدوں سے نہیں بلکہ لوگوں کی از سر نو تربیت سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ جب تک پورا عرب اس کام میں مصروف نہیں ہوگا اس وقت تک دوسری قوموں کے ساتھ چلنا ممکن نہیں ہوگا۔[1]

پھر انھوں نے اپنے گھر کی ایک تصویر کھینچی ہے اور اپنے بھائی، ان کی بیوی اور بچوں کے بعض احوال بیان کیے ہیں۔ ان ہی کے ساتھ وہ رہتے تھے اور ان سے ان کی بہت سی یادیں وابستہ تھیں۔ خاص طور سے اپنی ایک بھتیجی سے ان کو بے انتہا لگاؤ اور محبت تھی۔ وہ ان سے بہت خوش رہتی تھی۔[2] اس کے بعد انھوں نے اپنی کتابوں "مذکرات اندرشتش"، "لقاء" اور "کتاب مرداد" کے موضوعات، اصل قیم، ان کے آغاز و اختتام اور اسلوب وغیرہ پر روشنی ڈالی ہے۔ اسی ذیل میں اپنی بعض کتابوں کے انگریزی زبان میں ترجمہ کرنے کی مصلحت اور حکمت بھی واضح کی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ چونکہ وہ صرف عربوں کیلئے نہیں لکھتے ہیں بلکہ وہ تمام لوگوں کیلئے لکھتے ہیں۔ ان کی فکر صرف عربی فکر نہیں ہے بلکہ یہ آفاقی اور انسانی فکر ہے اس لئے ان کیلئے ضروری تھا کہ وہ اپنی اہم تحریروں کو انگریزی زبان میں منتقل کریں۔ انگریزی زبان دنیا کی اہم اور سب سے زیادہ پڑھی اور بولی جانے والی زبان ہے۔[3]

وہ اپنی خود نوشت کی آخری فصل میں مذکورہ بالا کتب کے تعارف کے علاوہ ۱۹۴۹ء سے لیکر ۱۹۵۹ء تک کے ذاتی اور دیگر احوال میں سے بعض اہم حادثات کو بیان کرتے ہیں۔ ان میں امریکہ میں ان کے ایک بھائی کا انتقال، "شخروب" کی زمین کی اصلاح، درستگی اور آراستگی، ایک نئی جھونپڑی کی تعمیر، ایک کار کی خریداری اور ۱۹۵۷ء میں روس کا سفر وغیرہ شامل ہے۔[4] روس سے واپسی کے بعد انھوں نے اشتراکیت اور دوسرے نظام ہائے حکومت کے بارے میں یہ تاثر دیا کہ "یہ سب انسانی

---

[1] ایضاً ص ۱۹۴-۱۸۹ ، [2] ایضاً ص ۲۰۸-۱۹۵ ، [3] ایضاً ص ۲۲۰-۲۰۹

[4] ایضاً ص ۲۲۲-۲۲۰ ،

قلوب کی تطہیر اور تزکیہ میں ناکام رہے ہیں اسکی وجہ سے برائیاں بڑھتی جارہی ہیں اور انسان مشکلات سے دوچار ہوتا جارہا ہے۔ کیونکہ ہر نظریہ صرف عقل پر توجہ دیتا ہے اسے قلب سے زیادہ سروکار نہیں ہوتا ہے۔ اس صورت حال میں دل کی طمانیت اور سکون کا حصول ناممکن ہے"[1]۔

۱۹۵۸ء میں یہ ایک چٹان پر گر پڑے تھے اسکی وجہ سے ان کی پہلی ٹوٹ گئی تھی انھوں نے اسی واقعے کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ اس سے انھیں صبر و تحمل کا ایک نیا تجربہ ہوا۔ وہ اس حادثے کو اپنے کسی عمل، نظریہ یا خواہش قلبی کا نتیجہ قرار دیتے ہیں لیکن قطعی طور سے کوئی ایک وجہ بتانے سے قاصر ہیں[2]۔

کتاب کے آخیر میں انھوں نے دنیا کے اہم حادثات (مثلاً شام، مصر اور عراق کے انقلابات عرب اشتراکی کوششیں، چین کا عروج وارتقاء اور عوام کی طاقت کا اعتراف وغیرہ) پر سرسری نظر ڈالی ہے اور انسان، کائنات، انسان کی خوشی، اسکی پریشانی اور خیر و شر کے بہت سے امور پر روشنی ڈالی ہے[3]۔

کتاب ختم کرنے سے پہلے انھوں نے پھر اپنی تالیف کی غرض و غایت اور اسلوب و طریقہ کار کی وضاحت کی ہے۔ یہ تقریباً آغاز میں جو کچھ کہا تھا اسی سے ملتی جلتی باتیں ہیں[4]۔ اصل زور ان کا اس بات پر ہے کہ "اپنی ذات سے حجاب ہٹا دینے کے بعد ہی انسان کو بصیرت حاصل ہوتی ہے اور اسی بصیرت سے کائنات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ انسان اپنے بارے میں جو کچھ کہہ دیتا ہے وہی اسکی زندگی کی اصل تصویر ہوتی ہے۔ باقی اس کے علاوہ جو کچھ ہے اسکی حیثیت جھاگ کی مانند ہے"[5]۔ بالکل آخیر میں انھوں نے مکوں اور اس کے مفہوم پر ایک مفید گفتگو کی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ باتوں کا مفہوم سمجھنا زیادہ مشکل نہیں ہے بلکہ اصل مشکل ان نقوش راہ کی معرفت ہے جو ان کلمات سے واضح ہوتے ہیں اور پھر ان پر ثبات قدمی سے عمل آوری ہے[6]۔

---

[1] ایضاً ص ۲۲۳ ، [2] ایضاً ص ۲۲۴-۲۲۵ ، [3] ایضاً ص ۲۲۷-۲۳۰

[4] " ص ۲۳۱-۲۳۷ ، [5] " ص ۲۳۱-۲۳۲ ، [6] " ص ۲۳۸-۲۳۱

کتاب پر ایک تجزیاتی نظر

اس خود نوشت سوانح عمری کے مضامین وغیرہ کے مختصر تعارف کے بعد یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کی خوبیوں، اوصاف اور نمایاں امور سے متعلق بعض ایسے مباحث زیر بحث آئیں جن سے جدید و قدیم خود نوشت سوانح ادب میں اس کتاب کا مقام و مرتبہ اور اسکی امتیازی شان واضح ہو سکے اس کے ساتھ ان کمزور پہلوؤں کی نشاندہی بھی کی جائے جن کی موجودگی سے کتاب کی عظمت متاثر ہوئی یا اگر وہ موجود نہ ہوتے تو اس کی افادیت، اہمیت اور قدر و منزلت میں مزید اضافہ ہو جاتا۔

اس کتاب کے مطالعہ کرنے سے اس کا سب سے نمایاں وصف جو سامنے آتا ہے یہ ہے کہ اسمیں ہمیں بیک وقت ناول نگاری، ڈرامہ نگاری اور مقالہ نگاری کے فنی عناصر یکجا ہو گئے ہیں، فن ناول نگاری سے واقعات کے مابین داخلی اور خارجی دونوں اعتبار سے ربط پیدا کرنے اور مختلف احوال احساسات و تاثرات کی تصویر کشی کرنے میں مدد لی گئی ہے۔ فن ڈرامہ نگاری کے ذریعہ زندگی کی مختلف نوعیتوں کی ڈرامائی کشمکش اور مختلف لوگوں کے ساتھ ہونے مکالمات اور ڈائیلاگس کی تصویر کشی میں مدد لی گئی ہے۔ بوقت ضرورت حقیقت کو ذہنوں میں مستحضر کرنے اور اجزاء کتاب کے درمیان ربط پیدا کرنے کی غرض سے بعض خیالی کلمات کا اضافہ بھی کیا گیا ہے۔ فن ناول نگاری سے اپنے طریقہ کار، تاثرات، میلانات اور مخفی جذبات کی تحلیلی و تجزیاتی پیشکش میں مدد لی گئی ہے۔ کتاب میں یہ تینوں عناصر باہم دگر اس طرح ضم ہو گئے ہیں کہ ان سے ایک نیا اور منفرد اسلوب پیدا ہوتا ہے۔ اس کا قاری بیک وقت کبھی یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ ڈرامہ پڑھ رہا ہے اور کبھی ناول اور کبھی مقالہ پڑھنے کا احساس کرتا ہے۔ دور حاضر کی خود نوشت میں ان تینوں اصناف سخن کی یکجائی بیک وقت نہیں ملتی ہے یہ اس کتاب کے مصنف کی امتیازی اور انفرادی شان کو واضح کرتی ہے۔

اس خود نوشت سوانح عمری کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ اسمیں واقعات و حوادث کے بیان کرنے میں زمانی تسلسل، منطقی ترتیب اور تدریج کا پاس و لحاظ رکھا گیا ہے اور حقائق کی وضاحت و تفسیر میں مراسلات اور ڈائری کے ایک قابلِ ذکر حصہ سے مدد لی گئی ہے اور جہاں ضرورت محسوس ہوئی شخصیات و مقامات کے ناموں کے صراحت اور سن و تاریخ کا تعین بھی کر دیا گیا ہے۔ اس کتاب میں مذکور مختلف حقائق کے درمیان رابطہ اور اتحاد پیدا کرنے کی بھی پوری کوشش کی گئی ہے اور اس مقصد کیلئے تصویر تخیل، تشویق، مکالمہ اور تحلیل و تجزیہ سے کام لیا گیا ہے۔

اس خود نوشت کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ یہ اپنے مصنف کی زندگی میں اس کے بچپن سے لیکر بڑھاپے تک جو تغیرات اور انقلابات آئے ہیں اور اسے زندگی کے کٹھن سفر میں جن دقتوں اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا ان سب کی انتہائی دقیق تصویر پیش کرتی ہے۔ اسمیں نفس کے داخلی پہلوؤں کا اتنا عمیق تجزیہ کیا گیا ہے کہ اسکی نظیر ہماری جدید خود نوشت سوانح عمریوں میں نہیں ملتی ہے۔ اس کتاب کا یہ پہلو اس پر اس قدر غالب ہے کہ اسے دوسرے الفاظ میں مصنف کے ذریعہ اپنی ذات کو عریاں کرنے کی ایک سنجیدہ کوشش کہا جا سکتا ہے۔ اسمیں نفس کی حقیقت کی تلاش، اس کا محاسبہ، اسے خواہشات، شہوات اور لذات سے دور رکھنا اور برائیوں و گندگیوں سے پاک و صاف رکھنا یہ اور اس طرح کے دوسرے اہم نفسیاتی امور زیر بحث آئے ہیں۔ ان تمام امور میں سچائی، جرأت، بے لوثی معروضیت اور عزم و ہمت کی جس مقدار میں ضرورت پیش آتی ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔ اس خود نوشت میں یہ تمام اوصاف بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ اور اسکی مثالیں اس کے مضامین پر گفتگو کے وقت بکثرت گزر چکی ہیں۔

اس خود نوشت سوانح حیات کی ایک نمایاں خوبی یہ ہے کہ اس میں ایک مقصدیت پائی جاتی ہے

اور پوری کتاب اس مقصد کے گرد گھومتی ہے۔ وہ مقصد مصنف کا اپنے اس نقطۂ نظر کی وضاحت ہے جو اپنی ذات اور کائنات پر طویل غور و فکر کے بعد اسے حاصل ہوا تھا۔ یہ ایک عالمی اور آفاقی نقطۂ نظر ہے جس کی بنیاد اُس فلسفۂ "وحدت الوجود" پر قائم ہے جسکی کوئی نہ کوئی شکل ہر دور، ہر قوم اور ہر مذہب کے ماننے والوں کے یہاں موجود رہی ہے اور جو بہت سے مشہور صوفیاء اور مفکرین کا مسلک رہا ہے۔ اس فلسفہ تک مصنف کی رسائی کافی جدوجہد اور معرفت کی طویل مسافت طے کرنے کے بعد ہوئی تھی۔[1] اس کی وجہ سے انہیں اپنے نفس کیساتھ سخت کشمکش سے دوچار ہونا پڑا اور شہوات و لذات کے بہت سے مواقع ضائع کرنے پڑے۔ ان کی فکر کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ کائنات اور اسکی تمام چیزیں بشمول انسان سب ایک ہیں۔ یہ باہم ہم جنس ہیں اور ایک دوسرے سے بالکل ملے جلے ہیں۔ اس لئے کسی مفروضے کی بنیاد پر ممالک یا انسانوں کے درمیان کوئی تفریق نہیں کی جا سکتی ہے۔ ملک کی حیثیت انسانیت کے سمندر میں ایک نقطہ کی ہے اور پوری کائنات کے اندر انسانیت کی حیثیت بھی ایک قطرۂ آب کے مانند ہے۔ پس ان ان اس وسیع و عریض کائنات کا ایک جزء ہے۔ اسے آپس میں محبت اور تعاون کرنا چاہئے اور اپنے درمیان مختلف طرح کی حد بندیوں اور بندشوں کا خاتمہ کرنا چاہئے۔ اور ہر طرح کے اختلافات اور جھگڑے رفع کر لینے چاہئے۔ اسی میں اس کی بھلائی اور عافیت ہے۔[2]

انسان کیطرح کائنات کی ہر چیز کے بارے میں غور و فکر کرتے ہوئے یہی نظریہ "وحدت الوجود" کارفرما نظر آتا ہے۔ گویا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ "وحدت الوجود" کا نظریہ ان کے رگ و پے میں رچ بس گیا تھا۔ یہاں تک کہ یہ ان کی فکر کا غالب حصہ بن گیا تھا۔ اس کے نتیجے میں وہ اس کائنات کو بامقصد منظم اور محکم حقیقت تصور کرنے لگے تھے۔ یہاں کی ہر چیز میں ایک نظم نظر آتا تھا اور ہر ایک کا وجود یا عدم وجود ایک نظام کا پابند معلوم ہوتا تھا۔ اسمیں انہیں زبردست حکمت، تدبیر اور دانائی کے کرشمے

---

[1] میخائیل نعیمہ ــــ السبعون، المرحلۃ الثانیۃ ص ۲۸-۲۵،

[2] " " ص ۶۵-۴۳،

نظر آتے تھے اور وہ ان کی عقل کو بھی اس کا ایک حصہ سمجھتے تھے۔ اس نظریے کی وجہ سے خیر و شر، عروج و زوال، علم و جہالت، امن و بدامنی الغرض ہر چیز کے بارے میں ان کی ایک مخصوص سوچ ہو گئی تھی۔ اسے انھوں نے اپنی خود نوشت میں ہر جگہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے[1]۔

اس خود نوشت میں مصنف نے اپنی اہم فکری کتابوں "مذکرات اخ رقیش"، "مرداد" اور "دلشاد" ــــ کے موضوعات پر، مواد، بنیادی قیم، زمانۂ تالیف اور اسلوب وغیرہ کے تعارف کے ساتھ ساتھ اپنی فکری زندگی کی پوری داستان۔ از ابتدا تا انتہا۔ قلمبند کر دی ہے۔ اس سے ان کے فکری ارتقاء کی تاریخ، اہم مؤثرات و عوامل اور مرحلہ بمرحلہ واقع ہونے والے تغیرات و انقلابات کا صحیح طور سے اندازہ ہوتا ہے۔ اور یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ انسان اگر علم و معرفت کی راہ میں آگے بڑھنا چاہتا ہے تو اسے دنیا اور اس کے لوازمات سے کنارہ کش ہونا ہوگا اور اس عمل کا آغاز اور اس کی مشق و ممارست بچپن ہی سے کرنی ہوگی[2]۔ مصنف نے بالکل ابتدائی زندگی میں جب کہ وہ پرائمری اسکول میں زیر تعلیم تھے اپنے آپ کو تنہائی اور علیحدگی کا عادی بنا لیا تھا اور عمر کیساتھ ساتھ اس عادت میں برابر اضافہ ہوتا گیا۔ حالانکہ ان کی زندگی میں ایسے بہت سے مواقع آئے جب ان کی اس عادت پر براہ راست حملے گئے اور اس کا دوام و استمرار معرض خطر میں پڑ گیا۔ روس اور امریکہ کی ہنگامہ خیز زندگی، دوستوں، اساتذہ اور متعلقین کے تقاضے، حسیناؤں کی سر راہ اور یکطرفہ دعوت اقدام دو عظیم جنگوں کی آمد اور خاتمہ، فقر و فاقہ اور عیش و عشرت کی زندگیاں، الغرض کسی چیز اور کسی معروفیت نے ان کے اس عمل میں خلل نہیں ڈالا اور وہ اپنی منزل ــــ ذات اور کائنات کی معرفت ــــ کیطرف رواں دواں رہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ جہاں بھی گئے وہاں کی علمی و فکری فضا سے خوب خوب مستفید ہوئے۔ وہ ایک طرف تو اپنی تعلیم میں امتیازی نمبرات حاصل کرتے رہے تو دوسری طرف اساتذہ، منتظمین اور دوسرے

---

[1] ایضاً ص ۶۵-۶۲ ، [2] ایضاً ص ۲۵۰-۲۴۹ المرحلۃ الاولیٰ ،

مفکرین سے اپنا گہرا ربط اور تعلق بنائے رکھا۔ روس میں یہ اگر "ٹولسٹوی" کے افکار و نظریات سے متاثر تھے[1] تو امریکہ میں "ماسونیہ" اور "الجمعیۃ الشیوفیۃ" جیسی مذہبی جماعتوں سے منسلک ہو کر مستفید ہوئے۔ اس کے علاوہ وہ برابر مسیحی اور اسلامی فلسفہ اور دوسرے مشہور عالمی فلسفوں اور نظریات کا مطالعہ کرتے رہے۔ انھوں نے خاص طور سے یونانی اور مسلم فلاسفہ کے نظریات کا مطالعہ کیا تھا[2]۔ انھیں اس حقیقت کے سراغ سے بے انتہا خوشی ہوئی تھی کہ دنیا کے اہم مذاہب اور نظریات کا سرچشمہ ایک ہے، سب نے حقیقت کی تلاش کیلئے مختلف راہیں اختیار کیں لیکن سب کا حاصل ایک تھا۔ انسان کو جو رفعت اور بلندی بھی نصیب ہوئی ہے وہ ان ہی نظریات کے بدولت ہوئی ہے۔ اس لئے اسے جدید سائنس و ٹکنالوجی کے بجائے ان نظریات ہی میں اپنی مشکلات کا حل تلاش کرنا چاہئے۔ وہ مشرق و مغرب کے علمی و فکری سرچشموں سے اپنی لب اور استطاعت بھر استفادہ کے بعد زندگی کے آخری حصے میں اپنے وطن لوٹ آئے۔ یہاں گاؤں، کھیت، پہاڑ، وادی اور دریا کے قدرتی مناظر کے درمیان ایک گوشۂ تنہائی اختیار کرنے اور پھر اسی میں معتکف ہو جانے میں انھیں جو راحت اور طمانیت نصیب ہوئی وہ بیان سے باہر ہے۔ اب ان کی توجہات کا مرکز اپنے حاصل شدہ نظریے کی تزئین، تشریح، تفسیر اور تبلیغ تھا۔ وہ اپنی تحریروں، مقالات، خطبات اور باتوں سے لوگوں کو اپنے نظریے سے آگاہ کرتے تھے[3]۔

اس خود نوشت سوانح حیات میں چونکہ مصنف نے اپنے مذکورہ نظریہ "وحدۃ الوجود" کی پوری طرح وضاحت کر دی ہے اس لئے اس حیثیت سے یہ کتاب ایک ایسے عظیم انسان کی تاریخ بن جاتی ہے جس نے تصوف کے عمیق اصولوں کا تجربہ کیا تھا اور ان اصولوں کی روشنی میں اپنی تربیت اور تزکیہ کیا تھا۔ اس طرح یہ کتاب قدیم صوفی ادباء کی خود نوشت سوانح میں ایک مفید اضافہ ہے جس کا اپنا مخصوص مزاج اور اپنے منفرد اوصاف ہیں۔ اگر ان تمام کتابوں کو سامنے رکھ کر اس کتاب کا

---

[1] ایضاً ص ۲۲۰-۲۱۸ ، [2] ایضاً ص ۲۹-۲۴ ،

[3] " الثالثہ ص ۱۹۹-۶۸ ،

تقابلی مطالعہ کیا جائے تو فکری زندگی میں اس کے اثرات اور اس کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ ہو سکے گا۔

اس کتاب کو اپنی تمام ہم مقصد کتابوں پر اس حیثیت سے نمایاں امتیاز حاصل ہے کہ اس میں افکار، احساسات اور واقعات کے منتقل کرنے میں تحلیل و تجزیہ اور وصف و تصویر کا خصوصی خیال رکھا گیا ہے۔ ان کی تحریروں کے مطالعہ کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بعض چیزوں کے بارے میں ہمارے جو احساسات تھے جب انھوں نے ان کی صورت گری کی تو ان میں نمایاں اضافہ ہوا۔ ان کا انداز تحلیل و تصویر صداقت اور شرح و بسط پر مبنی ہوتا ہے۔ تجزیے اور تصویر کے اس عمل میں انھیں اپنے صوفی مزاج سے بہت مدد ملی۔ یہ مزاج ہر چیز پر غور و فکر کرنے اور اس کی گہنہ و حقیقت کو سمجھنے کا مطالبہ کرتا ہے اور آدمی کے تعلق کو کائنات اور اس کے مظاہر سے مضبوط و مستحکم کرتا ہے۔ اس طرح سے انھوں نے کائنات کی مختلف چیزوں کا جو نقشہ پیش کیا ہے وہ واقعہ ہے کہ بیحد حقیقت پسندانہ، جاذب نظر اور لائق مطالعہ ہے[1]۔

اس خود نوشت کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں خواب، خوارق، مصادفات اور وحی و الہام کے تعلق سے بعض دوسری شکلوں پر گفتگو کی گئی ہے۔ مصنف اپنے مخصوص نظریے کی مدد سے ان تمام امور کی حقیقت سے واقف ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ انھوں نے بہت سے ایسے واقعات نقل کئے ہیں جن سے یہ ثابت کیا ہے وہ کیسے بعض حقائق کا علم مذکورہ ذرائع سے حاصل کر لیتے تھے۔ وہ ان سب کو علم و معرفت کا ایک ذریعہ قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ سائنس اور ٹکنالوجی کی مدد سے اگر ان ذرائع کا اثبات نہ ہو پا رہا ہو تو اس کا مطلب ان کی نفی نہیں ہے یہ ایسے حقائق ہیں جن کا اعتراف ہمیشہ سے کیا جاتا رہا ہے اور بھی اگر ان ان چاہے تو جسمانی ریاضت اور نفسیاتی مشق و ممارست کے ذریعہ اپنے اندر ان ذرائع سے استفادہ کی صلاحیت پیدا کر سکتا ہے[2]۔

---

[1] الدکتور عبد الکریم ـــ النثر المہجری ص ۲۳۲-۲۳۳ مطبعۃ اللجنۃ القاہرۃ ۱۹۵۵م

[2] میخائیل نعیمہ ـــ السبعون، المرحلۃ الثانیۃ، ص ۱۲۲-۲۱۴، المرحلۃ الاولیٰ ص ۱۱۲-۱۱۴

گرچہ اس خودنوشت سوانح حیات میں ایک مخصوص نظریے اور فکر کی وضاحت اور تبلیغ کی گئی ہے اس کا تقاضہ یہ تھا کہ جو افکار، حادثات یا واقعات کتاب کے اصل موضوع سے مطابقت نہ رکھتے ہوں انھیں بیان نہ کیا جائے، لیکن اس کے باوجود اس کے مصنف کی جرأت، ہمت اور حق گوئی و بے باکی دیکھیے کہ اس نے ایسے تمام امور بیان کر دیتے ہیں۔ ان کے اوپر گزشتہ صفحات میں تفصیل سے روشنی ڈالی جا چکی ہے، یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ مصنف نے عورت صنف کے بارے میں اپنے جو تجربات اور جس صراحت سے بیان کیے ہیں وہ جدید و قدیم، جدید عربی زبان کے ادباء کے یہاں بہت کم دیکھنے کو ملتا ہے۔ یوں تو مصنف نے عورت ذات سے اپنی معرفت اور آشنائیوں کے دسیوں واقعات بیان کیے ہیں لیکن یورپ کے سفر میں تین عورتوں سے اپنے باضابطہ تعلقات کا اعتراف کیا ہے۔ ان عورتوں کے حسن، ان کی طرز ادا، گفتار و کردار اور سراپے کی جو تصویر کھینچی ہے وہ جدید عربی ادب میں ایک اضافہ ہی تصور کی جائے گی۔ یہاں اصل مسئلہ تصویر یا توصیف کا نہیں بلکہ اس سچائی اور صاف گوئی کا ہے جس کی وجہ سے مصنف نے اپنے سیاہ کارناموں کا اعتراف کیا ہے ورنہ تقدس، پاکی اور طہارت کے جو دعاوی وہ کرتے رہے اور جن تکمیل و تحصیل کیلئے وہ زندگی بھر کوشاں رہے ان کا لازمی تقاضہ یہ تھا کہ وہ ان چیز واقعات سے صرف نظر کر لیں۔ جو بہرحال ان کی خواہش کے علی الرغم شہوانی جذبات کی مسلسل پرورش اور صنف مخالف کی طرف سے مسلسل سعی و کوشش کے بعد وقوع پذیر ہوئے تھے۔ مصنف نے اپنے آپ کو حسن و عشق کے طوفان بلاخیز میں بہت زیادہ سنبھالنے کی کوشش کی۔ انھیں بہتر مواقع پر نمایاں کامیابیاں بھی ملیں۔ لیکن ایک موڑ پر جا کر اپنے اوپر سے کنٹرول کی صلاحیت انسان کے اندر سے ختم ہو جاتی ہے اور وہ جذبات سے مغلوب ہو کر وہ کام کر گزرتا ہے جس پر اسے تاحیات افسوس اور ندامت ہوتی ہے۔ یہی معاملہ کتاب کی مصنف کے ساتھ بھی پیش آیا۔[1]

---

[1] ایضاً المرحلۃ الاولی ص ۱۶۱-۱۶۰، ۱۸۷-۱۷۶، ۱۶۳-۱۶۲، ۲۵۷-۱۹۲،

اس خود نوشت سوانح حیات کی خوبیوں اور اوصاف پر ایک نظر ڈالنے کے بعد یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بعض ان کمیوں اور نقائص کا تذکرہ کیا جائے جن کی موجودگی کے باعث کتاب کی فنی حیثیت متأثر ہوئی اور عبارت کے حسن و جمال میں کمی واقع ہوئی ہے۔

کتاب کے مطالعہ کے دوران سب سے زیادہ جس نقص کا شدت سے احساس ہوتا ہے وہ یہ کہ اس کے بعض مقامات پر مناظر فطرت کی تصویر کشی میں ضرورت سے زیادہ توجہ دی گئی ہے یہ کبھی کبھی اس قدر طویل ہو جاتی ہے کہ اصل مقصد نگاہوں سے اوجھل ہونے لگتا ہے۔ مناظر فطرت کی تصویر کشی میں طوالت کا ایک سبب مصنف کا فطری محاسن سے بے انتہا لگاؤ، الفت اور محبت ہے صحیح بات یہ ہے کہ وہ فطرت کے آغوش ہی میں پلے بڑھے اور یہی ان کے تجربات کی آماجگاہ بنی ان کے تمام افکار و خیالات کو تحریک اور غذا یہیں سے ملتی رہی۔ لیکن ان سب کے باوجود اگر وہ چاہتے تو اپنی بات کچھ مختصر انداز میں رکھ سکتے تھے اور اس طرح اصل مقصد تالیف کو اور اچھی طرح واضح نمایاں اور صاف طور سے پیش کر دیتے۔

اس کتاب میں دوسرا سقم یہ نظر آتا ہے کہ اسمیں بعض ذیلی اور ضمنی واقعات و حقائق کی تفصیل و تشریح پر بہت زیادہ توجہ دے دی گئی ہے۔ بلاشبہ ان میں ایسے امور تھے کہ اگر ان کا ذکر اختصار سے کر دیا جاتا تو کتاب اور اس کے مفاہیم میں ادائیگی اور افادیت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی، مثلاً خواب، خوارق اور مصادفات ہی کا معاملہ ہے تو معلوم ہوتا کہ ان کے بیان کرنے میں اور بہت سے مقامات پر ان کی ہومیانہ افادیت واضح کرنے میں بے جا طوالت سے کام لیا گیا۔ لیکن فطری مناظر کی طرح یہ بھی مصنف کی مجبوری تھی۔ وہ ان کے ذریعہ اپنی زندگی کے بارے میں ایک اہم نفسیاتی رہنمائی فراہم کرنا چاہتے تھے۔

اس کتاب کے بعض مقامات پر فخر و مباہات کا عنصر کارفرما نظر آتا ہے۔ یہ بھی اس خود نوشت کیلئے ایک نقص قرار پایا۔ اس سے اسکی صداقت خواہ بالکل معمولی ہی سہی متاثر ہوئی ہے غالباً اسی جذبے کے تحت انھوں نے ان خطوط کو خاص طور سے شائع کیا ہے۔ جن میں ان کی نگارشات کی مدح و ستائش کی گئی ہے۔ اپنے بعض قصائد کے تذکرہ کے وقت خاص طور سے انھوں نے اس طرح کے کچھ خطوط نقل کئے ہیں[1]۔ وہ ان خطوط پر فخر کرتے ہوئے خود لکھتے ہیں:۔

"اگر میں ان عبارتوں کو شائع کرنا چاہوں جن میں دوسروں نے میری مدح و ستائش کی ہے تو اس کے لئے ایک سے زیادہ جلدیں درکار ہوں گی"۔[2]

"ان خطوط میں خوشی اور مسرت کا اس حد تک اظہار کیا گیا ہے کہ وہ عبادت تک جا پہنچتی ہے"۔[3]

اسی طرح انھوں نے اپنی خود نوشت میں مختلف تعلیمی اداروں میں اپنے تعلیمی کیریئر کی بہت تعریف کی ہے اور اپنے کو ہمیشہ ممتاز طالب علم بتایا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے اپنے نام مختلف لڑکیوں کے ذریعہ تحریر کردہ خطوط میں سے صرف ان خطوط کو شائع کیا ہے جن میں ان کی شخصیت رشک اور ان سے ملاقات کی حسرت کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہ زیادہ تر عشق و محبت کی ابتداء کا ذمہ دار دوسروں کو قرار دیتے ہیں اور اپنے آپ کو ہمیشہ بے نیاز ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہمیں یہاں اس سے بحث نہیں ہے کہ یہ سب بیانات صحیح ہیں یا مبالغہ آمیز ہیں۔ ہم ان کی صداقت پر بھی یقین کر لیتے ہیں لیکن اس کے باوجود یہ بات کہی جا سکتی ہے ان کی شخصیت اس طرح کے بیانات کی محتاج نہیں تھی۔ وہ ایک شہرۂ آفاق مایہ ناز ادیب تھے اس لئے ان بیانات سے ان کی شہرت اور اہمیت میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا ہے البتہ قاری کے ذہن میں بلا وجہ کے شبہات اور شکوک پیدا ہوتے ہیں جو ایک بہترین خود نوشت کیلئے مناسب نہیں۔

---

[1] ایضاً المرحلۃ الاولیٰ ص ۱۱-۱۰ ، [2] ایضاً ص ۱۲ ، [3] ایضاً ص ۱۲ ،

اس خود نوشت سوانح عمری کا ایک نقص یہ ہے کہ اسمیں اس کے مصنف نے اپنی ڈائری خطوط، قصائد اور تصنیفات میں سے بہت سے حصے بلا ضرورت نقل کر دیے ہیں۔ ڈائری ان کے پاس موجود تھی۔ وہ مختلف مواقع سے اس ڈائری کی عبارتیں نقل کرتے ہیں[1]۔ ان کا یہ عمل فی الواقع قابلِ اعتراض نہیں ہے لیکن جب وہ ایک ہی بات کو ثابت کرنے کیلئے کئی اقتباسات نقل کرتے ہیں اور ان کے درمیان ربط و ترتیب کی کوئی فکر نہیں کرتے ہیں اور اس طرح خود نوشت کی فنی حیثیت متاثر ہوتی ہے تو اس وقت یہ عمل قابلِ اعتراض ہوتا ہے۔ اسی طرح ان کی خود نوشت میں ان کے متعدد ایسے خطوط شامل ہیں جن کے بارے میں یہ خیال ہوتا ہے کہ انھیں زبردستی شامل کر لیا گیا ہے اگر وہ ان کے طویل نصوص کے نقل کرنے کے بجائے صرف بقدرِ ضرورت حصے نقل کر لیتے ہیں تو کوئی حرج نہیں تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان خطوط کی اہمیت کا انکار کیا جا رہا ہے یقیناً ان میں سے بعض بیحد اہم ہیں[2]۔ لیکن اصل مسئلہ موقع و محل اور موضوع و مواد کی مناسبت کا ہے۔ یہی معاملہ ان کے قصائد اور تصنیفات کا ہے۔ ان کے دواوین طبع ہو چکے تھے اس کے باوجود ان میں سے لمبے لمبے قصیدے بلا کسی کمی یا اختصار کے نقل کر دیئے ہیں، ان کی تصنیفات کا حال بھی یہ ہے کہ وہ زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکی تھیں لیکن ان میں سے بہت سے اقتباسات انھوں نے اپنی خود نوشت میں نقل کر دیئے ہیں[3]۔ اگر وہ چاہتے تو ان کے بیشتر حصے نظر انداز کر سکتے تھے اور اس طرح ایک مربوط، مستحکم، دقیق اور قدرے مختصر سوانح پیش کرتے۔

اس خود نوشت میں کہیں کہیں تکرار، استطراد، اسہاب اور تفصیل کی شکایتیں بھی ملتی ہیں، اس کے مصنف نے بعض مقامات پر مثلاً اپنی جائے پیدائش، خاندان، دادا دادی، مدرسہ کیمبرج اور بعض متعلقین کی امریکہ ہجرت اور واپسی وغیرہ کی ضرورت سے زیادہ تفصیل فراہم کر دی ہے۔

---

[1] میخائیل نعیمہ ـ السبعون، المرحلۃ الاولیٰ ص ۱۹۸-۱۷۹، [2] ایضاً المرحلۃ الثالثۃ ص ۱۷۹-۱۷۵،
[3] ایضاً ص ۷۳-۶۹،

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھیں جو کچھ یاد تھا اسے بیان کر دینا چاہتے ہیں۔ وہ ان کی ترتیب اور تسلسل کا بھی کوئی خاص خیال نہیں رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے ایسی شکل میں ان تفصیلات کے وجود پر انگلی اٹھائی جائے گی۔ ایک طرف تو ان تفصیلات لاذر وائڈ کا معاملہ ہے لیکن دوسری طرف حال یہ ہے کہ زندگی کے بعض اہم واقعات ذکر کرنے سے رہ گئے ہیں۔ پوری زندگی میں ایسے کتنے واقعات کے ساتھ یہ معاملہ پیش آیا ہوگا لیکن آخری عمر میں ان کی بعض معلوم سرگرمیاں ایسی تھیں جن کے بارے میں لوگوں کو امید تھی کہ وہ ان کے بارے میں اپنی رائے دیں گے لیکن وہ انھیں نظر انداز کر گئے۔ ان ہی میں سے ایک واقعہ ان کا مصر میں منعقد عرب ادباء کی کانفرنس میں ۱۹۵۶ء میں شرکت کرنا ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے واقعات جن کے تذکرہ کی کوئی ضرورت نہیں تھی مثلاً اپنے بھائی نسیب کی سوانح، اس کے بیوی بچوں حتیٰ کہ کتے کا تذکرہ وغیرہ تو یہ سب وہ تفصیل سے بیان کرتے ہیں[1]

مذکورہ سطور میں اس خود نوشت سوانح عمری کے جن کمزور پہلوؤں کا تذکرہ ہوا ہے ان سے مقصود صرف یہ تھا کہ اس کا مطالعہ ہر لحاظ سے مکمل ہو جائے۔ ورنہ صحیح بات یہ ہے کہ اس کتاب کے محاسن کے سامنے ان نقائص کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ یہ بلاشبہ جدید عربی ادب کی لائق ستائش، لائق مطالعہ اور قابل تقلید خود نوشت سوانح حیات ہے۔ اسمیں ادبی خود نوشت کے فنی اجزاء وافر مقدار میں پائے جاتے ہیں ہماری جدید و قدیم خود نوشت سوانح عمریوں میں سے کسی میں[2] بھی بیک وقت یہ تمام فنی خوبیاں موجود نہیں ہیں اگر ان کو مختصراً بیان کیا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایک ایسے عظیم ان ن کی دقیق سوانح حیات ہے جو اپنے دور کی پوری ان نی تاریخ کا نمائندہ ہے۔ اسمیں صداقت، اخلاص اور انکساری کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔ پوری کتاب کے مطالعہ سے مصنف کی شخصیت بالکل عیاں اور بے حجاب ہو جاتی ہے۔ اس میں نفس کے داخلی پہلوؤں کا جس گہرائی سے جائزہ لیا گیا ہے اور شخصی ارتقاء کے مختلف مراحل

---

[1] میخائیل نعیمہ ـ السبعون الثالثة ص ۱۸۰-۱۸۲، الاولیٰ ص ۲۶۳-۲۶۸،

[2] عبد الکریم الأشتر ـ فنون النثر المهجری ص ۲۴۲-۲۴۳،

کو جس باریکی سے پیش کر دیا گیا ہے وہ اسے عربی زبان کے سوانحی لٹریچر میں ایک منفرد اور ممتاز مقام پر فائز کر دیتی ہے۔ اسمیں چونکہ فن ڈرامہ و ناول اور فن مقالہ نگاری کے عناصر یکجا کر دیئے گئے ہیں اس لیے ہر اعتبار سے مکمل خودنوشت ہوگئی ہے۔ اس کا امتیاز یہ ہے کہ یہ طٰہٰ حسین کی طرح مکمل اسلوب افسانہ نگاری پر اعتماد نہ کرتے ہوئے بھی افسانہ کے بہت سے عناصر کو سمیٹے ہوئے ہے۔ ظاہر ہے مصنف کو تاریخی حقائق کا پاس و لحاظ رکھنا تھا وہ فنی اوصاف کی خاطر خیالات اور تصورات کی دنیا میں بہت دور نہیں جا سکتے تھے تاہم حسب موقع اور حسب ضرورت انھوں نے ان فنی اصولوں کو یکجا اور استعمال کرنے سے دریغ نہیں کیا ہے[1]۔ اس خودنوشت کا جیسا کہ وضاحت ہو چکی ہے ایک نمایاں امتیاز یہ ہے کہ اسمیں ایک مقصدیت پائی جاتی ہے اور مصنف اپنے مقصد کے حصول کیلئے ہر جگہ چوکنا نظر آتے ہیں اور کوئی لمحہ بلاوجہ ضائع نہیں کرنا چاہتے ہیں۔ اس طرح یہ کتاب مصنف کی زندگی، اس کے دور، اس کے ادب اور رفقاء و متعلقین کی ایک جاذب نظر اور دلکش تصویر ہوگئی ہے۔ اس کا خاصہ یہ ہے کہ اس سے مہجری ادب، مہجری تحریک، جدید عربی ادب پر اس کے اثرات، اس کے اصول و مناہج اور اہم میدان کار کا تفصیلی تعارف ہو جاتا ہے۔ اس سلسلے میں اس کی وسعت، ہمہ گیری اور جامعیت کا آج تک کوئی دوسری کتاب مقابلہ نہیں کر سکی ہے، الغرض یہ ایک ایسی فکری اور ادبی کتاب ہے جو ادبی پیرائے میں ہماری جمالیاتی اور نفسیاتی حس بیدار کرتی ہے۔ ہمارے ایمان کو حرارت اور عقل کو بصیرت عطا کرتی ہے اور ہماری عقلی، منطقی اور روحانی ضرورتوں کی تکمیل کرتی ہے۔ اس طرح یہ بلاشبہ ایک منفرد اور ممتاز خودنوشت سوانح حیات ہے جس پر عربی ادب کو بجا طور سے فخر ہے[2]۔

[1] عبد الکریم الاشتر ــــ فنون النثر المہجری ص ۲۲۲-۲۲۵ ، دار الفکر الحدیث لبنان ۱۹۶۵ء

[2] ص ۲۲۵

أنا

عباس محمود العقاد

عباس محمود عقاد کی خود نوشت سوانح حیات "أنا"[1] عصر حاضر کی ان چار سوانح عمریوں میں سے ایک ہے جس کے مطالعہ کے بغیر اس عہد کی ادبی تاریخ اور ادبی و سیاسی رجحانات کو سمجھنا ممکن نہیں۔ ان میں سے طٰہٰ حسین کی "الایام" احمد امین کی "حیاتی" اور میخائل نعیمہ کی "سبعون" پر گذشتہ صفحات میں مختصر یا طویل گفتگو کی جا چکی ہے۔ عباس محمود عقاد کا شمار جدید عربی ادب کے ممتاز اور نمایاں ادباء میں کیا جاتا ہے۔ اپنی محنت، لگن، سعی مسلسل اور اشتیاق کی بدولت انہوں نے اپنے معاصرین کے درمیان اہم مقام حاصل کر لیا ہے۔ ادب، تنقید، صفحات، شاعری اور سیرت نگاری میں ان کی خدمات ہمیشہ جلی حروف سے لکھی جائیں گی۔ وہ ایک ہمہ جہت اور کثیر التصانیف ادیب تھے۔ ان کی تحریروں سے فکر و نظر کے بہت سے اہم گوشے اجاگر ہوئے۔ اور بہت سی اہم اصناف سخن کو نئے رنگ و آہنگ ملے۔

یہ خود نوشت عقاد کی باضابطہ تصنیف نہیں ہے۔ بلکہ یہ ان کے مقالات کا مجموعہ ہے۔ مقالات زیادہ تر مشہور مصری مجلہ "الہلال" کے مطالبہ پر تحریر کئے گئے تھے۔ اور اسی میں شائع بھی ہوئے۔ البتہ بعض مقالات دوسرے مصری جرائد مثلاً "الصور" اور "القافلہ" وغیرہ میں شائع ہوئے تھے۔ ان سب مقالات کو ان کے دوست اور مشہور مصری ادیب "طاہر احمد الطناجی" نے کتابی شکل میں یکجا کر دیا۔

---

[1] عباس محمود العقاد، أنا، دار الہلال قاہرہ (ب ت)

اور اس کا نام "اُنا"[1] رکھا۔ وہ اس نام کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"ناظرین میری رائے سے ضرور اتفاق کریں گے کہ یہ عنوان اس کتاب کے مضامین کیلئے بہت زیادہ موزوں ہے کیونکہ اسمیں عقاد کی ذاتی و نفسیاتی زندگی کا تذکرہ ہے۔ اگر عقاد مرحوم زندہ ہوتے تو اس عنوان کو نامنظور نہ کرتے۔ کیونکہ وہ الہلال میں نشر ہونے والے بعض مقالات کے عنوان اور بعض کتابوں کے نام کی تعیین کا کام میرے حوالہ کر دیتے تھے۔ انہیں یہ بھروسہ تھا کہ میں مناسب نام منتخب کرتا ہوں"[2]

اس کتاب میں صرف ان ہی مقالات کو یکجا کیا گیا ہے جن میں مصنف نے اپنی زندگی اور نفسیاتی، فکری اور ادبی خصوصیات بیان کی ہیں۔ یہ کتاب کل نو فصلوں پر مشتمل ہے اور ہر فصل کے تحت کئی چھوٹے چھوٹے مقالات ہیں۔ کسی فصل کا کوئی ایسا نام متعین ہے جو اس کے مقصد اور غرض و غایت کو واضح کر دے۔ ان فصلوں کے مطالعہ سے مصنف کی شخصیت کے کچھ گوشے بہرحال نمایاں ہو جاتے ہیں۔ اور شخصیت کے ارتقائی مراحل سے کسی حد تک واقفیت بھی ہو جاتی ہے۔

چنانچہ پہلی فصل، جس میں کل چھ چھوٹے چھوٹے مقالات ہیں، میں مصنف نے اپنے بارے میں اور اپنے والدین کے بارے میں، شہد، بچپن اور عید کے بارے میں الگ الگ موضوع بنا کر گفتگو کی ہے۔ اپنے بارے میں سب سے پہلے انہوں نے یہ بتایا کہ عام طور سے لوگ ان کی جو تصویر پیش کرتے ہیں۔ ان سے انہیں شدید اختلاف ہے۔ وہ یہ تو نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں کس روپ میں پیدا کیا[3]۔ البتہ لوگ انہیں، متکبر

---

[1] عباس محمود عقاد، اُنا ص ۵ - ۷ (مقدمہ) [2] ایضاً ص ۸ (مقدمہ)

[3] ایضاً ص ۲۷۔

سخت دل، کتابوں کا کیڑا، غور و فکر میں مستغرق، جذبات سے عاری اور غیر معمولی خشک مزاج ثابت کرنے کی جس انداز میں مہم چلائی تھی۔ اس سے اختلاف کرتے ہوئے اپنی تصویر خود اپنے الفاظ میں اسطرح پیش کرتے ہیں۔

"میں انتہائی منکسر المزاج اور نرم دل انسان ہوں۔ کتابوں سے میرا تعلق جینے کیلئے ہے۔ مجھ پر ہر لمحہ دل و جذبات کا غلبہ رہتا ہے ---- ------ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ عباس العقاد کی بعینہٖ یہی تصویر ہے۔ لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ یہ روپ اس سے زیادہ قریب اور اسکی شخصیت کا صحیح ترجمان ہے۔ اس روپ میں میں اسے پہچان سکتا ہوں اور ہو سکتا ہے کہ دوسرے بھی پہچان لیں"[1]

اس کے بعد انہوں نے اپنی منکسر المزاجی اور نرم دلی کی مثالیں بیان کی ہیں۔ اور پھر یہ بتایا ہے کہ انہوں نے مال و دولت، علمی اعزازات و خطابات اور جاہ و منصب کے بتوں کو ٹھکرا کر ادب و ثقافت کے ذریعہ عزت و سربلندی کے حصول کی جو کامیاب کوشش کی اس پر ان بتوں کے پجاریوں کی مجھ پر سخت ناراضگی اور غصہ ہے۔ وہ میرے خلاف حسد اور انتقام کی آگ میں جل رہے ہیں۔ اور پھر اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کیلئے مجھ پر تکبر، دغا اور فخر و غرور کا الزام لگاتے ہیں۔ انہوں نے اپنی گوشہ نشینی اور خلوت پسندی کو اپنے مزاج اور فطرت کا لازمی حصہ بتایا ہے۔ اس کے بعد بعض ایسے ذاتی اوصاف کا ذکر کیا جس سے ایک طرف ان کی طبیعت کی نرمی کا اندازہ ہوتا ہے۔ تو دوسری طرف بعض اصولوں کے تئیں ان کی سختی کا ثبوت ملتا ہے۔ لیکن ہر حال میں

---

[1] عباس محمود العقاد، أنا ص ۱۔

اس میں ان کی طرف سے کوئی بناوٹ، تکلف یا فخر و غرور کا شائبہ نہیں ہوتا۔

ان کے بیانات کے مطابق ان کی پیدائش ۲۸ جون ۱۸۸۹ء کو "اسوان" شہر میں ہوئی۔ ان کی ادبی زندگی کا آغاز نو سال کی عمر میں ہو گیا تھا۔ انہوں نے پہلی نظم علم سے متعلق لکھی تھی۔ ۱۹۰۷ء میں جب کہ ان کی عمر محض پندرہ سال کی تھی مدرسوں کی تعلیم سے فارغ ہو کر انہوں نے حکومت میں ملازمت کر لی۔ لیکن وہاں ملازمین کے استحصال اور ان پر ظلم سے کبیدہ خاطر ہو کر قاہرہ واپس لوٹ آئے۔ اور "مجلس الفنون والآلات" اور لسانیات اکیڈمی کے ممبر بنے۔[1]

والد کے ذکر سے پہلے انہوں نے یہ بتایا کہ چونکہ ان کے دادا دمیاط کا باشندہ اور ریشم کا کاروبار کرتے تھے۔ اسلئے ریشم بننے کی مناسبت سے ان کا لقب عقاد ہو گیا۔ اور پھر اس وقت سے تمام لوگوں کے نام کا یہ لفظ جزو بن گیا۔ ان کے والد بے حد متقی، پرہیزگار اور متدین تھے۔ بچوں کی تعلیم و تربیت کے سلسلہ میں غیر معمولی طور سے سنجیدہ بلکہ سخت واقع ہوئے تھے۔[2] یوں تو ان کی سخت گیری کی بہت سی مثالیں ہیں۔ لیکن ایک مثال خاص طور سے قابلِ ذکر ہے۔ اس سے عقاد کی بھی ضد اور اصرار کا ایک نمونہ سامنے آتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"والد صاحب چاہتے تھے کہ دس سال سے کم ہی عمر میں میں نماز کا پوری طرح پابند ہو جاؤں۔ اس سلسلہ میں صبح کی نماز کا معاملہ میرے لئے بے حد مشکل ہوتا تھا۔ میں صبح کو بمشکل تمام بستر چھوڑتا تھا۔ ایک مرتبہ میں نے سرکشی میں بیدار کرنے والے سے کہہ دیا کہ جاؤ

---

[1] عباس محمود العقاد، أنا ص ۳۰

[2] ایضاً ص ۳۱

میں نہیں اٹھتا اور نہ نماز پڑھتا۔ والد صاحب یہ سن کر چیخ پڑے اور بولے کہ
تم نماز نہیں پڑھو گے۔ اور پھر چھڑی اٹھالی۔ یہ دیکھ کر میری ضد ختم ہونے
کے بجائے اور بڑھ گئی میں نے "ہاں" کہہ دیا۔ یہ سن کر وہ خاموش ہو گئے۔ لیکن
بہت دنوں تک مجھ سے بات چیت نہیں کی۔ حالانکہ ہم لوگ صبح و شام
کھانے کیلئے ایک ساتھ ہی بیٹھا کرتے تھے۔"[1]

والد صاحب صوبۂ رسوان میں "محفوظات" کے سکریٹری تھے۔ بہت
ایماندار اور محنتی آدمی تھے غلط طریقوں سے مال و دولت حاصل کرنے سے سخت بیزار اور متنفر
تھے۔ عزیز و اقارب کا خیال رکھتے تھے۔ اور تحفے تحائف کا تبادلہ کرتے تھے۔ انہیں اپنی عزت و تکریم
کا پاس و لحاظ تھا۔ دینی کتابوں سے محبت تھی۔ وطنی تحریک سے بھی ان کو دلچسپی تھی۔ اور
بعض وطن پرست اخبارات و جرائد کے مسلسل خریدار تھے۔[2]

انکی والدہ کا خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ یہ خاندان دیار مکہ سے کوچ کر کے سوڈان
میں مستقل طور سے سکونت پذیر ہو گیا تھا۔ والدہ، والدہ کے آباؤ اجداد بڑے متقی، شریف
غیور اور بہادر تھے۔ انکی ایمانداری، تقویٰ اور بہادری کے بہت سے واقعات لوگوں کی معلوم تھے۔
والدہ اپنے آباؤ اجداد کی مذکورہ صفات سے متصف تھیں۔ انہیں اپنے بزرگوں سے خاموشی
اور گوشہ نشینی بھی وراثت میں ملی تھی۔ اس کا سبب تکبر ہرگز نہیں تھا۔ بلکہ یہ ان کا طبعی میلان
اور پیدائشی عادت تھی۔ انکی والدہ ان سے بے حد محبت کرتی تھیں۔ البتہ انہیں ان کے
کاغذ، قلم والے کام سے نفرت تھی۔ وہ اسے ان کی تجرد کی زندگی کا بنیادی سبب
قرار دیتی تھیں۔ انہیں انتظام و انصرام کی بے حد صلاحیت بھی حاصل تھی۔ اخراجات میں میانہ روی اور

---

[1] عباس محمود العقاد، أنا ص ۳۲ - ۳۳ .

[2] ایضاً ص ۳۲ .

مالی دشواریوں پر کنٹرول ان کا خاص ملکہ تھا۔[1]

اپنے شہر کا تعارف کراتے ہوئے انہوں نے اس کے دینی، ادبی، علمی اور فنی تاریخ پر روشنی ڈالی ہے۔ اور عہد فراعنہ سے لیکر عہد اسلامی تک کے تمام ارتقائی مراحل پر اختصار سے گفتگو کی ہے۔ وہ اس کے فطری مناظر اور قدرتی عطیات کا ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ۔

"اگر مجھے دنیا کے کسی گوشے میں پیدا کر کے یہاں آنے کا اختیار دیا جاتا تو میں اسے فوراً منتخب کر لیتا۔ کیونکہ یہاں میرے ذوق کی بہت سی چیزیں فراہم ہیں۔"[2]

وہ اس شہر کو ماضی و حاضر کی تاریخ کا سنگم قرار دیتے ہیں۔ یہاں مختلف قوموں اور ملکوں کے باشندے مقیم ہیں۔ اور اس شہر کو اپنی مادر علمی اور مدرسہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اس شہر کی آب و ہوا نے ان کے ادب میں یکسانیت، سیاسی فکر میں عالمیت اور وطنی و قومی تصور میں آفاقیت عطا کی ہے۔[3]

اس کے بعد وہ اپنے بچپن کی بعض یادوں کا ذکر کرتے ہیں۔ لیکن اس سے پہلے اپنے حافظے کے بارے میں یہ نظریہ پیش کرتے ہیں کہ یہ ایک خود مختار اور با استبداد ملکہ ہے۔ کسی معین ضابطے کے بغیر یہ اپنی خواہش کے مطابق امور و واقعات کو یاد رکھتا یا بھلاتا ہے۔ واقعات کے حجم یا زمانے کے قرب و بعد کا اس میں کوئی دخل نہیں۔ کبھی کوئی انتہائی معمولی واقعہ پچاس سو سال تک حافظے میں باقی رہتا ہے۔ اور کبھی کوئی غیر معمولی واقعہ چند دنوں یا ہفتوں کے بعد ذہن سے محو ہو جاتا ہے۔[4]

---

[1] عباس محمود العقاد، أنا ص ۳۲۔ [2] ایضاً ص ۴۲ - ۴۴۔

[3] ایضاً ص ۴۳ [4] ایضاً ص ۴۵۔

مذکورہ نظریہ کے مطابق وہ اپنے بہت سے یادگار واقعات کو بطور مثال پیش کرتے ہیں۔ ان کے تین سال کی عمر میں ایک درگاہ کی زیارت، سات سال کی عمر میں ہیضہ کی وبا، اور دس سال کی عمر میں ایک سبک اندام یورپین لڑکی کا مشاہدہ اور تصویر کشی خاص طور سے قابلِ ذکر واقعات ہیں[1]۔ انہیں بچپن ہی سے انشاء پردازی اور مطالعۂ کتب کا بے پناہ شوق تھا۔ اسوان کے مدرسہ میں مضمون نویسی کیلئے جو موضوعات دیئے جاتے تھے۔ ان میں دو چیزوں کے درمیان تقابلی پہلو ہمیشہ ملحوظ رکھا جاتا تھا۔ عقاد ہمیشہ کمزور پہلو کی حمایت میں مضمون لکھا کرتے تھے۔ ان کے استاذ ان کی اس روش کو پسند کرتے تھے۔ کیونکہ اس سے قلم میں پختگی ہوتی ہے۔ ایک مرتبہ شیخ عبدہ مدرسہ کا معائنہ کرنے آئے تو استاذ نے میری کاپی ان کے سامنے رکھی۔ انہوں نے بعض عنوانات کے بارے میں کچھ سوالات کئے۔ اس پر متوجہ ہو کر یہ جملہ کہا "آئندہ یہ لڑکا بڑا انشاء پرداز ہوگا"۔ عقاد کہتے ہیں کہ اس جملہ کا مجھ پر بہت اثر پڑا۔ یہیں سے میرے اندر انشاء پردازی کا عزم و شوق پیدا ہوا جو برابر ترقی کرتا رہا[2]۔

مطالعۂ کتب سے ان کے شوق کا عالم یہ تھا کہ انہوں نے اپنے ذاتی اخراجات سے پیسے بچا کر بہت سی قیمتی اور مفید کتابیں خریدی تھیں۔ حالانکہ یہ اوسط درجہ کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اور ان کو صرف بقدر ضرورت ہی رقم ملا کرتی تھی۔ اس سے بہرحال بآسانی کتابوں کی خریداری ممکن نہیں تھی۔ وہ اپنی خریدی ہوئی کتب کے علاوہ اپنے والد کی مذہبی کتابیں، مختلف رسائل و دوائر اور مدرسہ کی لائبریری سے بھی برابر استفادہ کرتے رہتے تھے[3]۔ ایک بار ایک مسلمان انگریز سیاح سے ان کی

---

[1] عباس محمود العقاد، أنا ص ۴۶ ـ ۴۷ [2] ایضاً ص ۴۸

[3] ایضاً ص ۴۹ ـ ۵۰ .

ملاقات ہوئی۔ اس نے وطن واپس جاکر ان کے لئے قرآن مجید کا ترجمہ اور کارلائل کی کتاب "انقلاب فرانس" بطور ہدیہ بھیج دیں۔ عقاد کہتے ہیں کہ ان کتابوں سے مجھے قرأت و مطالعہ میں بہت مدد ملی۔ جب میرے مطالعہ میں وسعت ہوئی تو میں اس حسن انتخاب سے بہت خوش و متاثر ہوا۔ کیونکہ مطالعہ کیلئے بنیادی عقائد اور معاشرتی انقلاب کے فلسفہ ہی کی اہمیت ہے[۳]۔

اس کے بعد عقاد نے عید کے تعلق سے اپنی بعض یادداشتوں کو قلم بند کیا ہے۔ غروب آفتاب کے بعد ہی سے مبارک بادی کے تبادلے، عورتوں کا قبرستان کی زیارت، مردوں کی تقسیم صدقہ و خیرات، نئے نئے کپڑوں کی تیاری، بچوں کو خاص طور سے نہلانے دھلانے، انہیں نظر بد سے بچانے کیلئے دوسرے کے سامنے برا بھلا کہنا، عید کی تقسیم، اس کے لئے بچوں کی لوٹ مار اور بڑے بوڑھوں سے اس کا مطالبہ یہ اور اس طرح کی بہت سی باتیں عید کے تعلق سے اس خود نوشت میں آگئیں ہیں[۲]۔

اس کتاب کی دوسری فصل میں انہوں نے اپنے اساتذہ، انتہاء پردازی کے محرکات اور سرکاری ملازمت سے علیحدگی کی تفصیلات بیان کی ہیں۔ اساتذہ کے بارے میں سب سے پہلی بات انہوں نے یہ بتائی کہ انہیں اپنے اساتذہ کو خود منتخب کرنے کا موقع ملا[۳]۔ یہ تمام لوگ تصنیف و تالیف کے میدان میں نمایاں حیثیت کے مالک تھے۔ وہ ان میں سے جس سے جب چاہتے استفادہ کرتے۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے اساتذہ کی علمی حیثیت، طریقہ درس، ان سے اخذ و استفادہ کی مقدار اور ان کے ساتھ گزرے بعض اہم واقعات کا ذکر کیا ہے۔ جن اساتذہ کے نام

---

۱ عباس محمود العقاد، أنا ص ۵۱ ۲ ایضاً ص ۵۲ - ۵۶

۳ ایضاً ص ۵۷

صراحت سے لئے ہیں۔ ان میں سے ادب اور تاریخ کے استاذ شیخ محمد فخر الدین اور والد کے متعین کردہ استاذ شیخ احمد الجدادی خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ اسی دوران انہوں نے شیخ محمد عبدہ کا بھی بڑی عقیدت اور احترام سے ذکر کیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ انہیں اپنا روحانی معلم تصور کرتے تھے۔ اور ان کے بعض تحسینی جملوں کو اپنے لئے مشعلِ راہ سمجھتے تھے۔ اساتذہ کے ذکر کے وقت انہوں نے اپنے بعض ساتھیوں کی ان کے ساتھ شرارتوں کا تذکرہ بھی کیا ہے[1]۔

انشاء پردازی کے محرکات میں انہوں نے حوصلہ افزائی کے کلمات مساعد حالات اور رغبت و لگن کو بنیادی اہمیت دی ہے۔ وہ ان تینوں محرکات کی موجودگی کو انشاء پردازی کے لئے ضروری قرار دیتے ہیں۔ بصورت دیگر کامیابی کا حصول مشکل ہوگا۔ اگر کسی آدمی کی حوصلہ افزائی کی گئی لیکن مناسب حالات میسر نہیں آئے تو کوئی فائدہ نہیں۔ اسی طرح حوصلہ افزائی اور مناسب حالات کے ساتھ اگر انسان کے اندر خود رغبت نہ ہو تو ایسی صورت میں بھی کامیابی ممکن نہیں ہے۔ اپنے بارے میں ان کا یہ خیال ہے کہ ان کی انشاء پردازی میں تینوں عوامل اور محرکات شامل ہیں[2]۔ ان کے اساتذہ کی طرف سے ان کی برابر حوصلہ افزائی ہوتی رہی تھی کہ شیخ محمد عبدہ نے یہ کہکر "ما اجدرھذا ان یکون کاتباً بعد" اس پر آخری مہر ثبت کر دی[3]۔ ذاتی طور سے بچپن ہی سے مطالعہ اور مضمون نویسی میں منہمک رہتے تھے۔ اخبارات و جرائد سے "العروۃ الوثقیٰ" اور "الأستاذ" ان کے زیرِ مطالعہ رہتے تھے۔ بعد میں حالات نے مزید ان کا ساتھ دیا۔ وہ احمد لطفی السید

---

[1] عباس محمود العقاد، أنا ص ۶۶ - ۶۸۔

[2] ایضاً ص ۶۹۔ [3] ایضاً ص ۷۰

اور الوشادی جیسے مایہ ناز ادباء و مقالہ نگاروں کے اخبارات "الجریدۃ" اور "الظاہر" وغیرہ میں اپنے مقالات چھپواتے تھے۔ پھر اتفاق سے استاذ فریدی جیسے ایماندار، صادق اور مخلص آدمی کے ساتھ ان کے اخبار "الدستور" میں منظم صحافتی زندگی کے آغاز کا موقع ملا۔ وہ اخبار کے بند ہونے تک اسمیں کام کرتے رہے۔ استاذ فرید وجدی کی ایمانداری اور اصول پسندی سے وہ بہت متاثر ہیں[1]۔

پھر اس کے بعد وہ سرکاری نوکری سے اپنی علیحدگی کی تفصیل بیان کرتے ہیں۔ تقریباً ۱۹۰۷ء میں انہوں نے اخبار "الجریدہ" میں "الاستخدام رق القرن العشرین" کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا۔ اس میں انہوں نے ملازمت کے نقصانات اور منفی پہلوؤں کا نقشہ کھینچا ہے[2]۔ اس کے کچھ ہی دنوں بعد انہوں نے ملازمت چھوڑ کر صحافت اختیار کرلی۔ وہ اپنے اس اقدام پر بہت مسرور اور مطمئن تھے۔ اور اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ اس نے انہیں اس سے چھٹکارہ حاصل کرنے کی توفیق عنایت کی۔ اس کے بعد وہ ملازمت کے بارے میں لوگوں کے احساسات بیان کرتے ہیں کہ وہ اسے انتہائی مقدس چیز تصور کرتے ہیں۔ اور اس سے استفادہ خودکشی کے مانند ہے۔ عقاد کی اس سے نفرت کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ انسان اس میں محدود، مقید اور پابند ہو کر رہ جاتا ہے اس لئے وہ اسے غلامی اور اسیری کا ہم معنیٰ اور مترادف قرار دیتے ہیں۔ انہوں نے مختلف محکموں کے ڈائرکٹرس سکریٹریز اور انجار جنرل کے ساتھ اپنے تجربات بیان کرتے ہوئے ان کی بد اخلاقی ڈائرکٹر شپ اور جہالت کی روداد مرتب کی ہے[3]۔

---

[1] عباس محمود العقاد، أنا ص ۷۰ - ۷۲ [2] ایضاً ص ۷۲

[3] ایضاً ص ۷۶ - ۷۹

کتاب کی تیسری فصل میں انہوں نے چھ موضوعات پر الگ الگ مختصر حالات کی شکل میں گفتگو کی ہے۔ ان کے عناوین اسطرح ہیں۔ "میرا قلم"، "میں نے مطالعہ کیوں پسند کیا؟"، "میری پسندیدہ کتابیں"، "میری مقالہ نگاری کا طریقہ"، "کتابوں کی تصنیف و تالیف کا ڈھنگ"، "میں نے کیا لکھا اور کیا لکھنا چاہتا ہوں"۔

"میرا قلم" کے تحت انہوں نے اپنے قلم کی ظاہری شکل و صورت واضح کی ہے۔ اور یہ بتایا ہے کہ مختلف اوقات میں انہوں نے کس طرح کا قلم استعمال کیا ہے۔ اسکی روشنائی کیسی تھی؟ اپنے استعمال کردہ تین قلم خاص طور سے انہوں نے محفوظ رکھے تھے۔ لیکن بعد میں یہ سب ضائع ہو گئے[1]۔ "مطالعہ کا شوق کیوں؟" کے تحت سب سے پہلے اس خیال کی تردید کی ہے کہ مطالعہ کا مقصد لکھنے کا شوق نہیں ہونا چاہیئے۔ اور پھر اپنی مثال دی کہ انہوں نے بہت ساری کتابیں غیر متعلق موضوعات پر مطالعہ کر ڈالی تھیں[2]۔ وہ مطالعہ کے بعض پہلوؤں اور مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنے مقصد مطالعہ کی وضاحت اسطرح کرتے ہیں۔

> "مجھے مطالعہ سے دلچسپی لکھنے کیلئے نہیں اور نہ اسلئے کہ اس سے علم میں حسابی لحاظ سے اضافہ ہو بلکہ مطالعہ سے مجھے اسلئے محبت ہے کہ دنیا میں مجھے صرف ایک ہی زندگی ملی ہے جسمیں اپنے ضمیر کی تحریک کیلئے ناکافی سمجھتا ہوں۔ اور مطالعہ ہی ایک ایسی چیز ہے جس سے ایک ہی زندگی میں متعدد زندگیاں مل سکتی ہیں۔ کیونکہ اس سے انسان کی زندگی میں گہرائی پیدا ہوتی ہے"[3]۔

---

[1] عباس محمود العقاد، أنا ص ۸۰ – ۸۳ [2] ایضاً ص ۸۲ – ۸۵

[3] ایضاً ص ۸۵

میری پسندیدہ "کتابوں" کے تحت انہوں نے فلسفہ، مذاہب، تاریخ طبیعیات عظیم انسانوں کی سوانح حیات اور شاعری سے متعلق اپنی دلچسپی کا ذکر کیا ہے۔ پھر اسکی مصلحت واضح کی ہے۔ ان کی نظر میں کتابوں سے اسرار زندگی کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ فکر کو غذا حاصل ہوتی ہے۔ اور قوموں، عصور کے ہزارہا سالہ تجربات کا علم ہوتا ہے۔ یہ ایک موضوع پر کئی کئی کتابیں پڑھنے کے قابل ہیں۔ کیونکہ ہر مصنف کا انداز اور مواد مختلف ہوتا ہے۔ فلسفیانہ، علمی اور ادبی کتابوں کی افادیت بتاتے ہوئے انہوں نے پہلے ادبی پھر فلسفیانہ اور اس کے بعد علمی کتابوں سے اپنی دلچسپی اور پسندیدگی ظاہر کی ہے۔ ان کی نظر میں مفید کتاب وہ ہے جس سے علم میں اضافہ، ادراک و محل کی قوت اور زندگی سے لطف اندوز ہونے کا جذبہ پیدا ہو۔[1]

اپنے طرز مقالہ نویسی کے بارے میں سب سے پہلے انہوں نے یہ حقیقت واضح کی کہ ان کے اکثر مقالات اخبار و رسائل کے مدیروں کی تجویز پر لکھے گئے[2]۔ موضوعات کا تعین بھی ان کی طرف سے ہوتا ہے۔ اس سے انھیں آسانی بھی ہوتی ہے۔ ان کے لئے کسی موضوع پر لکھنا کوئی دشوار کام نہیں تھا۔ البتہ صحافتی زندگی کے ہنگاموں کی وجہ سے ان مقالات کی تقدیم و تاخیر میں بعض دشواریاں پیش آتی تھیں۔ ان کے مقالات کی نوعیت ادبی اور سیاسی دونوں تھیں۔ مختلف اخبارات میں وہ کتابوں اور قصیدہ پر تبصرہ اور کسی یورپی ادیب کا تعارف پیش کرتے تھے۔ ادیب کی مختلف اصناف سے متعلق اخبارات میں ان کیلئے مستقل کالمس مقالات سے ہٹ کر کے کتابوں کے موضوعات کے انتخاب کا ان کا طریقہ کچھ مختلف تھا۔ ان میں وہ بالعموم وہ موضوعات کو منتخب

---

[1] عباس محمود العقاد، أنا ص ۸۹ - ۹۰

[2] ایضاً ص ۹۱

کرتے تھے جن کے بارے میں ان کا خیال ہوتا تھا کہ ان کا حق ادا نہیں ہو رہا ہے اور کچھ حقائق سے نقاب نہیں اٹھائی جا رہی ہے۔ خاص طور سے سوانح کے بارے میں ان کا یہ طریقہ بالکل واضح تھا۔ انہوں نے مختلف شخصیتوں کی سیرت لکھنے کے اسباب پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اس کے بعد اپنی یہ عادت خاص طور سے واضح کی کہ وہ مناسب وقت کے لئے پسندیدہ موضوعات پر لکھنے کے کام کو مؤخر کرتے رہتے ہیں۔ تاکہ وہ موضوع کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لے لیں۔ اس کی وجہ سے حد سے زیادہ پسندیدگی اور خواہش کے باوجود یہ امام غزالی اور شیخ محمد عبدہ پر جو لکھنا چاہتے تھے نہیں لکھ سکے۔ وہ شیخ محمد عبدہ پر اپنی مختصر کتاب سے مطمئن نہیں ہیں[1]۔

"طرز تالیف" کے بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ سب سے پہلے وہ موضوع سے متعلق تمام تفصیلات اپنے ذہن میں منطقی ترتیب کے ساتھ یکجا کر لیتے ہیں۔ لکھنے کے لئے انہیں پرسکون مقام چاہیے[2]۔ ان کے زیادہ تر سیاسی مقالات بستر پر لیٹ کر لکھے گئے۔ البتہ اشعار وہ ٹہل کر کہا کرتے تھے۔ اپنے مقالات کتابوں کے طبع ہونے سے پہلے وہ اس پر ایک نظر ضرور ڈالتے تھے۔ دوران تحریر بھی کاٹ پیٹ اور قطع و برید کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ ان کے استدلال کا زیادہ تر انداز یہ ہوتا ہے کہ وہ مضبوط ترین دلائل سے کمزور دلائل کی طرف آتے ہیں۔ وہ کسی آدمی کی موجودگی میں بہت مشکل سے لکھ پاتے تھے۔ دوران تحریر چائے، سگریٹ یا دوسری نشاط انگیز چیزوں سے وہ احتراز کرتے تھے[3]۔

"تالیف کتابوں سے متعلق اپنے انداز" سے متعلق سب سے پہلی بات یہ بتائی کہ وہ تقسیم و تنظیم پر مبنی ہے۔ "تبویب و ترتیب" والے طرز سے انہیں تھوڑا اختلاف

---

[1] عباس محمود العقاد، انا ص ۹۱ - ۹۵ [2] ایضاً ص ۹۵۔

[3] ایضاً ص ۹۲۔

ہے۔ لکھنے کے سلسلہ میں سب سے پہلا کام ان کا یہ ہوتا ہے کہ وہ موضوع کے یہ اقسام و اجزاء کا ذہن اور حافظہ میں احاطہ کر لیتے ہیں۔ اس کے بعد ہر قسم اور جز کے لئے ایک متوسط سائز کا لفافہ بنا کر اس پر اس کا عنوان لکھ لیتے ہیں۔ پھر ہر قسم کے ماخذ و مواد کی تلاش پر غور و فکر کرتے ہیں۔ اور ذہن میں معاون کتب کا ایک نقشہ بنا لیتے ہیں[1]۔ اس کے بعد مطالعہ اور تصفیح کا کام شروع کرتے ہیں۔ جب کوئی مفید مطلب بات مل جاتی ہے تو اسے حوالوں کے ساتھ کاغذ کے ٹکڑوں پر نقل کر لیتے ہیں۔ اور اس پر مختصر اشارے میں اپنا موافق یا مخالف تبصرہ بھی نقل کر لیتے ہیں۔ پھر انہیں متعلقہ لفافوں میں رکھ لیتے ہیں۔ اور دوران تحریر ان سے استفادہ کرتے ہیں۔ اس سے بلاشبہ مراجعت میں آسانی ہوتی ہے۔ اس کے بعد "تصفیہ و تنظیم" کا مرحلہ آتا ہے۔ وہ ہر لفافہ کے اندر رکھے ٹکڑوں پر نظر ثانی کرتے ہیں۔ اور وہ اصلی مسائل کو باقی رکھ کر غیر ضروری مسائل کو خارج کر دیتے ہیں۔ آخری مرحلہ میں عنوانات وغیرہ میں بعض تبدیلیاں بھی کرنا پڑتی ہیں[2]۔ اس کے بعد وہ اپنے مذکورہ نہج کی وضاحت کیلئے اپنی بعض تصنیفات کا حوالہ دیتے ہیں۔ اور اس سلسلہ میں بعض ادیبوں کے اعتراضات نقل کر کے ان کا بھی جواب دیتے ہیں۔ کہ لوگ کوئی مخصوص اسلوب سامنے رکھ کر مجھ سے یہ توقع کرتے ہیں کہ میں بھی اسی اسلوب میں تحریر کروں گا۔ میرے لئے یہ ناممکن ہے[3]۔

"جو میں نے لکھا ---- اور جسے لکھنا چاہیئے" کے عناوین کے تحت انہوں نے یہ واضح کرنے کی کوشش کی کہ ان کی تصنیفات مختلف مسائل کے تحت تحریر کی گئی ہیں۔ اگر کوئی ان پر ایک نظر ڈالے تو اس کا اندازہ بخوبی کر سکتا ہے

[1] عباس محمود العقاد، انا ص ۶۷ [2] ایضاً ص ۹۹ — ۱۰۰

[3] ایضاً ص ۱۰۰ — ۱۰۱

کہ انھیں ابھی کیا کیا لکھنا ہے؟[1] وجود اور عقیدے سے متعلق مسائل میں سے وہ ایک کتاب کائنات کے بارے میں اور ایک کتاب انسانوں کے بارے میں تصنیف کرنا چاہتے ہیں۔ سلسلۂ عبقریات میں وہ "عبقریۃ جمال الدین افغانی و محمد عبدہ" کے نام سے ایک مستقل کتاب لکھنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ انبیاء سے متعلق وہ "عبقریۃ موسیٰ"، "عبقریۃ بوذا" اور "عبقریۃ کنفوشیوس" پر لکھنا چاہتے ہیں۔ اسی طرح فلاسفہ میں سے امام غزالی پر، شعراء میں سے متنبی، ابو العلاء اور ابو تمام پر اور معاصرین میں سے سعد زغلول پر وہ مزید کام کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ ان میں سے بعض پر انہوں نے کام کیا تھا۔ لیکن وہ اس سے مطمئن نہیں ہیں۔[2]

کتاب کی چوتھی فصل میں انہوں نے "خود آگہی"، "کامیابی کے لئے اپنے راستہ کا تعین"، "فرصت کے اوقات سے میں نے کیا سیکھا"، "میری زندگی کی سب سے کٹھن گھڑی"، "اور میں نوجوانی میں بزرگ تھا" کے عناوین سے پانچ مقالات تحریر کئے ہیں۔ "خود آگہی" کے عنوان کے تحت سب سے پہلے وہ یہ بتاتے ہیں کہ انسان کے لئے اپنے نفس کی مکمل معرفت ممکن نہیں ہے۔ البتہ وہ اس کے حدود اور جوانب کی معرفت حاصل کر سکتا ہے۔ پھر وہ نفس کی معرفت اور نفس کے حدود کی معرفت کے درمیان فرق واضح کرتے ہیں۔[3] اس کے بعد وہ اپنی بعض صفات مثلاً خود اعتمادی، غور و فکر، گوشہ نشینی، سنجیدگی اور کتب بینی وغیرہ کا ذکر کرتے ہیں۔ اسی طرح ظلم، شکست و ہزیمت اور مصیبت و تکلیف سے اپنے تنفر کا اظہار کرتے ہیں۔ اس کے بعد وہ بعض دوسری باتوں کا تذکرہ کرنے کے بعد آخیر میں لکھتے ہیں۔

---

[1] عباس محمود العقاد: أنا ص ۱۰۳۔ [2] ایضاً ص ۱۰۲ - ۱۰۶۔

[3] ایضاً ص ۱۰۷

"اس طرح نفس کے حدود کا تو مجھے اچھی طرح علم ہے۔ لیکن ان کے متعلقات کو میں بالکل نہیں جانتا۔ مجھے یقین ہے کہ سقراط نے جب یہ کہا تھا کہ "خود کو پہچانو" تو وہ کاہنوں کی زبان استعمال کرتا تھا۔ کیونکہ یہ مطالعہ غیب کی معرفت کا تھا۔"[1]

"راہِ کامیابی کا علم" کے عنوان سے تحریر کردہ مقالہ میں وہ یہ بتاتے ہیں کہ انہوں نے زندگی میں بہت خواہشوں کو منتخب کرنا چاہا لیکن پھر اسے چھوڑ دیا۔ شروع میں انھیں فوج میں ملازمت کرنے کا خیال ہوا۔ اس کے بعد زراعت اور حیوانات کی تعلیم حاصل کرنے کی طرف ان کا ذہن گیا۔ لیکن معمولی تجربہ کے بعد ان پر یہ واضح ہو گیا کہ وہ صرف ادب کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔[2] ادب کے میدان ہی میں انھیں کامیابی ملی۔ اس کامیابی کا مطلب ان کے یہاں اس مقام تک رسائی ہے۔ جسے عرب ادباء اور قارئین دونوں پسند کرتے ہیں۔ اس حقیقت پر انھیں مسرت ہے کہ اس کامیابی کے تمام اسباب ان کے لئے فراہم ہو گئے تھے۔ ان کے دل میں اس کی سچی خواہش اور طلب تھی۔ کام کرنے کا بے پناہ جذبہ تھا۔ اور سب سے بڑی بات تو یہ کہ انہیں اپنے اوپر اعتماد اور مشکلات و مصائب، صبر و استقامت کا ملکہ حاصل تھا۔ پھر دوسرے معاون اور بھی مثلاً تعلیم، ماحول اور تہذیب وغیرہ بھی فراہم ہوتے گئے اس طرح ان کی کامیابی کی راہ ہموار ہوتی گئی۔[3]

"فرصت کے اوقات میں میں نے کیا سیکھا" کے تحت وہ سب سے پہلے وقت کی قدر و قیمت واضح کرتے ہیں۔ اور پھر مشرقی لوگوں کے لہو و لعب اور

---

[1] عباس محمود العقاد، أنا ص ۱۱۱

[2] ایضاً ۱۱۲ [3] ایضاً ص ۱۱۳

کھیل کود وغیرہ کا ذکر کر کے انہیں اسکی ذلت اور پستی کا بنیادی سبب قرار دیتے ہیں۔ وہ چھٹی کے اوقات کو یونہی ضائع کرنے کے بجائے ان کے بارے میں یہ مشورہ دیتے ہیں کہ ہمیں ان کو اپنی منشا کے مطابق حسب خواہش استعمال کرنا چاہیے[1]۔ اس کے بعد وہ بعض یورپی قوموں کا ذکر کر کے یہ ثابت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرصت کے اوقات کو استعمال کر کے بڑی عظیم کامیابیاں حاصل کیں[2]۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ اگر کسی شخص کو اس کے بیکاری کے اوقات میں کسی کمرہ میں بند کر کے چھوڑ دیا جائے اور وہ اس پر صبر کرے وہ شخص یقیناً قوی الفکر، قوی الاخلاق اور قوی برداشت کرنے والا ہوگا۔ بصورت دیگر اسے بیکار اور بے مصرف آدمی سمجھا جائے گا۔ اس کے بعد وہ خالی اوقات کو استعمال کرنے کی مختلف شکلیں بتاتے ہیں۔ ان کی نظر میں ان کا سب سے بہترین مصرف یہ ہے کہ آدمی اپنے تجربات اور کتابوں سے جمع کردہ معلومات کی چھان پھٹک کرے۔ اور عقل و ضمیر میں ان کو مناسب مقام پر رکھے۔ یہ کام خالی اوقات کے علاوہ کسی اور وقت میں انجام نہیں پا سکتا۔ اسطرح ان خالی اوقات اور ان میں انجام پانے والے کام کی بیحد اہمیت ہے[3]۔

"میں نوجوانی میں بزرگ تھا" کے موضوع پر اپنے مقالہ میں انہوں نے اپنے بچپن اور جوانی کے بعض ایسے واقعات بیان کئے ہیں جن سے اس عمر میں ان کی غیر معمولی سنجیدگی کا اندازہ ہوتا ہے۔ مثلاً انہوں نے کبھی پاف پینٹ نہیں پہنا۔ کھیل کود اور ہنسی مذاق میں کبھی حد سے آگے نہیں بڑھے وغیرہ[4]۔ چنانچہ وہ یہ کہتے ہیں کہ اس تحفظ اور احتیاط کی وجہ سے ان کی جوانی کا سرمایہ محفوظ رہ

---

[1] عباس محمود العقاد، انا ص ۱۱۶ - ۱۱۷ [2] ایضاً ص ۱۱۷

[3] ایضاً ص ۱۱۹ - ۱۲۰ [4] ایضاً ص ۱۲۲ - ۱۲۳ .

گیا - اور وہ ساٹھ سال کی عمر تک پہنچنے کے باوجود جوانوں کی طرح بلکہ ان سے زیادہ قوتِ عمل محسوس کرتے ہیں - ان کے نزدیک جوانی کی بقا اور وجود کا صحیح پیمانہ عمل ہے - پھر وہ اپنا پسندیدہ عمل حصولِ علم قرار دیتے ہیں - اور یہ بتاتے ہیں کہ علم کی خواہش زندگی کے کسی مرحلہ میں ان سے جدا نہیں ہوئی[1] - حتیٰ کہ وہ اپنے دوست توفیق الحکیم کے ایک قول کو نقل کر کے اس کی تصدیق کرتے ہیں کہ "اگر جنت میں انہیں اپنی معلومات میں اضافہ کرنے کا موقع نہ ملا تو وہاں ان کے لئے قیام کرنا مشکل ہو جائے گا"[2] پھر وہ قرأت اور اطلاع و معرفت کے درمیان فرق واضح کرتے ہوئے موخر الذکر کے لئے مطالعۂ کتب کے علاوہ دوسرے ذرائع کی نشاندہی کرتے ہیں - اور جنت کو اس کے لئے ایک بہترین جگہ قرار دیتے ہیں - اس کے بعد وہ اپنی طلب معرفت اور اس سے متعلق بعض غلط فہمیوں کا ازالہ کرتے ہوئے آخر میں یہ بتاتے ہیں کہ ساٹھ سال کی عمر میں گرچہ مطالعہ کے اوقات میں گھٹنے کے اعتبار سے کمی آگئی ہے - لیکن اسکی بہترین تلافی اس طرح سے ہو جاتی ہے کہ اس عمر میں اخذ و استفادہ کے لحاظ سے برکت بہت زیادہ ہونے لگی ہے - اس طرح وہ یہ بات ثابت کرتے ہیں کہ "چونکہ ایام جوانی ہی میں بوڑھے ہو گئے تھے - اسلئے بڑھاپے میں جوانی کا وجود قرین قیاس ہے"[3]

اس خود نوشت سوانح حیات کی پانچویں فصل میں مصنف نے "میرے دوست اور دشمن"، "بچے میرے دوست"، "میں قید خانہ میں" اور "صحت و بیماری کے بارے میں کچھ تاثرات" کے موضوع پر گفتگو کی ہے - اپنے دوستوں اور

---

[1] عباس محمود العقاد، أنا ص ۱۲۳ - ۱۳۴ [2] ایضاً ص ۱۲۵

[3] ایضاً ص ۱۲۶

دشمنوں کے بارے میں ان کا خیال یہ ہے کہ دونوں کی موجودگی ضروری ہے - اور یہ ان کے وجود پر اللہ کے شکر گزار ہیں - ان کی نظر میں دشمنوں کی مخالفت سے آدمی کو زینت ملتی ہے - اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس آدمی کے اندر حسد، مخالفت اور رشک کیلئے کچھ بھی موجود ہیں[1]۔ پھر وہ وضاحت کرتے ہیں کہ لوگوں سے ان کی دوستی یا دشمنی کی بنیاد کوئی ذاتی ضرورت یا انسانی طبیعت کی کمزوری نہیں ہوتی - بلکہ کسی نظریہ، ادبی مقاصد منزل یا ذہنی دلچسپیوں میں اشتراک وعدم اشتراک اور موافقت وعدم موافقت ہوتی ہے - پھر وہ اپنے نظریات اور افکار کی وضاحت کرتے ہوئے یہ ثابت کرتے ہیں کہ ان کی مخالفت میں سماج کے ہر طبقہ کے لوگ شامل ہیں - لیکن وہ ان سب کے مقابلہ میں برابر ثابت قدم رہے ہیں - اور دشمنوں کی تلواریں ان کی زرہوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گئیں[2]۔ وہ اس مسئلہ کی مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ چونکہ ان کے پاس کوئی مضبوط خاندانی پس منظر نہیں ہے اور نہ ہی کوئی بڑی علمی ڈگری اور مظاہر و القاب ہیں - ان سب کے باوجود وہ ترقی کی راہ پر گامزن ہیں - اس لئے لوگ ان سے ناراض ہیں - وہ خود بھی صرف ان نفوس صلاحیتوں کے مالک اہل علم کی قدر کرتے ہیں - اور ان ہی سے دوستی کرتے ہیں جو ہر طرح کی ظاہری تشہیر سے بیزار ہوں[3]۔

"بچے میرے دوست" کے عنوان سے انہوں نے جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ بچے انسانیت کی کلی اور اس کے بہار کے ترجمان ہیں - وہ شباب اور زندگی کی بشارت دیتے ہیں - ان سے انسان بہت کچھ سیکھتا ہے - ان کی حیثیت صحیح معنوں میں معلم کی ہے - ان کی مصاحبت ایک خوبصورت قسم کی ریاضت ہے - ان سے ملکر ایک نئی زندگی

---

[1] عباس محمود العقاد، أنا ص ۱۲۷ - ۱۲۸ [2] ایضاً ص ۱۲۸ - ۱۳۰

[3] ایضاً ص ۱۳۱ - ۱۳۲ .

حاصل ہو جاتی ہے۔ اور طبیعت پہلے سے زیادہ اچھی ہو جاتی ہے۔ اپنے ان خیالات کو وہ بہت سی مثالوں سے واضح کرتے ہیں۔[۱]

اس کے بعد وہ "میں قید خانہ میں" کے عنوان پر ایک مقالہ تحریر کرتے ہیں۔ اس میں انہوں نے بتایا ہے کہ ان کا جیل جانا اچانک نہیں ہوا تھا۔ قصر شاہی اور وزارت پر اپنے تنقیدی خیالات کی وجہ سے انہیں پہلے سے اس کا یقین تھا۔ اور اس کے لئے ضروری تیاریاں بھی کر لی تھیں۔[۲] انہیں ۱۲ اکتوبر ۱۹۳۰ء کو گرفتار کیا گیا اور جولائی ۱۹۳۱ء میں رہا کیا گیا۔ اس کے بعد انہوں نے جیل کے احوال تفصیل سے بیان کئے ہیں۔ اس سے جیل کی کوٹھری، قیدیوں کا شور و غوغا، جیل کے ملازمین، فوجی افسر، جیلر، جیل کا کھانا، بستر اور یہاں کے بعض رفقاء کا تعارف ہمارے سامنے آ جاتا ہے۔[۳]

اس فصل کے آخیر میں وہ صحت و بیماری کے تعلق سے اپنے بعض تاثرات کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ زیادہ تر کمزوری نظر اور ضعیف البصری سے متعلق ہیں۔ اس میں کوئی خاص اور قابل ذکر بات نہیں ہے۔

کتاب کی چھٹی فصل میں وہ "میرے ایمان"، "اگر میں پھر طالب علم بن جاؤں"، "میرا فلسفۂ زندگی" اور "کیا یہ زندگی جینے کے لائق ہے؟" کے عناوین کے تحت اظہار خیال کرتے ہیں۔ اپنے ایمان کے بارے میں سب سے پہلی بات انہوں نے یہ بتائی ہے کہ یہ وراثت کے ساتھ ساتھ طویل فکر و جستجو اور گہرے احساس و شعور کا نتیجہ ہے۔ وراثت کے ضمن میں انہوں نے اپنے والدین کے تقویٰ اور پابندیٔ صوم و صلوٰۃ کا خاص طور سے ذکر کیا ہے۔[۴] پھر اپنے فکری نتائج

۱۔ عباس محمود العقاد، أنا ص ۱۳۳ - ۱۳۶۔ ۲۔ ایضاً ص ۱۳۷ - ۱۳۹۔

۳۔ ایضاً ص ۱۲۶ - ۱۵۱ ۴۔ ایضاً ص ۱۵۲ - ۱۵۳۔

کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ باری تعالیٰ نے کائنات کی جو توجیہ وتفسیر کی ہے وہ جدید مادہ پرستوں کی توجیہات سے بہت زیادہ واضح ہے۔ ان توجیہات سے عقل ناقابل حل تناقض کا شکار ہو جاتی ہے۔ ان کے بجائے خرافات اور اساطیر کی تصدیق آسان معلوم ہوتی ہے۔ اپنے اس خیال کو انہوں نے مثالوں سے واضح کیا ہے[1]۔

انہوں نے عقیدہ کے علاوہ اخلاق، معاملات اور ادب کے بارے میں اپنے ایمان اور یقین کا معیار اور میزان واضح کیا ہے۔ عالم اخلاق میں خیر کا سب سے بڑا محرک انسان کا اس کے کمال کی طلب اور اس کا فہم ہے۔ اور شر سے روکنے کا سب سے بڑا داعیہ اس کے نفس کا علم ہے۔ معاملات کے بارے میں ان کا ایمان یہ ہے کہ بھلائی انسانی طبیعت میں موجود ہے۔ لیکن اس کا سراغ ہر انسان میں ہر وقت نہیں لگ سکتا۔ اسلئے لوگوں کے اندر بھلائی کا جو عنصر موجود ہے۔ اس سے پوری طرح مایوس نہ ہونا چاہیئے اور نہ اس پر مکمل بھروسہ کر لینا چاہیئے۔ ادب کے بارے میں ان کا یقین اور تصور یہ ہے کہ یہ عقل کا ایک پیغام ہے۔ جسے دوسروں کی عقول تک پہنچایا جاتا ہے۔ ..... ادب دراصل ایک انسانی جوہر ہے لفاظی نہیں۔ جب ادب کو پڑھ کر قاری کوئی نہیں چیز محسوس نہ کرے اسکی خاموشی بہتر ہے۔ اور جو ادیب اپنی کوششوں کو تفریح اور لہو ولعب تک محدود رکھے وہ جسم کا خادم ہے اور عالم عقل و روح میں اس کا کوئی پیغام نہیں[2]۔

"اگر میں طالب علم بن جاؤں" کے عنوان کے تحت سب سے پہلے انہوں نے طالب علموں کی ایام جوانی کے اس جذبہ کی تفصیل بیان کی ہے جس کی بنیاد پر نظام تعلیم کی مخالفت اور اس سے راہ فرار اختیار کرتے ہیں[3]۔ پھر انہوں نے یہ بتایا کہ وہ ہمیشہ نظام کے

---

[1] عباس محمود العقاد، أنا ص ۱۵۳ - ۱۵۶۔ [2] ایضاً ص ۱۵۵ - ۱۵۶۔

[3] ایضاً ص ۱۵۷۔

پابند طالب علم رہے اور اپنے فرائض کی ادائیگی سے کبھی غفلت نہیں برتی" اس لئے اگر مجھے دوبارہ طالب علم بننے کا موقع ملا تو اپنی اس عادت اور خصلت پر قائم رہوں گا۔ اسی طرح غیر درسی کتب اور سیاسی و ادبی مطالعہ کا سلسلہ بھی جاری رکھوں گا۔ زمانۂ طالب علمی میں اسکی بنیاد پر میں درسی کتابوں میں پیچھے رہ جاتا تھا۔ لیکن مجھے اسپر کوئی افسوس نہیں"[1]

ہاں البتہ وہ ظاہر کرتے ہیں کہ اگر انہیں دوبارہ موقع ملا تو وہ ورزش اور کھیل سے تمرد اور اور فرار کی روش چھوڑ دیں گے۔ کیونکہ اس کے نقصانات ان پر واضح ہو گئے ہیں۔ لیکن آخر میں وہ زور دیکر کہتے ہیں کہ وہ ماضی کی طرف لوٹنا پسند نہیں کرتے کیونکہ ان کی نظر میں "حال" بہرحال "ماضی" سے بہتر ہے[2]۔

"میرا فلسفۂ محبت" کے موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے سب سے پہلے انہوں نے محبت کی متعین تعریف کی پیچیدگی اور مشکل واضح کی ہے۔ اور پھر اسکی منفی اور مثبت طور سے کئی تعریفیں بیان کی ہیں۔ یہ فی الواقع محبت کے بارے میں کچھ خیالات ہیں[3]۔ جو مختلف انسانی تجربات پر مشتمل ہیں۔ آخیر میں وہ اس کا خلاصہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

"محبت بہت سے جذبات کا نام ہے کسی ایک کا نہیں۔ اور اس وجہ سے اسمیں دوسرے جذبات کے مقابلہ میں قوت و شدت ہوتی ہے۔ اسمیں باپ کی شفقت، دوست کی محبت، شب زندہ دار کی بیداری، خواب دیکھنے والے کی حیرانی، صدق و وہم، ایثار و خود غرضی، مشیت و مجبوری، غرور و ذلت، بیم و رجا، لذت و عذاب، گناہ و برأت، انفرادیت و ثنویت و جمعیت اور

---

[1] عباس محمود العقاد، انا، ص ۱۵۹ [2] ایضاً ص ۱۶۱

[3] ایضاً ص ۱۶۲ - ۱۶۴

دوام بنی نوع انسان سب چیزیں شامل ہوتی ہیں ---- محبت
جسم کا جسم کی طرف اور روح کا روح کی طرف کھینچنے کا نام ہے۔[1]

"میرا فلسفۂ زندگی" کے عنوان پر انہوں نے جو کچھ تحریر کیا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ مادی چیزوں سے حد سے زیادہ بیزار اور بے پرواہ ہیں۔ انہیں مال و دولت اور جائداد و محلات میں غیر معمولی دلچسپی لینے والوں پر سخت حیرت اور تعجب ہے۔ اس کا ماخذ وہ اپنے موروثی مزاج، لوگوں کے تجربات و واقعات اور درس و مطالعہ کو قرار دیتے ہیں۔[2] اپنے اس فلسفہ کی وجہ سے وہ ان تاریخی شخصیات اور فاتحین کو پسند نہیں کرتے جو توسیع پسندی سے کام لیتے ہیں۔ انہوں نے بھی مال و دولت اور جاہ و حشمت کی وجہ سے کسی کی تعریف نہیں کی۔[3] اس موضوع پر اپنی بحث کو سمیٹتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:-

"تمہاری مالداری و بے نیازی خود تمہاری ذات کے اندر ہے۔ اور تمہاری قیمت تمہارے عمل میں ہے۔ اور تمہارے محرکات تمہارے مقاصد سے زیادہ توجہ کے مستحق ہیں۔ لوگوں سے بہت زیادہ توقع قائم نہ رکھو۔[4]

"کیا یہ زندگی جینے کے لائق ہے؟" کے عنوان سے اپنے مقالہ میں وہ لکھتے ہیں کہ فی الواقع زندگی کی حرص اور تمنا کوئی معیوب چیز نہیں ہے۔ لیکن اگر آدمی ہر طرح کی زندگی پر قانع ہو جائے تو یہ معیوب بات ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ زندگی کی حفاظت اس وقت کرنی چاہیے جب وہ ہماری شرائط قبول کرے۔ بصورت دیگر زندگی کی حفاظت ہمارا فرض نہیں۔[5]

---

[1] عباس محمود العقاد، أنا، ص ۱۶۴ - ۱۶۵ . [2] ایضاً ص ۱۶۸

[3] ایضاً ص ۱۶۹ - ۱۷۱ [4] ایضاً ص ۱۷۱ [5] ایضاً ۱۷۲ - ۱۷۵ .

اس خود نوشت سوانح عمری کی ساتویں فصل میں تین چھوٹے چھوٹے مقالات ہیں۔ جن کے عناوین علی الترتیب "میں نے اپنی جگہ سے پوری دنیا کی سیاحت کرلی"، "میرے سب سے بہترین دن" اور "گرمی ناپسند ہے" ہیں۔ پہلے مقالہ میں انہوں نے سیاحت، اس کے فوائد اور اقسام پر روشنی ڈالی ہے۔ پھر یہ بتایا ہے کہ انہوں نے بغیر سفر کے بہت سی سیاحتیں کرلیں کیوں کہ انہوں نے اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے وہ چیزیں دیکھ لی ہیں جنہیں سفر کرنے والے سیاح دیکھتے ہیں[1]۔ بقیہ جہاں تک سفر سے تھکنے کا معاملہ ہے تو وہ کہتے ہیں کہ "مطالعہ کے شوق اور عزلت پسندی کی وجہ سے اگر ورزش کا عادی نہ ہوتا تو شاید ہفتوں گھر سے نہ نکلتا"[2]۔ اس کے بعد انہوں نے جدید ذرائع ابلاغ پر روشنی ڈالی ہے۔ جن کی وجہ سے دور کی چیزیں بآسانی معلوم ہوجاتی ہیں[3]۔

"میرا سب سے بہتر دن" کے عنوان کے تحت انہوں نے سب سے پہلے جمال کے معنیٰ اور مفہوم پر ایک فلسفیانہ بحث کی ہے۔ اور پھر خوبصورت دن کے بہت سے تصورات اور امکانات واضح کئے ہیں۔ اسکے بعد انکی نظر میں خوبصورت دن کون کون سے آسکتے ہیں؟ ان پر روشنی ڈالی ہے۔ ان میں سے دو دن بطور مثال درج ذیل ہیں۔

"خوبصورت دن وہ ہے جسمیں ہم اپنی دنیا کے مالک ہوں اور دنیا ہماری مالک نہ ہو۔ اسمیں ہم اپنی لذت و شہوت پر قابو رکھیں اور اسکے ہاتھوں مجبور و بے بس نہ بنیں"[4]۔

"زندگی کا سب سے خوبصورت دن وہ ہے جسمیں تمہیں اپنے نفس پر غلبہ کے

---

[1] عباس محمود العقاد، أنا ص ۱۷۶ - ۱۷۷ [2] ایضاً ص ۱۷۸

[3] ایضاً ص ۱۷۸ - ۱۷۹.

بعد یہ احساس ہو کہ تم ایسی ثروت کے مالک بن گئے ہو جس کے سامنے
مال، لذت اور تعریف کی کوئی قیمت نہیں۔"[1]

"گرمی مجھے ناپسند ہے" کے عنوان سے تحریر کردہ مقالہ میں انہوں نے پہلے بطور تمہید یہ حقیقت واضح کی ہے کہ انسان اگر کسی موسم سے اکتاہٹ محسوس کرتا ہے یا کسی دوسرے موسم کی آمد کا مشتاق ہوتا ہے تو وہ قابلِ ملامت نہیں ہے اور نہ ہی ناشکرا ہے اس کے بعد تفصیل سے گرمی میں اپنی طبعی پیچیدگیوں اور نفسیاتی عوارض پر روشنی ڈالی ہے۔[2]

اس خود نوشت کی آٹھویں فصل میں "چالیس کے بعد"، "پچاس کے اشارے" "ساٹھ کے اشارے"، "ستر کے اشارے" اور "میرے اعتراضات" کے عناوین سے پانچ مقالات شامل ہیں۔ ان مقالات میں مصنف نے اپنی نفسیاتی اور فکری حالت پر روشنی ڈالی ہے۔ جوانی ادھیڑ پن اور بڑھاپے نیز بیس، چالیس، پچاس، ساٹھ اور ستر کی عمر کے مابین اپنے ذاتی تجربات کا تذکرہ کیا ہے۔ پہلا مقالہ مجلہ "الہلال" کی جون ۱۹۳۳ء کی اشاعت میں شائع ہوا۔ اسمیں انہوں نے ایک خاص بات یہ لکھی ہے کہ عام نوجوانوں کے علی الرغم وہ اپنی جوانی میں خیالات کے بالمقابل واقعات کی طرف زیادہ مائل تھے۔ وہ اسوقت "فکرِ واقعی" پر زیادہ یقین رکھتے تھے اسکے علاوہ انہوں نے اپنی زندگی کی بعض تبدیلیوں کی طرف بھی نشاندہی کی ہے۔[1] "وحی الحنین" کے عنوان سے تحریر کردہ مقالہ میں انہوں نے اپنی اور اپنے ہم جنسوں کی زندگی کا تذکرہ کیا ہے۔ اور ان نفسیاتی حالات کا جائزہ لیا ہے جو اس عمر کے لوگوں پر طاری ہوتے ہیں۔ اسیطرح زندگی کے بارے میں ان نقطہائے نظر کا ذکر کیا ہے۔ جو بیس، تیس اور چالیس سال والوں کے نظریہ مختلف ہوتے ہیں۔ وہ اس عمر کو بے نیازی کی عمر بتاتے ہیں، محتاجی کی نہیں۔ اس عمر کی بعض اور

---

[1] عباس محمود العقاد، أنا ص ۱۸۷ - ۱۹۳.

خصوصیات پر بھی انہوں نے نظر ڈالی ہے[1]۔ "وحی الستین" کے عنوان سے مقالے کے تحت انہوں نے عمر کے تیزی سے گذر جانے اور اس کا احساس نہ ہونے پر روشنی ڈالی ہے۔ اور یہ وضاحت کی ہے کہ اس عمر میں گرچہ لکھنے پڑھنے کی قوت میں کمی واقع ہوئی ہے لیکن اس کمی کی تلافی تحریر کی مشق و ممارست اور تجربات کی کثرت سے بآسانی ہو جاتی ہے۔ اس عمر میں اپنے اختیارات کردہ نظریات کے بارے میں ان کا جوش و خروش بڑھ گیا اور معیار جمال بھی اونچا ہو گیا ہے[2]۔ "وحی السبعین" کے تحت انہوں نے جوانی اور بڑھاپے کے درمیان پانے والے فرق اور اختلافات کو واضح کیا ہے۔ اور یہ لکھا ہے کہ جوانی کی خرابیوں کے باوجود اسکی ہمیشہ تمنا کی جاتی ہے۔ پھر انہوں نے ستر سال کے بعد اپنی قلبی کیفیات بتاتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ اب انہیں زندگی کی تمنا نہیں رہ گئی ہے۔ بلکہ ستر کی عمر میں تو تمنا کا لفظ ہی بڑا اور بے معنی محسوس ہوتا ہے۔ اسکے بعد ستر اور اس سے پہلے مختلف مراحل عمر کے درمیان اپنی خواہشات اور تمنیات میں واقع تغیرات کو واضح کیا ہے۔ اور اس ضمن میں بہت سی مثالیں دی ہیں[3]۔ اس فصل کا آخری مقالہ "میرے اعترافات" کے عنوان سے ہے۔ اسمیں سب سے پہلے "اعتراف" کی تاریخ، اس کا مفہوم اور اسکی غرض و غایت پر روشنی ڈالی ہے۔ پھر اس تصور کی تردید کی ہے کہ اعتراف صرف گناہوں، خطاؤں اور مخفی جرائم کا ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں وہ صرف اتنی وضاحت ضروری سمجھتے ہیں کہ ان کے اندر جو کمیاں اور کوتاہیاں ہیں اور بالعموم دوسرے انسانوں میں بھی پائی جاتی ہیں۔ لیکن انکی خوبیوں اور اوصاف میں انکی برابری اور ہمسری کا کوئی شخص دعویٰ نہیں کر سکتا۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے اوصاف مثلاً عزلت پسندی، عزم ارادہ، نفس پر مکمل کنٹرول، سامان عیش و عشرت سے بے رغبتی وغیرہ کا

---

[1] عباس محمود العقاد، أنا ص ص ۱۹۲ - ۱۹۸ [2] ایضاً ص ۱۹۷ - ۲۰۳

[3] ایضاً ص ۲۰۴ - ۲۰۸

تذکرہ کیا ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ اس میں کمزوریوں کا تذکرہ بہت ہی مختصر اور سرسری انداز میں کیا گیا ہے۔[1]

کتاب کی نویں فصل میں "میری لائبریری"، "اپنی کتابوں کے درمیان" اور "اپنے گھر میں" کے عناوین سے تین مقالات شامل ہیں۔ ان تینوں مقالات میں انہوں نے اپنے ایک دوست کو مخاطب کر کے اس کے اور اپنے خیالات جمع کئے ہیں۔ عنوان سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ان میں اپنی "اپنی لائبریری" کتابوں اور گھر کا نقشہ اور تفصیلات پیش کی ہونگی۔ لیکن فی الواقع اس میں اس طرح کی کوئی بات نہیں ہے۔ بلکہ ان میں ان کے ذہن میں یا ان کے ساتھی کے ذہن میں ابھرنے والے بعض سوالات اور اشکالات پر بحث کی گئی ہے۔ مثلاً لائبریری کے ضمن میں "روشنی، مادہ روح، شاعری، افسانہ نویسی اور ناول نگاری وغیرہ پر مفید گفتگو ہے۔[2] یہی حال اس کے بعد کے دونوں مقالات کا ہے۔[3] یہ مقالات ان کی فکر کے مختلف گوشے نمایاں کرتے ہیں۔ خاص بات یہ ہے کہ ان میں کتاب کے دوسرے مقالات کے بالمقابل فنی عناصر مثلاً تصویر، تخیل، حوار وغیرہ کثیر تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ ساتھ ہی ان میں مصنف کی فکری، ادبی اور روحانی زندگی کی ایک سچی تصویر پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

کتاب پر ایک تجزیاتی نظر

عقاد کی اس خود نوشت سوانح عمری کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اس کتاب میں ان کی ذاتی زندگی کے بعض پہلو ابھر کر سامنے آگئے ہیں۔

---

[1] عباس محمود العقاد، أنا ص ۲۰۹ - ۲۱۳ [2] ایضاً ص ۲۱۴ - ۲۳۴

[3] ایضاً ص ۲۳۵ - ۲۷۳.

اس میں ان کی خصوصیتیں، خانگی و فکری تربیت، آمال و مقاصد، ماحول اور اساتذہ وغیرہ سے متعلق مفید معلومات یکجا ہو گئی ہیں۔ اور اس ایمان و عقیدہ اور اصول و ضوابط کا تذکرہ بھی ہو گیا ہے۔ جس کا ان کی طبیعت اور مزاج پر اثر مرتب ہو گیا تھا۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مصنف نے اسمیں اپنا جائزہ ایک انسان کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ اور یہ انسان وہ ہے جسے عقاد خود جانتا ہے۔ وہ انسان نہیں جسے لوگ جانتے ہیں یا جسے اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا[1]۔ کیونکہ عقاد نے اپنا جو تعارف پیش کیا ہے۔ وہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ جو بیشتر لوگوں کو معلوم ہے۔ ایک انسان کے علاوہ عقاد کی زندگی کے اور بھی بہت سے پہلو ہیں جن کے بارے میں ایک قاری فطری طور سے واقف ہونے کی خواہش رکھتا ہے۔ مثلاً عقاد بحیثیت انشاء پرداز، شاعر، سیاست داں، صحافی، فنکار، مؤرخ، سیرت نگار اور فلسفی وغیرہ۔ لیکن یہ ان تمام گوشوں پر روشنی ڈالنے سے قاصر ہے[2]۔ صحیح بات یہ ہے کہ عقاد معلومات اور تخلیق کے سمندر اور صلاحیت و استعداد کے باب میں منفرد شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی ہمہ جہت اور ہمہ گیر شخصیت کسی ایک کتاب میں احاطہ کرنا بیحد مشکل کام تھا۔

عقاد کی یہ خود نوشت سوانح اکثر مفکرین، ادباء اور علماء سماجیات کی سوانح سے مختلف ہے۔ ان میں سے بعض علماء، ادباء اور سیاسی لوگوں نے اپنی سوانح تاریخی انداز میں لکھی ہے۔ بعض نے ڈائری اور یادداشت کا انداز اختیار کیا ہے۔ اور بعض لوگوں نے اپنی زندگی کی تصویر اعترافات کے انداز میں پیش کی۔ اور زندگی کے صرف انتہائی اہم واقعات کا تذکرہ کیا لیکن اپنے بارے میں عقاد کی تحریر سوانح

---

[1] عباس محمود العقاد، أنا ص ۲۰-۲۱ [2] ایضاً ص ۸۔

نگاری کے باب میں ایک نئے رنگ و آہنگ کی حامل ہے۔ اسمیں صرف شخصیت یا گزرے ہوئے حوادث کا بیان نہیں ہے بلکہ یہ ایک جستجو پسند عالم اور باکمال فنکار کی تحریر ہے۔ جسے علمی، فکری اور فنی مسائل میں غور و فکر کی عادت ہے۔ اور جس کی جولانگاہ فلسفہ علم النفس، ادب، تربیت اور عمرانیات کے مسائل رہے ہیں۔ جسے زندگی کا تجربہ شیریں سے واسطہ رہا ہے۔ اور اس سے اس کو عالم کا تجربہ، مفکر کی عبرت اندوزی اور فلسفہ کی حکمت حاصل ہوئی۔ انہوں نے اپنے بارے میں لکھتے ہوئے مختلف قسم کے علوم اور گوناگوں فکری مسائل کو ہاتھ لگایا ہے۔ ہر واقعہ یا امر پر علمی انداز میں تبصرہ یا اسکی نفسیاتی یا فلسفیانہ توجیہہ کی ہے۔

عقاد کی خود نوشت پر گہرے نفسیاتی تجزیہ کا رنگ غالب ہے۔ وہ ہر بات کی تحقیق و تصدیق کیلئے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ تفسیر و تحلیل سے وہ بالکل نہیں گھبراتے۔ وہ فکری اور علمی ماحول کو پسند کرتے ہیں۔ خواہ یہ کتنا ہی بے کیف اور خشک ہو۔ اسلئے انہوں نے اپنے فکری اور عقلی خیالات کی وضاحت کیلئے منطق و فلسفہ کے اصولوں سے بیش از بیش فائدہ اٹھایا ہے۔ اسکی وجہ سے ان کی خود نوشت سے بہت دور نکل گئی ہے کیونکہ اسمیں احساس و شعور، جذبات اور آسان الفاظ کا خیال بہت کم رکھا گیا ہے۔ وہ بہرحال اپنی عقلی طبیعت سے اپنے آپ کو علیحدہ نہیں کر سکے۔ یہ طبیعت انکی نثری سرمایہ ہے حتی کہ ان کی خود نوشت پر بھی غالب رہی۔

ان کی خود نوشت کے مطالعہ سے ایک خاص بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ اسمیں انہوں نے اپنی ذات کا حد سے زیادہ خیال رکھا ہے۔ انہوں نے زندگی کے مختلف

میدانوں میں اپنی نمایاں خدمات کا بار بار تذکرہ کیا ہے۔ اور اپنے نفس سے بہت کم تجاوز کیا ہے۔ ان کی منفرد شخصیت ہی ان کی پوری خود نوشت کا بنیادی محور ہے۔ وہ اپنے مخصوص نقطۂ نظر ہی سے تمام واقعات و حادثات کا جائزہ لیتے ہیں۔ چنانچہ یہ بات بہت آسانی سے کہی جا سکتی ہے کہ ان کی "انا" انکے پاس ہمیشہ موجود رہی۔ اور ان سے کبھی جدا نہیں ہوئی۔ اسکے اظہار اور اثبات میں اکثر و بیشتر بات آگے بڑھ کر کبریائی، بلندی، تعلی اور خود پرستی تک پہنچ جاتی تھی۔ اس کے نتیجے میں انہیں بہت سے معرکوں اور مقابلوں میں شریک ہونا پڑا اور بہت سے لوگوں سے عداوتیں مول لینی پڑیں۔ ذات پرستی اور تعلی کا یہ وصف انکی سوانح کے علاوہ دوسری تحریروں میں بھی پایا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ ان کے اشعار بھی اس سے محفوظ نہیں رہ سکے۔ صحیح بات یہ ہے کہ خود پسندی کا یہ وصف ان کے اندر بچپن سے محفوظ تھا۔ اپنی خود نوشت میں انہوں نے خود ایسے واقعات نقل کئے ہیں جن سے انکے تمرد، عناد اور اصرار و الحاح کا اندازہ ہوتا ہے۔ انفرادیت گوشہ نشینی اور علیحدگی پسندی تو انہیں موروثی طور سے نصیب ہوئی تھی۔ پھر بعد میں ڈارون اور نیشے وغیرہ کے نظریات کے مطالعہ سے ان اوصاف کی بالیدگی اور نشو و نما میں مدد ملی۔ اسطرح یہ اوصاف انکی شخصیت میں بالکل جاگزیں ہو گئے اور پھر بعد میں یہی ان کی امتیازی شان بن گئے[1]۔

عقاد نے اپنی خود نوشت سوانح حیات میں عظمت اور برتری کے جس احساس کا بار بار مظاہرہ کیا ہے۔ اسمیں وہ ایک حد تک حق بجانب ہے۔ انہوں نے بلاشبہ ایک کامیاب اور شاندار زندگی گذاری تھی۔ علم و ثقافت کی راہ میں حائل بہت سی مشکلات کو دور کر کے انہوں نے ادب، سیاست، معاشرت اور فکر کی دنیا میں ایک نمایاں اور ممتاز مقام بنایا تھا[2]۔

---

[1] عباس محمود عقاد، انا ص ۱۲ و ۳۹-۴۰

[2] شوقی ضیف، عباس العقاد، دار المعارف مصر ۱۹۶۲ء ص ۵۲-۵۵

روایتی تعلیم سے بہت زیادہ مستفید نہ ہونے کے باوجود وہ محض اپنی محنت، لگن اور دلچسپی سے زمرۂ مفکرین کی صف اول میں شامل ہوگئے۔ وہ عصر حاضر کی ان چند رہنماؤں میں سے ایک ہیں جو مشرقی تہذیب کے ساتھ ساتھ مغربی تہذیب کے اسرار و رموز سے بھی واقف اور آگاہ تھے۔ اور اپنی تحریروں کے ذریعہ اس تہذیب کے بہت سے مفید حصوں کو اپنے ہم وطنوں تک منتقل بھی کیا۔ اس سے یقیناً مصر اور عالم عرب میں ادبی و فکری نشاۃ ثانیہ کے آغاز میں کافی مدد ملی[1]۔ جدید عربی شاعری خاص طور سے ان کی اپنی مساعی اور کوششوں کی مرہون منت ہے۔ انہوں نے اسمیں روایت پرستی اور تقلید کے خلاف بلند آواز کرکے اسکے موضوعات اور اغراض و مفاہیم میں تبدیلی کا مطالبہ کیا۔ جسے بڑی حد تک پذیرائی اور مقبولیت ملی۔

عقاد نے اپنے قلم کے ذریعہ ہمیشہ ظلم و عدوان اور سرمایہ داری و استعماریت کے خلاف اعلان جنگ کیا تھا۔ وہ معیشت، معاشرت، سیاست اور فکر میں آزادی کے علمبردار تھے۔ وہ گرچہ متوسط طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے پاس بڑی بڑی سندیں اور القاب و آداب نہیں تھے۔ ان کے پاس مال و دولت کی بھی بہتات نہیں تھی۔ لیکن چونکہ وہ بے باک، نڈر اور قادر الکلام ادیب، صحافی اور نقاد تھے۔ اس لئے ان کی ہر طبقۂ فکر میں پذیرائی ہوئی۔ اور عصر حاضر کے ممتاز ادیبوں، شاعروں اور انشاء پردازوں نے انکی نمایاں فکری و ادبی خدمات پر انہیں خراج تحسین پیش کیا۔ انمیں ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے انکی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے اسے جدید عصری تقاضوں سے بھرپور اور ہم آہنگ قرار دیا۔ اور یہ مطالبہ کیا کہ تمام عرب شعراء اور ادباء کو اپنی قیادت کا علم عقاد کے ہاتھ میں دیدینا چاہیئے[2]۔ ابراہیم عبدالقادر مازنی نے ان کے قصیدۂ "ترجمۂ شیطان"

---

[1] شوقی ضیف، مع العقاد ص ۶۲ - ۶۳۔

[2] حیاۃ قلم۔ تقدمہ طاہر الطناحی ص ۱۵۔

کو عربی زبان کا پہلا قصیدہ بتایا جو متعین فکر کے تحت پیش کیا گیا ہے۔ اور جس کا ہر شعر اسی فکر کے تحت گردش کرتا ہے۔ سعد زغلول کی نظر میں وہ ایک ایسے ادیب جسکے پاس قلم کی دولت، مردانگی، سچی وطن دوستی اور وسیع معلومات کا ذخیرہ موجود ہے۔[1] ظاہر ہے اسطرح کے ممتاز افراد کے توصیفی بیانات سے عقاد کی خود اعتمادی اور اعتماد النفس کی تقویت اور تائید ملی ہوگی۔ اور اسکی وجہ سے اگر وہ اپنے اوپر فخر و غرور کرنے لگیں تو یہ کوئی بہت زیادہ قابل مواخذہ عمل نہیں ہے۔

اس وضاحت کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ اپنی خوبیوں اور اوصاف کے تذکرہ کرنے میں عقاد نے ضرورت سے زیادہ زور صرف کیا ہے۔ اسکی وجہ سے انکی خود نوشت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔ ایک کامیاب خود نوشت سوانح نگار اپنے آپ کو ہمیشہ احتساب، مواخذہ اور تادیب کے کٹہرے میں کھڑا رکھتا ہے۔ وہ اپنی خوبیوں کے ساتھ ساتھ خامیوں اور عیوب پر بھی نظر رکھتا ہے۔ اسی شکل میں وہ قارئین کے ذہن و فکر پر گہرے نقوش ثبت کرتا ہے۔ اور اپنی تحریر کی صداقت، معروضیت اور غیر جانبداری پر ناقابل تردید شواہد فراہم کرتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ عقاد سے یہاں پر چوک ہوئی ہے اور بنظر ظاہر اسکی تاویل مشکل نظر آتی ہے۔

جب ہم اس خود نوشت کے فنی پہلو پر غور کرتے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے اسمیں وہی تحلیلی اسلوب اختیار کیا ہے جو ان کی تحریر کا خاصہ ہے وہ بلاشبہ مقالہ نگاری کے ماہر اور مشاق تھے۔ اور اسکے اسلوب یعنی اسلوب تحلیل و تجزیہ کے استعمال کی بہترین صلاحیت رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ اپنی تحریروں میں تفسیر

---

[1] عقاد دراسة وتحية - خليفة التونسي، مكتبة الانجلو المصرية (ب ت) ص ۱۲۰

الضاح اور تحلیل نفسی کا بھی بھرپور مظاہرہ کرتے ہیں۔ وہ اپنے موقف کی وضاحت کیلئے منطق وفلسفہ پر اعتماد کرتے ہیں۔ اور عقلی حجج اور براہین کے استعمال سے ذرہ برابر کوتاہی نہیں برتتے[1]۔ ان کا یہی عقلی اور تحلیلی طرز نگارش انکی خود نوشت کا بھی طرۂ امتیاز بنا۔ اسکے کچھ افراد کو چھوڑ کر اکثر جگہوں میں انہوں نے تصویر اور منظر کشی سے کام لیا ہے۔ یوں تو ان کی اصل توجہ حقائق کے پیش کرنے ہی پر مرکوز رہی لیکن کہیں کہیں بقدر ضرورت خیال اور تصور کی تھوڑی سی مقدار بھی شامل کر دی ہے۔

عقاد کے بارے میں یہ حقیقت متعدد مقامات پر واضح کی جا چکی ہے کہ ان پر فکر اور فلسفہ کا غلبہ تھا[2]۔ چنانچہ دوسری تصنیفات کی طرح اپنی خود نوشت میں بھی یہ بہت جلد اپنے موضوع سے ہٹ کر عقل وفکر کی دنیا میں گم ہو جاتے ہیں۔ اسکی وجہ فنی طور سے انکی خود نوشت میں بعض ضروری اوصاف اور عناصر نظر انداز ہو گئے۔ چنانچہ ان کی ابتدائی تین فصلوں میں تو کہیں کسی حد تک زمنی ترتیب اور منطقی تسلسل کا وجود ملتا ہے۔ لیکن بعد کی فصلوں میں اسکی کمی کا شدت سے احساس ہوتا ہے۔ اسکی وجہ سے ہمیں انکی ذہنی، فکری، ادبی اور نفسیاتی زندگی کے ارتقائی مراحل سے واقفیت میں دشواری پیش آتی ہے۔ گرچہ انہوں نے اپنی عقلی، اخلاقی اور نفسیاتی زندگی کی صورت گری میں تدریج کا خیال رکھا ہے۔ لیکن واقعات وحادثات اور مواقف کے پیش کرنے میں جو زمنی ترتیب ملحوظ رکھنی چاہیئے تھی وہ بہرحال نہیں رہ سکی۔ وہ اپنے افکار ومعانی اور احساسات وخواطر کو آزادانہ طور سے پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ اور اس سلسلہ میں کلیتہً اپنی قوت یادداشت پر انحصار کرتے ہیں۔ اسکی وجہ سے تکرار اور استطراد سے بچنا بھی ان کے لئے خاصہ مشکل امر ہو گیا ہے۔

---

[1] محمد طاہر الجبلاوی، فی صحبۃ العقاد، مکتبۃ الانجلو المصریۃ (ب ت) ص ۱۹۶-۱۹۷/۲۰۳

[2] عثمان امین، نظرات فی فکر العقاد، الدار المصریۃ للتالیف والترجمۃ ۱۹۶۶ء ص ۵۹/۵۰

اسطرح گویا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کی خودنوشت میں تماسک، احکام، زمانی ترتیب اور منطقی تسلسل کی کمی ہے۔ اور اس کا بڑا سبب ان کا اختیار کردہ اسلوب مقالہ نگاری ہے۔ اس خودنوشت میں تدریج تسلسل اور کی کمی کی وجہ سے اسکے قارئین کو جگہ جگہ ٹوٹ پھوٹ کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اور اس کے اجزاء کے مابین ایک طرح کا خلا اور انتشار محسوس کرتے ہیں۔

چونکہ عباس محمود عقاد نے اپنے پسندیدہ طرز نگارش کے مطابق اپنی خودنوشت سوانح میں بھی تحلیل نفسی، افکار کی تشریح و تاویل، تحلیل، تعلیل، عقلی محاجہ، منطقی استدلال اور معروضی مطالعہ کو محفوظ رکھا تھا۔ اسلئے یہ خودنوشت ادبی اور فنی اعتبار سے مطلوبہ معیار پر پوری نہیں اتر سکی۔ اس انداز تحریر کی وجہ سے اس خودنوشت میں ایسے بہت سے امور و مسائل درپیش آئے ہیں۔ جن کے باعث ان کی زندگی کے واقعات و حوادث کے مابین طویل فصل واقع ہو گیا ہے۔ ظاہر ہے اسکی وجہ سے اس میں ربط اور ترتیب و تدریج کا فقدان ایک فطری عمل ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر عقاد نے اپنے مذکورہ طرز پر اسقدر انحصار نہ کیا ہوتا تو ان کی خودنوشت فنی عناصر سے لبریز ہوتی۔ مقالہ نگاری کے اس طرز کے اختیار کرنے کی وجہ سے ان کو جو بہت سے نقصانات ہوئے انمیں سے ایک یہ بھی ہوا کہ افکار و دلائل پر بہت زیادہ توجہ کی جسکی وجہ سے وہ احساسات و جذبات کی مکمل ادائیگی سے قاصر رہ گئے اور اسکی وجہ سے اس خودنوشت میں زندگی اور حرارت کی وہ کیفیت پیدا نہیں ہو سکی جو جذبات و خواطر میں ارتعاش پیدا کر دے اور قارئین کے دلوں میں مصنف سے قربت اور محبت کا داعیہ پیدا کر دے۔ اس کتاب کی آخری تین فصلوں کو چھوڑ کر بقیہ ہر جگہ فنی

عناصر بلکہ تصویر، حوار، تخیل اور لقوہ وغیرہ کی کمی کا احساس ہوتا ہے۔ مذکورہ تینوں مضمون میں کس حد تک قارئین کی جمالیاتی حس کو تسکین حاصل ہوتی ہے۔ کیونکہ المنیں مقالہ نگاری کی اور مقالہ نگاری کے اسالیب کے درمیان تال میل پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان کے علاوہ پوری کتاب پر مقالہ نگاری کا تحلیلی اسلوب ہی غالب ہے۔

جس طرح فن مقالہ نگاری کا اسلوب اختیار کرنے کی وجہ سے ان کی خودنوشت کی ادبی حیثیت متاثر ہوئی۔ اسی طرح سلسلۂ عبقریات میں اختیار کردہ طرز کو یہاں بھی برقرار رکھنے سے اس کو نقصان پہنچا۔ بلاشبہ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ان کی خودنوشت کا طرز تحریر ان کی دیگر سوانح سے بہت زیادہ مشابہ اور قریب ہے[1] غالباً ان کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ وہ تاریخ کی مایہ ناز ہستیوں کی طرح ایک اور ہستی کی سوانح قلمبند کر رہے ہیں۔ اس تصور کی وجہ سے انہوں نے صرف اپنے اوصاف حمیدہ اور خصائل عالیہ پر توجہ دی۔ اور انہیں اپنے عقلی و منطقی دلائل سے ثابت کیا۔ اسکے نتیجہ میں سب سے بڑا خلا یہ پیدا ہوا کہ اسمیں منفی پہلوؤں کے لئے کوئی جگہ نہیں رہ گئی۔ گویا مصنف خطاؤں سے پاک ہے۔ اسکی وجہ سے بلاشبہ مصنف کی صاف گوئی، سچائی اور غیر جانبداری کے تعلق سے شکوک و شبہات پیدا ہوئے۔ کیونکہ انسان خطا و نسیان سے مرکب ہے۔ اگر وہ اپنے اس طبعی وصف کو نظر انداز کرے گا تو اسکی گرفت ہوگی۔ پھر اپنی خوبیوں اور اوصاف کے بار بار اور مسلسل تذکرہ سے قارئین اس کتاب کے مطالعہ سے بہت جلد اکتاہٹ محسوس کرنے لگتے ہیں۔ انکے احساس و شعور میں وہ بیداری اور جوش پیدا نہیں ہوتا جو ایک کامیاب خودنوشت نگار کا خاصہ ہوتا ہے۔ ان سب کی

---

[1] عبقریات سے ملاحظہ ہو: شوقی ضیف، سے العقاد ص ۸۲ - ۹۰

وجہ سے بحیثیت فن یہ خود نوشت عربی ادب میں کوئی نمایاں مقام حاصل نہیں کر سکی۔

اس آپ بیتی کی تیسری کمزوری یہ ہے کہ اسمیں صرف خارجی افکار و مسائل سے تعرض کیا گیا ہے۔ اور متعدد واقعات و حادثات کی وجہ سے قلب و ذہن پر جو اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ اسکی تفصیلات اس میں بہت کم فراہم کی گئی ہیں۔ اس کے مصنف نے ایک سرگرم ادبی و تنقیدی زندگی بسر کی تھی انہوں نے مختلف مباحث اور مسائل میں حصہ لیا تھا۔ اسکی وجہ سے لازماً ان کے دل میں ہلچل، اضطراب اور بے چینی پیدا ہوئی ہوگی۔ لیکن وہ کمال ہوشیاری سے ان کیفیات کے تذکرہ سے اپنے آپ کو الگ کر لیتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اپنے سخت اور بے لچک مزاج کی وجہ سے انہوں نے ایسا قصداً کرنے سے گریز کیا ہو۔ کیونکہ اس شکل میں ان کے بعض ایسے گوشے بھی سامنے آ سکتے تھے جو ان کی تعلی پسند اور مغرور شخصیت سے میل نہ کھاتے ہوں۔

مذکورہ بالا سطور سے یہ حقیقت بالکل واضح ہو گئی ہے کہ عقاد کی خود نوشت سوانح حیات عقلی اور فکری اعتبار سے بلاشبہ عربی زبان کے ذخیرے میں ایک ممتاز مقام کی حامل ہے۔ اور یہ عقاد کی منطقی اور فلسفیانہ شخصیت کی بھرپور عکاس ہے۔ لیکن یہ پہلو اسقدر غالب ہو گیا کہ ادب اور فن کے بہت سے تقاضے نظر انداز ہو گئے۔ یہ ان کی زندگی کے کچھ اہم گوشوں سے متعلق کوئی تفصیل فراہم نہیں کرتی۔ اس میں اپنے افکار کے تحلیل و تجزیہ اور اپنی ذات کی فلسفیانہ و عقلی تعبیر پر اس قدر زور دیا گیا ہے کہ اس کے باعث وہ عناصر کمزور پڑ گئے ہیں۔ جو ہماری جمالیاتی حس کو بیدار کرنے کا سبب بنتے ہیں۔

قصۂ حیاتی

احمد لطفی السید

احمد لطفی السید نے اپنی خود نوشت سوانح حیات نوے سال کی عمر میں تحریر کی۔ اسمیں انہوں نے اپنے فکری، سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی افکار و خیالات کی ایک زندہ تصویر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس تصویر کشی کے ذریعہ جسکی بنیاد مضبوط علمی فلسفہ پر قائم تھی انکی زندگی کے اہم گوشے ابھر کر سامنے آجاتے ہیں۔ انہوں نے اس کتاب میں اپنے ذاتی احوال کے علاوہ بیسویں صدی عیسوی کے ابتداء میں مصر کے عمومی حالت پر خاص طور سے روشنی ڈالتے ہوئے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ سیاست، فکر اور معاشرت کے میدان میں مصر کی تعمیر نو کیلئے انکی سعی و جدوجہد کی نوعیت کیا تھی اور اس کے بنیادی اصول و مبادی کہاں سے اور کیسے ماخوذ تھے؟

لطفی السید نے یہ کتاب مختلف پیراگرافس میں تحریر کی ہے۔ اور ہر پیراگراف میں اپنی زندگی کا کوئی اہم گوشہ بیان کیا ہے۔ یہ کتاب مختلف چھوٹے چھوٹے نثری مقالات پر مشتمل ہے۔ اور ہر مقالہ انکی زندگی کے کسی ایک مرحلہ کے بارے میں مکمل اور جامع معلومات فراہم کرتا ہے۔ چنانچہ پہلے مقالہ میں انہوں نے اپنی ابتدائی زندگی کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ مصر کے ضلع "سنبلاوین" کے ایک گاؤں میں ۱۵ جولائی ۱۸۷۲ء کو پیدا ہوئے۔ یہ ضلع مصر کا انتہائی زرخیز اور مردم خیز ضلع ہے۔ ان کے والد "سید ابو علی پاشا" گاؤں کے بااثر لوگوں میں سے تھے۔ وہ اپنی بہترین خوبیوں کی بنا پر پورے گاؤں

میں عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ جب اُن کی عمر چار سال کی ہوئی تو انہیں گاؤں کے ایک مکتب میں داخل کر دیا گیا۔ یہاں انہوں نے قرأت قرآن اور حساب وغیرہ کی تعلیم حاصل کی اور دس سال کی عمر میں قرآن مجید کا حفظ مکمل کیا۔ اس کے بعد ان کے والد محترم نے انھیں جامعہ ازہر بھیجنے کا ارادہ کیا لیکن اپنے بعض احباب کے مشورے سے ۱۸۸۲ء میں منصورہ کے نرسری اسکول میں داخل کر دیا۔ پورے علاقہ میں یہ واحد اسکول تھا جو براہ راست حکومت کی نگرانی میں چل رہا تھا۔ اس سے فراغت کے بعد انہوں نے قاہرہ کے خدیویہ اسکول میں داخلہ لے لیا جہاں ثانوی تعلیم کے تمام مراحل بحسن و خوبی طے کئے۔ اسی اسکول میں انکی ملاقات ان کے دیرینہ رفیق عبدالعزیز فہمی سے ہوئی۔ جو تاحیات ایک گہری دوستی اور الفت میں تبدیل ہو گئی۔[1] اس کالج سے ۱۸۸۹ء میں بی اے (B.A.) کی ڈگری حاصل کر لینے کے بعد انہوں نے قاہرہ کے مدرسۃ الحقوق (Law College) میں داخلہ لے لیا۔ اس کالج میں جدید و قدیم اور عقلی و نقلی دونوں طرح کے علوم پڑھائے جاتے تھے۔ اسی کالج کی تعلیم کے دوران ان کا تعارف اور ملاقات شیخ محمد عبدہ سے ہوئی۔ وہ یہاں ممتحن بن کر آئے تھے۔ لطفی السید اسکی تفصیل خود بیان کرتے ہیں۔

"شیخ محمد عبدہ کو ہر سال قانون کے طلبہ کا امتحان لینے کیلئے دعوت دی جاتی تھی۔ میرا تعارف اسی امتحان کی وجہ سے ہوا۔ امتحان میں سوال کو انشاء کے پرچہ میں "حکومت کو مجرم کو سزا دینے کا حق کیسے پہنچتا ہے"۔ (کیف کان للحکومۃ حق عقاب المجرم) کے موضوع پر مقالہ لکھنا تھا مجھے خیال

---

[1] احمد لطفی السید، قصۃ حیاتی ص ۱۷-۲۳، دار الہلال ۱۹۶۲ء۔

ہے کہ جواب کیلئے کل چار گھنٹے کا وقت دیا گیا تھا۔ چنانچہ میں نے اس مسئلہ کے بارے میں چاروں فقہی مذاہب کے علماء کی تشریحات کا تجزیہ کیا اور پھر ان پر تنقید کر کے یہ ثابت کیا کہ حکومت کو کسی بھی طرح کسی مجرم کو سزا دینے کا حق نہیں پہنچتا ہے۔ اسلئے کہ حکومتیں بالعموم حق کے بجائے قوت کے بل پر قائم رہتی ہے۔ میں نے اپنے خیال کو کافی مدلل بنا کر پیش کیا اور پوری کاپی بھر ڈالی۔ امتحان ہال سے باہر نکل کر جب میں نے اپنے ساتھیوں سے اس کا ذکر کیا تو انہیں کافی اضطراب اور پریشانی ہوئی۔ ان سب کا خیال تھا کہ میری ناکامی یقینی ہے۔ پھر ان تمام نے مجھ پر لعنت ملامت بھیجی۔ اب میں بھی اپنے دل میں کامیابی کے ہر امکان کو مسترد کر چکا تھا۔ لیکن زبانی امتحان کے دن میرے موضوع کو شیخ محمد عبدہ نے اپنے ذمہ لے لیا۔ کچھ دیر گفتگو کے بعد انہوں نے مجھے سب سے اچھے نمبر دیئے۔ تاہم اپنے افکار و خیالات میں اعتدال اور میانہ روی پیدا کرنے کی نصیحت کی۔ کیونکہ انہیں ایام شباب میں ان افکار و خیالات سے کچھ اندیشہ ہو گیا تھا۔"[1]

شیخ محمد عبدہ نے مذکورہ مضمون پر لطفی السید کی کافی حوصلہ افزائی کی اور انہیں باقاعدہ تصنیف و تالیف میں دلچسپی لینے کا مشورہ دیا۔ اس سے انکی تحریری صلاحیت کو کافی تحریک ملی۔ اور وہ باضابطہ طور سے صحافت اور انشاء پردازی میں حصہ لینے لگے۔ چنانچہ

---

[1] احمد لطفی السید، قصۃ حیاتی ص ۲۲ - ۲۵۔

انہوں نے اپنے بعض ساتھیوں کی مدد سے "مجلۃ النشر" کی اشاعت اور زیادہ سے زیادہ مفید اور اہم مضامین کی شمولیت پر توجہ دی۔ اس کے علاوہ بعض دوسرے اخبارات میں بھی لکھنا شروع کیا۔ "جریدۃ المؤید" میں کچھ دنوں اُن کا تعلق اس مخصوص شعبہ سے تھا۔ جس کا کام غیر ملکی خبروں اور تبصروں کو عربی زبان میں نقل کرنا تھا۔

اس تعلیم کے دوران ہی ۱۸۹۲ء میں استنبول کا سفر کیا۔ یہاں اتفاق سے ان کی ملاقات شیخ علی یوسف، سعد زغلول اور حفنی ناصف سے ہوئی۔ ان کے توسط وہ شیخ جمال الدین کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ وہ ان قد آور شخصیت سے بہت متاثر تھے۔ انہوں نے ان سے اجازت لیکر شرف تلمذ حاصل کیا۔ اور ان سے بہت زیادہ مستفید ہوئے۔ ان کا خود بیان ہے کہ انہیں شیخ کی صحبت سے بہت فائدہ ہوا۔ فکر و نظر میں آفاقیت اور احتساب و جائزہ کی عادت ان کو اسی فیض سے حاصل ہو سکی۔

اس کے بعد والے مقالہ میں انہوں نے یہ بتایا کہ ۱۸۹۳ء میں قانون کی تعلیم مکمل کر لینے کے بعد انہوں نے قاہرہ کی عدالت کے محکمۂ استغاثہ (Prosecution) میں پہلے محرر پھر معاون اور بعد میں منیب کی حیثیت سے کام کیا۔ لیکن ان مصروفیات کے باوجود وہ اپنے فرض منصبی کی ادائیگی سے غافل نہیں ہوئے۔ اور قوم اور حکومت کی اصلاح کیلئے کوشاں رہے۔ ملکی حالات کے پس منظر میں وہ اسوقت دو امور پر زیادہ توجہ دینا ضروری سمجھتے تھے۔ ان میں سے ایک انگریزوں کا مصر سے مکمل انخلاء اور دوسرے وہاں دستور کا نفاذ تھا۔ ان مقاصد کے حصول کیلئے انہوں نے اپنے احباب مثلاً عبدالعزیز فہمی کے ساتھ مل کر ایک خفیہ جماعت تشکیل دی تھی۔[1]

---

[1] احمد لطفی السید، قصۃ حیاتی ص ۳۱ - ۳۲۔

اس کے بعد اسی مقالہ میں انہوں نے اپنے سفر سوئٹزرلینڈ کا ذکر کیا ہے۔ یہ سفر اس وقت کے مصری رہنما خدیو عباس کی تجویز اور خواہش پر مرتب کیا گیا تھا۔ ان دنوں خدیو عباس نے انگریزوں کے مکمل انخلاء کیلئے مصر کے تعلیم یافتہ نوجوانوں پر مشتمل ایک خفیہ تنظیم کی بنیاد ڈالی تھی۔ اس پارٹی کی تمام سرگرمیاں خفیہ اور صیغۂ راز میں رکھی جاتی تھیں۔ حتیٰ کہ ان کے متوسلین کے نام بھی اصلی کے بجائے رمزی رکھے جاتے تھے۔ اسی مقصد کے تحت خدیو عباس کی یہ خواہش تھی کہ انگریزوں کے خلاف جو مہم چلائی جائے وہ مصر سے باہر ہو۔ چنانچہ انہوں نے لطفی السید کو سوئٹزرلینڈ جاکر وہاں مختلف ممالک کے نمائندوں اور دیگر اہل علم سے ربط قائم کرنے کی تلقین کی۔ جسے انہوں نے قبول کرلیا۔ وہ اس سفر کے فوائد اور اپنی مصروفیات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"وہاں پہنچ کر میں نے اپنے مشن کی کامیابی کیلئے پوری کوشش کی۔ اس سلسلہ میں مختلف علماء اور سیاستدانوں سے تبادلۂ خیال کیا۔ ان میں سوئٹزرلینڈ کے مشہور ماہر آثار جناب نیول بھی تھے۔ انہوں نے صاف صاف کہا کہ ہوسکتا ہے کہ یورپ کی ہمدردی آپ لوگوں کو حاصل ہو جائے لیکن میرا خیال یہ ہے کہ اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ کیونکہ یوروپی مزاج یہ ہے کہ وہ بغیر اپنے ذاتی مفاد کے کسی کی بھی مدد نہیں کرسکتا۔ اسلئے مصریوں کو یہ خیال دل سے نکال دینا چاہیئے کہ یورپ کا کوئی ملک بھی انگریزوں کے خلاف انکی مدد کریگا۔ اس کے بجائے انہیں اپنی آزادی کی تحریک خود

اپنے سہارے چلانی چاہیئے۔ یہی طریقہ ان کیلئے زیادہ مفید اور بہتر ہوگا۔"[1]

انہوں نے اپنی خودنوشت میں یہ صراحت سے لکھا ہے کہ انہیں نیول کی مذکورہ بات مبنی برحقیقت نظر آئی۔ اور اس کے کئی پہلو قابلِ غور اور لائقِ توجہ نظر آئے۔ جنیوا میں انکی ملاقات مصر کے کچھ دوسرے زعماء مثلاً شیخ محمد عبدہ، قاسم امین اور سعد زغلول سے ہوئی۔ ان تمام سے انہیں گفتگو اور تبادلۂ خیال کا موقعہ ملا۔ خاص طور سے شیخ محمد عبدہ کے خیالات بہت قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ ان سب کی وجہ سے لطفی السید کے سیاسی افکار میں واضح تبدیلی آئی۔ اب ان کا اس حقیقت پر ایمان راسخ ہو چکا تھا کہ مصریوں کی آزادی صرف ان ہی کے ذریعہ ممکن ہے۔ اس کیلئے کوئی بیرونی طاقت کوئی مؤثر رول ادا نہیں کر سکتی۔ اور مصریوں کو یہ مشکل کام انجام دینے کیلئے مناسب استعداد بہم پہنچانا ضروری ہے۔ جس کا پہلا زینہ تعلیمی ارتقاء ہے۔ ان کے ان جدید خیالات سے خدیو عباس موافقت نہیں کر سکتے۔ اسطرح دونوں کے تعلقات کی خوشگواری باقی نہیں رہ سکی۔

اس کے بعد تیسرے مقالہ میں انہوں نے بتایا کہ سوئٹزرلینڈ سے واپسی کے بعد وہ محکمۂ استئنافہ میں دوبارہ ملازم ہو گئے۔ لیکن ذمہ داروں سے بعض اختلافات کی وجہ سے ۱۹۰۵ء میں استعفیٰ دیدیا۔ اور عبدالعزیز فہمی کے ساتھ وکالت کرنے لگے۔ لیکن پیشۂ وکالت کی قباحتوں اور خرابیوں کی وجہ سے وہ بہت دنوں تک اسے انجام نہیں دے سکے۔ اور اس سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ چونکہ سیاست اور صحافت ان کے پسندیدہ میدانِ کار تھے اسلئے وہ ان دونوں میں سرگرمِ عمل ہو گئے۔ اپنے سیاسی

---

[1] احمد لطفی السید، قصہ حیاتی ص ۳۵ - ۳۹۔

افکار و خیالات کو پیش کرنے کیلئے صحافت سے بہترین اور کوئی دوسرا ذریعہ نہیں تھا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے بعض ساتھیوں کے تعاون اور مشورہ سے ۱۹۰۷ء میں "الجریدہ" کے نام سے ایک اخبار جاری کیا۔ اس سے ان کے صحافتی ذوق کو تسکین ملی اور صلاحیتوں کو جلا ملی۔[1]

اس کے بعد انہوں نے "الجریدہ" اور "حزب الامۃ" پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔

"حزب الامۃ" کا قیام ۱۹۰۷ء میں عمل میں آیا تھا۔ یہ مصر کی پہلی سیاسی جماعت تھی جس نے اپنی سیاسی پالیسی، پروگرام اور اغراض و مقاصد کی باضابطہ وضاحت کی۔ مصر کی مکمل آزادی دستور کا بتدریج نفاذ اور تمام ضلعی، صوبائی و مرکزی کمیٹیوں کو ان کے اختیارات کی تفویض اس جماعت کے بنیادی اور اہم مطالبات تھے۔ لطفی السید اس پارٹی کے پہلے سکریٹری منتخب کئے گئے۔ اس جماعت پر شیخ محمد عبدہ کا اثر بہت نمایاں تھا۔ اس میں زیادہ تر مصر کا دانشور، صاحب الرأی اور صاحب حیثیت طبقہ شامل تھا۔ لطفی السید نے اس پارٹی کی ترجمانی کیلئے اپنے اخبار کو وقف کر دیا۔ انہوں نے اپنی تحریروں میں انتہائی عمدہ اسلوب اور بہترین انداز میں مصر کے مسئلہ آزادی کا تحلیل و تجزیہ کیا اور ان کے اخبار نے اسے کثیر تعداد میں لوگوں سے متعارف کیا۔ اسطرح یہ مسئلہ زندہ اور لائق التفات مسئلہ بن گیا۔[2]

اس کے بعد والے مقالہ میں انہوں نے تفصیل کیساتھ لارڈ کرومر جو مصر میں برطانوی حکومت کا نمائندہ تھا کی شخصیت اور خیالات و افکار کا جائزہ لیا ہے۔[3] لطفی السید اور انکی پارٹی "حزب الامۃ" کے بارے میں یہ معلوم ہے کہ وہ خدیو مصر کی پالیسیوں کے سخت مخالف تھے۔ اور قومی و وطنی مفادات کیلئے اس کے بالمقابل انگریزوں سے مصالحت کے قائل تھے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ بعض امور مثلاً دستور کے نفاذ اور تعلیم کی نشر و اشاعت میں

---

[1] احمد لطفی السید، قصۃ حیاتی ص ۴۱-۴۲ [2] ایضاً ص ۴۳-۴۷

[3] ایضاً ص ۵۱-۶۱

خدیو انگریزوں کے مقابلہ میں زیادہ رکاوٹیں پیدا کر رہا ہے۔ ادھر انگریز بھی خدیو اور عثمانی حکومت کی مخالفت اور حزب الامۃ کی جاگیرداروں وغیرہ میں مقبولیت کی وجہ سے ان سے زیادہ قریب تھے۔ اس دو طرفہ تعلق کی بنیاد پر لطفی السید حزب الامۃ اور پارٹی کے دوسرے ممبران مصر میں عوام و خواص کی طرف سے کافی تنقید کا نشانہ بنے تھے۔ انہوں نے اپنی خودنوشت میں لارڈ کرومر اور انگریزوں کے بارے میں اپنا موقف واضح کیا ہے۔ اور یہ بتایا ہے کہ مختلف اسباب کی بنیاد پر لارڈ کرومر سے کچھ فوائد کے حصول کی توقع تھی۔ خدیو کے مظالم سے نجات اور مصر کی خود مختاری کے حصول کا یہ ایک مناسب راستہ تھا۔ پھر انگریزوں کی مخصوص طبیعت اور مزاج کی وجہ سے ان سے یہ توقع تھی کہ وہ ملک میں اصلاح، بیداری اور ذاتی حکومت کے قیام میں مدد دیں گے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ لارڈ کرومر اور انگریزوں کے ہر اقدام کی ہمیشہ حمایت کرتے۔ صحیح بات یہ ہے کہ انکی حمایت قومی مفادات اور مصالح سے مشروط تھی۔ چنانچہ جب انھیں انگریزوں کی شاطرانہ چالوں اور ناپاک عزائم کا علم ہوا تو انہوں نے ان پر بحث و تنقید کی۔[1] انکی تنقید کا ہدف لارڈ کرومر کی شخصیت بھی بنی۔ انہوں نے اسکی نیت پر شک کا اظہار کیا۔ خاص طور سے اسکی کتاب "مصر الحدیثۃ" پر تنقید کی اور اس کے تمام مزعومات و افکار کو باطل اور بے بنیاد قرار دیا۔

اس مقالہ میں انہوں نے مصریوں کے مزاج، اخلاق اور عقائد وغیرہ کے بارے میں بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ انہوں نے مصری معاشرہ کی اصلاح کی اصل ذمہ داری حکومت کے سر ڈالی ہے۔ جو انکی نظر میں اپنے عدم استحکام، عوام کے عدم تعاون

---

[1] احمد لطفی السید، قصۃ حیاتی ص ۶۴ — ۷۰۔

حکمرانوں کی باہمی رنجش اور انتظامیہ کی اپنے فرائض سے غفلت کی وجہ سے اس ذمہ داری کو پورا کرنے میں بری طرح ناکام رہی ہے۔ بقیہ وہ اپنے مصری عوام میں اپنے تشخص اور انفرادیت کے عدم احساس، تعلیم و تربیت سے غفلت، بنیادی حقوق سے عدم واقفیت، بے جا مطالبات کے منوانے کیلئے صلاحیتوں کا ضیاع اور شجاعت و بہادری جیسے اوصاف حمیدہ میں تنزل اور انحطاط کی شکایت کرتے ہیں۔ اور ان میں سے ہر ایک کے ازالہ کی تدبیر بتاتے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی انہوں نے بعض امور پر گفتگو کی ہے۔[1]

اس کتاب کے چھٹے مقالہ میں بھی انہوں نے مصری معاشرت، عوام اور سیاست پر گفتگو کی ہے۔[2] اس کے ساتویں مقالہ میں انہوں نے "حسن عاصم"، "مصطفیٰ کامل"، "قاسم امین" اور "احمد عرابی" کے بارے میں اپنی رائے ظاہر کی ہے۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے اظہار خیال میں وہ حد سے زیادہ محتاط اور غیر جانبدار ہیں۔ اس کا اندازہ صرف "احمد عرابی" اور "مصطفیٰ کامل" کے بارے میں ان کے خیالات کے مطالعہ سے بآسانی لگایا جا سکتا ہے۔ یہ دونوں شخصیتیں لطفی کے فکر و مزاج سے ہم آہنگ نہیں تھیں لیکن اس کے باوجود ان سے متعلق ان کے خیالات میں اعتدال اور احتیاط پائی جاتی ہے۔ ان میں سے عرابی پاشا پر ان کے معاصرین خاص طور سے سخت ناراض تھے۔ وہ انہیں خائن قرار دیتے ہیں۔ اور مصر میں برطانوی سامراجیت کے قیام کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں۔ لیکن لطفی السید نے ان لوگوں کی مخالفت کی ہے۔ اور یہ اعلان کیا ہے کہ عرابی کے اندر بہت سی اچھائیاں موجود تھیں۔ مصری دستور کی ترتیب و تدوین میں انکی ذہانت، ذکاوت اور محنت کا بڑا حصہ تھا۔ اسکی بنا پر مصری عوام اور خدیو توفیق پاشا سب ہی ان سے خوش تھے۔ اس کے علاوہ جمہوری حقوق پارلیمنٹری

---

[1] احمد لطفی السید، قصۃ حیاتی ص ۷۱ - ۷۷

[2] ایضاً ص ۷۹ - ۹۱

نظام اور حق انتخاب وغیرہ کی تشریح و تعبیر عوام کو ان سے واقف کرانے میں ان کا نمایاں حصہ رہا ہے۔ ان سب کی وجہ سے لطفی السید نے ان کی تعریف کی ہے اور پارٹی سیاست اور گروہ بندی سے بلند ہو کر انکی حمایت کی ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ انہوں نے عرابی کی بعض خامیوں اور کمزوریوں کی نشاندہی کر کے ان پر اظہار نکیر کیا ہے[1]۔ اسی طرح مصطفیٰ کامل کے بارے میں بھی انہوں نے صاف، ستھرا اور معروضی نقطۂ نظر اختیار کیا ہے۔ وہ گرچہ مصطفیٰ کامل اور انکی پارٹی کے مخالف تھے۔ لیکن یہ اظہار خیال کرتے ہوئے اپنے ساتھیوں اور رفقاء کار کے بھی بعض خیالات کی مخالفت کی اور یہ واضح کیا کہ مصطفیٰ کامل ایک وطن پرست لیڈر تھا۔ اس کی فکر، عمل، کردار، گفتار، غرض و غایت اور پوری زندگی وطنیت سے عبارت تھی۔ وہ یہ بھی وضاحت کرتے ہیں کہ بغیر کسی اختلاف مذہب و ملت اس کے جنازے میں پوری قوم کا شریک ہو جانا اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے ذریعہ لوگوں میں قومی شعور پیدا ہوا ہے۔ اور یہ قوم پرست ان سے محبت کرتے ہیں۔ قوم کی اسی فکری اور عملی یکسانیت کے اظہار کی وجہ سے انہوں نے ان کی وفات کے دوسرے دن ان کا ایک مجسمہ تعمیر کرنے کی تجویز رکھی تاکہ اس سے ان کی برتری کا اعتراف ہو۔ اور لوگ ان کو دیکھ کر کرتے رہیں۔ انہیں اپنے اس خیال کی وجہ سے اپنے ساتھیوں اور شاگردوں کی طرف سے حیرت و استعجاب اور مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن وہ ہر طرح کے ردعمل اور دباؤ سے ماورا رہے[2]۔

کتاب کے آٹھویں مقالہ میں انہوں نے اپنے بیرونی اسفار میں سوئٹزرلینڈ، ترکی اور انگلینڈ کے سفر خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ سوئٹزرلینڈ اور

---

[1] احمد لطفی السید، قصۃ حیاتی ص ۱۰۴۔

[2] ایضاً ص ۹۳ — ۱۰۶۔

ترکی سفر زندگی کے ابتدائی مرحلہ میں انجام پایا تھا۔ سوئٹزرلینڈ میں شیخ محمد عبدہ اور ان کے رفقاء اور ترکی کے پایہ تخت استنبول میں شیخ جلال الدین افغانیؒ سے ان کی ملاقاتیں بڑی مفید اور مؤثر رہیں۔ شیخ جلال الدین افغانیؒ کے بارے میں وہ لکھتے ہیں۔

"جب میری ان سے ملاقات ہوئی تو مجھ پر ان کی شخصیت علم، ذکاوت اور بصیرت کی ہیبت بیٹھ گئی۔ سب نے ان سے درخواست کی کہ وہ مجھے اپنا شاگرد بنالیں اسپر وہ بہت زیادہ خوش ہوئے۔"[1]

انگلینڈ جانے کا مقصد جنگ عظیم اول کے بعد صدر ولسن کے چودہ نکاتی فارمولے سے استفادہ کرنا تھا۔ لیکن بیچ راہ ہی میں انہیں معلوم ہوا کہ صدر ولسن نے مصر پر برطانیہ کے تسلط کی اجازت دیدی ہے۔ اس کے باوجود یہ لوگ سفر سے بددل نہیں ہوئے۔ اور پیرس کی صلح کانفرنس سے عدل و انصاف کا مطالبہ کیا۔ لیکن کوئی شنوائی نہیں ہوئی۔[2]

پھر انہوں نے ان مقالات کی دوسری قسم لکھی ہے۔ اسمیں انہوں نے اپنے سیاسی دباؤ کی تصویر کشی کی ہے۔ اور سیاست، معاشرت، تعلیم اور فکر سے متعلق اپنے خیالات واضح کئے ہیں۔ پس نویں مقالہ میں انہوں نے سعد زغلول اور خدیو عباس سے اپنا تعلق اور اسی خدیو کے عہد میں مصر کی پہلی سیاسی پارٹی کی تشکیل پر روشنی ڈالی ہے۔[3] اس کے بعد دسویں مقالہ میں انہوں نے جنگ عظیم اول کے بارے میں اپنے اور بعض سابقین کے موقف کو پیش کیا ہے۔[4] اور یہ بتایا ہے کہ وہ اس کے بعد مصر کی آزادی کیلئے اہل مصر کی کوششوں کے بار آور ہونے سے

---

[1] احمد لطفی السید، قصہ حیاتی ص ۲۳ [2] ایضاً ص ۱۰۸ — ۱۳۰

[3] ایضاً ص ۱۳۹ — ۱۴۳ [4] ایضاً ص ۱۵۹ — ۱۷۰

تقریباً مایوس ہوگئیں۔ یہاں تک کہ سیاست اور صحافت سے کنارہ کشی اختیار کرلی اور ایک دوسرا میدان تلاش کیا۔ جس میں انہیں مصری زندگی کی اصلاح کے ضمن میں اپنی توقعات پوری ہوتی نظر آرہی تھیں۔ اور یہ میدان ترجمہ کا تھا۔ پھر وہ جنگ عظیم اول کے بعد مصر کی مکمل آزادی کے مطالبہ کی توجیہ و تعلیل کرتے ہیں۔ اور "الوفد المصری" کی تشکیل و تعمیر میں اپنے اور بعض ساتھیوں مثلاً عبدالعزیز فہمی، سعد زغلول، علی شعراوی اور محمد محمود وغیرہ کے کردار کی وضاحت کرتے ہیں[1]۔

لطفی السید نے برطانوی حکومت اور مصری وفد کے درمیان جاری مذاکرات کے دوران مصر کے بعض اہم سیاسی لیڈروں کی چپقلش اور محاذ آرائی سے تنگ آکر سیاست سے ہمیشہ کیلئے علیحدگی اختیار کرلی۔ وہ "دارالکتب المصریہ" سے منسلک ہوکر ترجمہ و تالیف کے کام میں مشغول ہوگئے۔ اس کے علاوہ قدیم مصری یونیورسٹی کے نصاب تعلیم اور قواعد و ضوابط پر بھی غور و فکر اور رد و بدل کرتے رہے۔ اپنی خود نوشت کے گیارہویں مقالہ میں وہ اس یونیورسٹی کے نصاب کی تجدید اور جدید مصری یونیورسٹی کے قیام کے سلسلہ میں اپنی کوششوں کا تعارف کراتے ہیں[2]۔ بلاشبہ یہ یونیورسٹی مصر کی قومی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ ۱۹۲۵ء میں انہیں پہلی بار جدید مصری یونیورسٹی کا وائس چانسلر بنایا گیا۔ اس وقت سے لیکر ۱۹۱۲ء تک وہ کچھ درمیانی وقفوں کو چھوڑ کر اس یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے۔ انہوں نے اپنی خود نوشت سوانح حیات میں اس نوبل وقفے کی داستان کافی تفصیل سے کی ہے۔ یونیورسٹی میں اپنی بعض تقرریاں، اسمیں طالبات کے داخلہ کی پالیسی

---

[1] احمد لطفی السید، قصۃ حیاتی ص ۱۷۱ – ۱۸۱ .

[2] ایضاً ص ۱۸۳ – ۱۹۲ .

یونیورسٹی کیمپس کے سیاسی اثرات سے تطہیر اور ان کے علاوہ بعض دوسرے اہم کاموں کا دو تین مقالات میں تعارف پیش کیا ہے۔ ۱۹۱۸ء میں محمد محمود پاشا کے دور وزارت میں وزیر تعلیم کی ذمہ داری سنبھالنے کے اسباب پر انہوں نے روشنی ڈالی ہے۔ یہ وزارت کچھ دنوں کے بعد ختم ہوگئی اور لطفی السید اپنے گھر واپس آکر مطالعۂ کتب اور ترجمہ میں مصروف ہوگئے۔ لیکن پھر انہیں مجبور کرکے دوبارہ وائس چانسلر شپ کیلئے آمادہ کرلیا گیا[1]۔

انہوں نے اپنی خود نوشت سوانح حیات کا خاتمہ اخلاقیات سے متعلق ایک باب پر کیا ہے جس میں انہوں نے یہ بتایا ہے کہ بین الاقوامی اس کے بغیر ممکن نہیں کہ عوام و خواص کچھ اقدار، اصولوں اور ضوابط کے پابند ہوں اور ان پر عمل آوری کیلئے ہر شخص اپنے آپ کو پابند بنائے۔ بصورت دیگر یہ دنیا فتنہ و فساد کی آماجگاہ بن جائے گی۔ اور ہر طرف ظلم و عدوان کا دور دورہ ہوگا۔ اسی مقالہ میں انہوں نے توسّوی اور فتحی زغلول کا بھی ذکر کیا ہے۔ اور ان کے افکار اور خدمات کا جائزہ لیا ہے[2]۔

کتاب پر ایک تجزیاتی نظر

اس خود نوشت کے ابواب اور موضوعات پر ایک سرسری نظر ڈالنے کے بعد اب اس کے بعض اہم گوشوں پر روشنی ڈالنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس سے اسکی خصوصیات اور نقائص ابھر کر سامنے آجائیں گے۔

اس کتاب کے مطالعہ سے سب سے پہلی حقیقت جو ابھر کر سامنے

---

[1] احمد لطفی السید، قصۃ حیاتی ص ۱۹۳ - ۲۰۰

[2] ایضاً ص ۲۰۱ - ۲۱۲

آتی ہے یہ کہ یہ کتاب اپنے مؤلف کے افکار و خیالات کی سچی آئینہ دار ہے۔ سیاسی معاشرتی اور اخلاقی امور سے متعلق یہ افکار و خیالات، علم سیاست اور علم اخلاق و فلسفہ کے مستحکم اصولوں سے ماخوذ و مستفاد تھے۔ اسمیں قدیم یونانی فلسفہ، اسلامی عربی فلسفہ، جدید یورپی فلسفہ اور جدید علم قانون کی آمیزش تھی۔ اسلامی فلسفہ سے استفادہ کیلئے بطور دلیل وہ اقتباسات پیش کئے جا سکتے ہیں۔ جو ابن رشد، ابن سینا اور ابن حزم کی کتابوں سے ماخوذ و منقول ہیں۔ جدید یورپی فلسفہ سے متاثر ہونے کا اندازہ ان تحریروں سے لگایا جا سکتا ہے جو انہوں نے مغربی مفکرین مثلاً فولتیر اور روسو وغیرہ سے متاثر ہو کر لکھی ہیں۔ وہ جرمنی مفکر "کانٹ" اور انگریزی فلسفی "جون سٹیورٹ مل" سے خاص طور سے متاثر تھے۔ انتفاع اور حریت کا مسلک ان ہی دونوں مفکرین کے اثر انگیزی کا نتیجہ تھا۔

منفعت کا مسلک لطفی السید کی سیاسی اور معاشرتی فکر کی مضبوط اساس تھا۔ کیونکہ ان کی نظر میں منفعت وہ بنیادی جذبہ ہے جو مختلف نوعیتوں کے تعلقات کے قیام و بقاء اور استحکام میں کارفرما ہوتا ہے۔ اسی طرح "جون سٹیورٹ مل" کا "مذہب حریت" ان کی معاشرتی اور سیاسی دعوت کی ترتیب و پیشکش میں معاون بنا[1]۔ یونانی فلسفہ میں وہ خاص طور سے ارسطو سے متاثر تھے[2]۔ ان کے "جمہوریت" کے بارے میں جو خیالات سامنے آئے ہیں۔ ان میں ارسطو کی فکر صاف طور سے نظر آتی ہے۔ ان کے ان افکار کا خلاصہ یہ ہے کہ قوم کو خود اپنے اوپر حکومت کرنی چاہیئے۔ کسی قوم پر کسی دوسرے کی حکومت کا مطلب یہ ہے کہ اس

---

[1] حسین فوزی، احمد لطفی السید قاہرہ ۱۹۶۵ء

[2] المجلۃ، مقالہ عباس محمود العقاد مئی ۱۹۶۳ء۔ ص ۶

قوم کے بنیادی حقوق غصب کئے گئے۔ اور ان پر کی جانے والی حکومت ظلم وجبر پر مبنی ہوگی[1] سیاست اور اخلاق میں ان کے ارسطو سے استفادہ کرنے کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے اس کی ان دونوں سے متعلق کتب "السیاسۃ" اور "علم الاخلاق" کا عربی زبان میں ترجمہ کیا[2]۔ وہ ارسطو کے فلسفہ کی اہمیت اور افادیت کے بارے میں خود لکھتے ہیں۔

"میں بچپن سے فلسفیانہ علوم کی طرف مائل تھا۔ میں نے ارسطو پر توجہ دی کیونکہ وہ علم منطق کا موجد اور اس کا سب سے بڑا مؤلف ہے۔ اس کے اثرات تمام علوم وفنون پر ہمیشہ باقی رہیں گے۔ جب میں دارالکتب کا مدیر تھا تو میں نے اپنے بعض ساتھیوں سے مصر کی علمی نشأۃ ثانیہ کی بنیاد تالیف کے بجائے ترجمہ کو بنانے پر زور دیا تھا۔ کیونکہ یورپی نشأۃ ثانیہ ہی بنیاد پر تھی ۔۔۔۔۔
آج ہماری قوم کو جس تربیت کی ضرورت ہے اسکیلئے فلسفہ ارسطو سے زیادہ مفید اور معاون کوئی دوسری چیز نہیں ہے۔ جدید علوم کو عربی زبان میں منتقل کرنا وقت کی ایک اہم ضرورت ہے"[3]

لطفی السید مصر اور عالم عرب میں ایک جدید سیاسی اسکول کے بانی قرار دیئے جاتے ہیں۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ فرد اور جماعت دونوں کو اپنی تربیت اور تعلیم وغیرہ پر اس قدر توجہ دینی چاہیئے کہ وہ سیاست، ادب، معاشرت اور اخلاق کی اعلیٰ قدروں کو سمجھنے، ان پر عمل پیرا ہونے اور انہیں حاصل کرنے کے لائق ہو سکیں

---

[1] صالح جودت، مجلہ الہلال جون ۱۹۶۳ء ص ۴۸۔ [2] ایضاً ص ۴۹

[3] احمد لطفی السید، قصۃ حیاتی ص ۱۶۸ – ۱۶۹۔

وہ یہ کہتے تھے کہ ان ضروری انتظامات کے بغیر مصر میں ارتقاء اور بیداری کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکے گا۔ انہوں نے اپنی مذکورہ سیاسی اور فکری دعوت کو مزید علمی دلائل سے مزین کیا ہے۔ اور اسے اس قابل بنایا ہے کہ کوئی شخص اسکے انکار یا تغلیط کی کوشش بآسانی نہ کر سکے گا۔[1]

ان کے سیاسی، معاشی اور تعلیمی نظریات کی وجہ سے مصر کے بہت سے لوگ ان سے ناراض تھے۔ اور انہوں نے اسکی وجہ سے ان کے راستہ میں طرح طرح کی رکاوٹیں ڈالنے کی کوشش کی۔ انہوں نے اپنی خود نوشت میں ان تمام چیزوں کا ذکر کیا ہے۔ اور خود انہوں نے اپنے موقف کے پیش کرنے میں جس جرأت، جوانمردی اور حوصلہ کا ثبوت دیا وہ بھی ایک قابل رشک عمل تھا۔ چنانچہ اسکی بعض تفصیلات سے بھی قارئین کو واقف کرانے کی کوشش کی۔ مصطفیٰ کمال اور جمال الدین افغانیؒ کے نظریات سے اپنا اختلاف اور اس کا سبب بھی بیان کیا ہے۔ وہ موخر الذکر رہنما کے تصور اتحاد اسلامی کے مخالف تھے جس کا مقصد تمام مسلمانوں کو ایک پرچم تلے جمع کرنا تھا۔ یہ دعوت انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں کافی مقبول ہوئی۔ لطفی السید نے ان تمام لوگوں کے علی الرغم ایک نیا سیاسی نظریہ پیش کیا۔ اور یہ نظریہ تھا "سیاسة مصر للمصریین"۔ چنانچہ انہوں نے اخبار "الجریدة" کے پہلے شمارے میں یہ اعلان کیا کہ یہ اخبار ایک مصری اخبار ہے۔ اس کا مقصد اشاعت مصریوں کے مفاد کا تحفظ ہے۔[2]

اپنی مذکورہ فکر کی بنا پر انہوں نے سب سے پہلے مصر اور عالم عرب میں مروج

---

[1] عبد اللطیف حمزہ، ادب المقالة الصحفیة فی مصر، ص ۱۳۱-۱۳۷، دار الفکر العربی قاہرہ ۱۹۶۱ء

[2] احمد لطفی السید، قصة حیاتی، ص ۱۲۔

اس خیال کی مخالفت کی جس کا محور یہ تھا کہ استعمار کی ہر حال میں مخالفت کی جائے۔ اور عثمانی خلافت سے اپنے تعلقات کسی طرح بہتر بنائے جائیں۔ اس کے برعکس انہوں نے اپنے اس خیال پر زور دیا کہ مصریوں کو اپنے تشخص کے حصول اور جہالت، تقلید اور معاشرتی و اخلاقی گراوٹ سے نجات حاصل کرنے پر اپنی اولین توجہ مرکوز کرنی چاہیئے۔ اور اس کے لئے زیادہ سے زیادہ تعلیم کے حصول اور اور اخلاقی تربیت میں کمال تک پہنچنے کی تگ و دو کرنی چاہیئے۔ کیونکہ اس کے بعد ہی قوم کو آزادی ملے گی۔ اور اس کے مفادات کا تحفظ ہو گا۔ پھر جب قوم سرخ رو ہو جاتی ہے تو افراد کی سرخ روئی میں دیر نہیں لگتی[1]۔

فرد اور قوم کی اصلاح کے لئے جیسا کہ گذر چکا ہے لطفی السید نے ارسطو کے فلسفہ کو عربی زبان میں منتقل کرنا ضروری سمجھا۔ کیونکہ وہ اسے جدید معاصر فکر کی کلید سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک جدید فلسفیانہ مذاہب اور قدیم عربی فلسفہ کی بنیاد اسی پر قائم ہے۔ خود یہ فلسفہ ہمارے موجودہ حالات سے بے حد ہم آہنگ ہے۔ اس لئے اسے اپنی زبان میں منتقل کر کے مغرب کی طرح مشرق میں بھی بیداری کیلئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ بلاشبہ ارسطو سیاست معاشرت اور فلسفہ کا معلّم تھا۔ لطفی السید نے اس نظریہ کے تحت ان کی جن کتابوں کا ترجمہ کیا ان میں اخلاق اور سیاست کے علاوہ "کتاب الطبیعۃ" اور "الکون والفساد" بھی تھیں[2]۔

انہوں نے اپنی خود نوشت میں یہ اعتراف کیا ہے کہ ان سے پہلے

---

[1] حسین فوزی، احمد لطفی السید ص ۲۵۷ — ۲۸۱

[2] احمد لطفی السید، قصۃ حیاتی ص ۱۶۵۔

فتحی زغلول نے قوم اور فرد کی اصلاح اور تربیت کیلئے ترجمہ کی ضرورت کا احساس کیا تھا۔ انہوں نے قوم کو اس کے حقوق سے واقف کرانے، حریت اور جمہوریت کے مفہوم سے آگاہ کرنے اور ان کے درمیان علمی اصول وضوابط عام کرنے کیلئے کئی ایک کتابوں کا ترجمہ کیا ہے۔ جس میں روسو کی "العقد الاجتماعی" کے علاوہ "الفرد ضد الامۃ" "روح الاجتماع" اور "سر تطور الامم" قابل ذکر ہیں۔ ان کتابوں سے عربوں کو دوسری قوموں کے تجربات سے استفادہ کرنے، ان تجربات کا اپنی زندگی پر انطباق کرنے اور اپنی شخصیت کو بنانے، سنوارنے اور نمایاں کرنے میں بڑی مدد ملی۔ مصطفی النحاس نے اس کام کو آگے بڑھایا۔ وہ پوری قوم اور پوری زندگی کی اصلاح کے لئے فرد کی اصلاح وتربیت کو سمجھتے تھے۔ فی الواقع اخبار "الجریدۃ" کے اجراء کا مقصد وحید یہی تھا۔ وہ اپنی مخصوص فلسفیانہ فکر کی بنیاد پر ایک نئے مکتب فکر کے بانی قرار پائے اور بعد میں اس فکر کے حامیوں کی تعداد بڑھتی گئی[1]۔

ان کی خود نوشت کا اسلوب تحلیلی اور تفسیری ہے۔ مقالہ نگاری میں ان کو مہارت حاصل تھی۔ یہ اسلوب اسی مقالہ نگاری کیلئے مخصوص ہے۔ خواہ یہ مقالہ نگاری سیاسی نوعیت کی ہو یا معاشرتی اور فلسفیانہ اور ادبی نوعیت کی ہو۔ ان کی مقالہ نگاری زیادہ تر سیاسی میدان سے متعلق رہی۔ انہوں نے اس مقالہ کی تحلیلی اسلوب کے ذریعہ اپنی زندگی کے مختلف مراحل اور اپنی شخصیت کے مختلف گوشے پیش کر دیئے ہیں۔ فکر وفلسفہ اور قانون وغیرہ سے زیادہ قریب ہونے کی وجہ سے ان کے مزاج ہی میں تحلیلی اسلوب غالب آگیا تھا۔ یہ انکی زندگی، شخصیت، بیشتر

---

[1] مصطفی الشہابی، مجلۃ مجمع اللغۃ العربیۃ بدمشق اپریل ۱۹۶۳ء

افکار اور حادثات و موقف کی تعبیر کا واحد ذریعہ تھا۔ اس کے ذریعہ انہوں نے دفاع کا کام بھی لیا ہے۔ اور اقدام کا بھی۔ تفسیر و توضیح اور اظہار برائت وغیرہ بھی اس اسلوب سے ہوئی ہے[1]۔

ان کا اسلوب رفت، وضاحت، اصالت، فصیح الفاظ اور محدود معنی پر توجہ، مترادفات سے لبریز اور تکرار و استطراد سے اجتناب کی وجہ سے ممتاز ہے۔ چونکہ ان کی شخصیت بے حد منطقی، فلسفیانہ اور باریک بین تھی اور انہیں لغت وغیرہ سے بڑی دلچسپی تھی۔ اسلئے ان تمام چیزوں کا اثر ان کی خود نوشت پر بالکل نمایاں ہے[2]۔ کیونکہ کسی تحریر کے اسلوب کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے لکھنے والے کی شخصیت کا ترجمان اور عکاس ہوتا۔ اپنے مخصوص مزاج ہی کی وجہ سے وہ انتہائی نرم اور سرد انداز میں علمی مباحث میں حصہ لیتے تھے۔ کہیں کوئی جھنجلاہٹ اور خفگی کے آثار نظر نہیں آتی۔ ان کا طرز تحریر یہ ہے کہ وہ ایک کے بعد دوسری دلیل دیتے ہوئے آخیر میں محکم نتیجہ نکالتے ہیں۔ دلائل اور براہین بڑے محکم اور وزنی ہوتے ہیں۔ دوران گفتگو وہ حتی الامکان اپنے خواطر، جذبات اور معلومات وغیرہ سے بالکل الگ ہو جاتے ہیں۔ اسیطرح ان کے یہاں جذبات کی حرارت نہیں پائی جاتی۔ اسکی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنی مخصوص شخصی خوبیوں کی بنا پر معروضی طرز تحریر کے بیحد حریص تھے۔ وہ عقلی اور منطقی قیاس پر اکثر اعتماد کرتے تھے۔ دیگر خوبیوں کے علاوہ ان کے اسلوب میں کہیں غیر سنجیدگی، سطحیت اور گھٹیا پن نظر نہیں آتا۔ یہ بھی ان کی شخصیت کا ایک نمایاں وصف تھا۔ اس کے علاوہ بھی جو انکی شخصیت کے

---

[1] یوسف کوتن، اعلام الشعر والنثر فی العصر العربی الحدیث، ص ۶ دار حافظة مدراس ۱۹۸۲ء

[2] عبد اللطیف حمزہ، ادب المقالة الصحفیة فی مصر ج ۶ ص ۱۹۷۔

اہم گوشے ہیں وہ سب ان کے اسلوب میں نظر آتے ہیں[1]۔

ادبی اعتبار سے گرچہ اس خود نوشت سوانح عمری کو کوئی اہم مقام نہیں دیا جا سکتا لیکن فکری اعتبار سے یہ ایک گرانقدر اور اثر انگیز تالیف ہے۔ کیونکہ اس میں مصر کی سیاسی اور فکری تاریخ کے ایک مرحلہ کی تصویر پیش کی گئی ہے۔ یہ مرحلہ نصف صدی سے زائد عرصہ پر مشتمل ہے۔ گرچہ انہوں نے اس زمانہ کی تاریخ لکھتے ہوئے زیادہ تر اپنے افکار، خیالات اور کردار کی وضاحت کی ہے۔ لیکن ظاہر ہے اس میں دوسروں سے متعلق بہت سی تفصیلات آگئی ہیں۔ پھر مؤلف چونکہ ایک سرگرم سیاسی زندگی گذار چکے تھے۔ اسلئے اگر وہ اپنی ذات ہی پر اکتفا کرتے تو بھی بہت سے لائق توجہ امور زیر بحث آجاتے اور ان کی مدد سے پورے دور پر اہم اور مفید ذخیرۂ معلومات میسر آجاتا۔

اس خود نوشت سوانح حیات کے بارے میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ یہ مختلف مقالات کا مجموعہ ہے۔ ان مقالات کی تعداد کل پندرہ ہے۔ اس کے مصنف نے ہر مقالہ کو "فصل" کی سرخی دے کر ایک دوسرے سے الگ کیا ہے۔ ان فصلوں کے مابین کوئی بہت مضبوط رابطہ نہیں ہے۔ بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ ان میں نظم یگانگت اور ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوئی بہت شعوری کوشش مفقود نظر آرہی ہے۔ اگر نظم و مطابقت کے نام سے کوئی کوشش ہے تو صرف یہ ہے کہ مختلف مراحل حیات کو بیان کرنے میں زمنی تدریج اور انتقالی ترتیب کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں اس کے مصنف نے صرف اپنی یادداشت ہی پر اعتماد نہیں کیا ہے۔ بلکہ زمان مکان کے عناصر

---

[1] طہٰ حسین، حدیث الاربعاء ج ۳ ص ۵۰، دار المعارف مصر ۱۹۵۷ء

اور شخصیات کے ماحول کی وضاحت بھی کر دی ہے۔ جن شخصیات کا خاص طور سے اس میں تذکرہ کیا ہے اس میں جمال الدین افغانی" اور فتحی زغلول ہیں۔ ان کے علاوہ انہوں نے اپنے بعض دوستوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ مثلاً عبدالعزیز فہمی اور اسماعیل صدقی۔[1]

اس خود نوشت میں ربط اور استحکام کا جو فقدان ہے وہ اپنی جگہ پر ہے۔ لیکن اسکی وجہ سے مؤلف کی زندگی کے بارے میں کوئی پیچیدگی اور اشتباہ پیدا نہیں ہوتا۔ بچپن سے لے کر بڑھاپے تک ہر مرحلۂ حیات بالکل واضح اور صاف ہے۔ خاص طور سے ان کی تعلیم اور ثقافت کے بارے میں بہت زیادہ تفصیلات اس کتاب میں موجود ہیں۔ مؤلف نے یہ صراحت سے لکھا ہے کہ انہیں بچپن سے اپنی تربیت کا خیال تھا۔ چنانچہ وہ ثانوی تعلیم کے دوران ہی کی کتاب "اُصل الانواع" کا مطالعہ کر چکے تھے۔ اسی طرح انہیں اسکول کی زندگی کے ابتدائی مرحلہ ہی میں بہت سے مشہور شعراء کے اشعار زبانی یاد ہو گئے تھے۔ اس مرحلہ میں فقہ اور شریعت سے ان کی دلچسپی کا اندازہ ان کے اس بیان سے کیا جا سکتا ہے کہ وہ اور ان کے بعض ساتھیوں نے "مجلۃ التشریع" کا اجراء اپنے زمانۂ طالب علمی ہی میں کیا تھا۔ فقہ میں اس دلچسپی کا سہرا فی الواقع شیخ محمد عبدہ، شیخ حسونہ نوادی اور شیخ حسن قدیل کے سر جاتا ہے۔[2]

جدید خود نوشت سوانح عمریوں میں جو نمایاں اوصاف پائے جاتے ہیں اور جن کی وجہ سے یہ سوانح عمریاں قدیم عربی خود نوشت سوانح عمریوں سے ممتاز قرار پاتی ہیں۔ (مثلاً ماحول اور وراثت کے اثرات کا بیان، عہدِ طفولیت

---

[1] احمد لطفی السید، قصۃ حیاتی ص ۳۵ – ۴۲۔

[2] ایضاً ص ۲۴ – ۲۵

کی تصویر کشی، اسلوب کی شخصیت سے ہم آہنگی، کشمکش کی وضاحت، صداقت، جرأت اور معروضیت وغیرہ[1]) ان میں سے بیشتر اوصاف اس خود نوشت میں بھی پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے بعض کی وضاحت اس سے پہلے آچکی ہے۔ البتہ بعض کی وضاحت ذیل کی سطور میں کی جارہی ہے۔

ماحول اور وراثت کے اثرات میں سے انہوں نے ماحول کے اثرات بڑی تفصیل سے تصویر کھینچی ہے۔ ان کو اعتراف ہے کہ ان کی فکری اور عقلی ترقی اور بلندی میں ان کے ماحول کا بے حد اثر ہے۔ وہ جہاں اور جس ماحول میں گئے وہاں سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ یہ عمل کبھی خاموشی سے انجام پاتا تھا۔ اور کبھی اطلاع اور اعلان کے ساتھ، اور اس کیلئے صرف موافقت کی شرط نہیں تھی۔ بلکہ ماحول کی مخالفت اور محاذ آرائی کرکے بھی اس سے استفادہ کیا۔ جب معاشرے میں رائج افکار انکی راہ میں رکاوٹ بنے تو انہوں نے انکی کنہ و حقیقت معلوم کرنے اور اپنی علمی و عقلی صلاحیتوں سے انہیں جانچنے پرکھنے کی کوشش کی اور بحث و تجزیہ کے بعد جامع اور سلجھی رائے دی۔ ان کی شخصیت پر ماحول کے اثرات کا جائزہ لینے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں معاملہ دو طرفہ تھا۔ کبھی وہ ماحول سے لیتے تھے اور کبھی دیتے تھے۔

لیکن ماحول کے برخلاف انہوں نے وراثت کے اثرات بیان کرنے سے گریز کیا ہے۔ یعنی ماں باپ اور دوسرے موروثی ذرائع سے انہیں جو خوبیاں اور کمزوریاں ورثے میں ملی ہیں۔ ان کا کوئی تذکرہ انہوں نے نہیں کیا ہے۔ ان کے علاوہ دوسرے خود نوشت نگاروں نے (مثلاً احمد امین اور عباس محمود العقاد)

---

[1] احسان عباس، فن السیرۃ ص ۱۰۷ – ۱۲۳۔

اس کا تفصیل سے ذکر کیا ہے[1] - غالباً اسکی وجہ یہ ہو کہ یہ اپنی عقلی اور فکری صلاحیتوں کو اپنی ذاتی کاوشوں اور محنتوں کا ثمرہ سمجھتے ہوں - اور چونکہ عقل و فکر کا یہ پہلوان کے مزاج پر اسقدر غالب ہے کہ انہیں اپنی دوسری خوبیاں، جن میں کچھ موروثی بھی ہو سکتی ہیں، قابلِ ذکر نہ معلوم ہوتی ہیں -

اسیطرح انہوں نے مختلف حادثات و واقعات کے تحت نفس کے اندر برپا ہونے والی کشمکش اور ہلچل کے تذکرہ سے بھی بچنے کی کوشش کی ہے - اسکی وجہ سے یہ معلوم نہیں ہو پاتا کہ کس خاص واقعہ یا سانحہ کا ان کے قلب و ذہن پر کیا خاص اثر مرتب ہوا ہے - نفسیاتی مطالعہ کے جدید علوم کی روشنی میں جو اہمیت ہو گئی ہے اس کے باعث اس پہلو کے تشنہ رہ جانے کی وجہ سے بڑا خلا معلوم ہوتا ہے - لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ انہوں نے خارجی تصادم کو بھی نظر انداز کر دیا ہے - نہیں ! بلکہ انہوں نے اسکی مختلف انواع و اقسام کا احاطہ کیا ہے - چونکہ انہیں اپنے مخصوص افکار و خیالات کی بنا پر لوگوں کے شدید ردِ عمل کا سامنا کرنا پڑا تھا اسلئے اس خارجی کشمکش کی تصویر کشی فطری امر تھا - غالباً اسی کشمکش کے غلبہ کی وجہ سے داخلی کشمکش کا عنصر نظر انداز ہو گیا - تاہم داخلی امور اور خارجی تصادم کی وضاحت کے اپنے الگ الگ فوائد ہیں - داخلی تصادم کی تصویر کشی سے انشاء پرداز کے ساتھ عملی مشارکت پر ہوتی ہے اور اسکی قلبی اور نفسیاتی کیفیات سے واقفیت کے بعد قارئین کے احساس و شعور میں حرکت پیدا ہوتی ہے - لطفی السید سیاست، معاشرت اور فکر سے متعلق جن اچھوتے اور نادر خیالات کے مالک

---

[1] احمد امین، حیاتی ص ۱۱ ، عباس محمود العقاد، أنا ص ۱۱-۵۱ .

تھے اور آئے دن جو تبدیلیاں اور تغیرات آتے رہتے تھے - ان کی وجہ سے ان کا نفس مختلف نوعیت کی اتھل پتھل سے دوچار ہوا ہوگا اور ان کے نفس پر اس کے اثرات مرتب ہوئے ہونگے - لیکن ہم ان کی واقفیت سے محروم رہ گئے - شاید مرور ایام طوالت زمانی کے سبب لطفی السید کو وہ احساسات یاد نہ رہ گئے ہوں - اور ان کو دوبارہ سطح دماغ پر لانا مشکل بھی ہو گیا ہو - اسکی وجہ سے انہوں نے صرف ان حالات واقعات اور حادثات کی فہرست پیش کی ہے اور وہ بھی اس قدر عجلت میں کہ ان واقعات کے ان کے نفس پر پڑنے والے اثرات بالکل اوجھل ہو گئے -

انکی خود نوشت سوانح عمری سے ایسی بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں - جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے بعض ایسے واقعات کی صرف خارجی کشمکش کی تصویر پر اکتفا کیا ہے جن کے بارے میں اگر وہ چاہتے تو ان کی وجہ سے اپنی قلبی کیفیات اور اندرونی کشمکش کی وضاحت بھی کر سکتے تھے - اس کی ایک بہترین مثال اخبار "الجریدۃ" کا اجراء ہے - دسمبر ۱۹۰۷ء میں "حزب الامۃ"[1] کی تشکیل کے بعد ان کے اور ان کے بعض ساتھیوں کے ذریعہ جو مطالبات بہت زور دیکر پیش کئے گئے تھے - ان میں مکمل آزادی اور دستور کے نفاذ کا مسئلہ سرفہرست تھا - مکمل آزادی کے موقع پر خاص طور سے بڑی بحث اور معرکہ آرائی ہوئی - ان کے اوپر یہ الزام تھا کہ وہ امت کی مجموعی رائے - جو خلافت عثمانیہ کے تحت رہنے پر راضی تھی کے خلاف آواز اٹھا رہے ہیں - لطفی اس پورے مسئلہ کو بیان کر جاتے ہیں - لیکن وہ صرف اس کے خارجی پہلوؤں کی تصویر کشی پر اکتفا کرتے ہیں - وہ یہ بالکل نہیں بتاتے

---

[1] حزب الامۃ کیلئے ملاحظہ ہو. أدب المقالۃ الصحفیۃ فی مصر، عبد اللطیف حمزۃ ص ۵۱ - ۶۱ اور مذکرات محمد حسین ہیکل ج ۱ ص ۳۱ - ۴۵ .

کہ ان مقالات اور الزامات کا ان کے نفس پر کیا اثر پڑا؟ وہ کس طرح کے جذبات، رنج و الم سے دوچار ہوئے۔ اور ان کے نفس کی اندرونی دنیا کس اتھل پتھل سے دوچار تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی خود نوشت لکھتے وقت خالص معروضی انداز ہی اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اسمیں اپنے ذاتی احساس اور انطباع کو شامل کر کے اپنی غیر جانبدارانہ پوزیشن کو مجروح نہیں کرنا چاہتے ہیں۔ اس طرح سے ان کی خود نوشت میں مذکور حادثات و واقعات بغیر کسی آمیزش کے اپنی اصلی شکل میں لوگوں کے سامنے آگئے ہیں۔

اس خود نوشت سوانح حیات میں اندرونی کشمکش کے مذکور نہ ہونے کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ اسمیں ذاتی احساسات اور طبعی میلانات کی کمی ہوتی۔ پھر چونکہ ذاتی احساسات کے ساتھ آدمی کے جذبات کی گرم جوشی بھی شامل ہو جاتی ہے۔ یہ انسانی جذبات کچھ فرق اور امتیاز کے ساتھ ہر آدمی میں یکساں طور سے موجود ہوتے ہیں۔ اسلئے ان کی تعبیر و تشریح کی شکل میں دوسروں کی شرکت اور مطابقت کا امکان بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ چونکہ اس خود نوشت میں اسطرح کی کوئی بات نہیں ہے۔ اسلئے قارئین کی اس سے جذباتی ہم آہنگی پیدا نہیں ہو پاتی۔ اس کے مصنف نے حد سے زیادہ اپنے آپ معروضیت کا جو پابند بنایا ہے۔ اسکی وجہ بظاہر یہ سمجھ میں آتی ہے کہ وہ ذاتی طور سے اپنے اندر کوئی ایسی انفرادیت اور امتیاز نہیں پاتے تھے جسکے باعث وہ اپنے ذاتی احساسات کو اسقدر اہمیت دیں کہ انہیں الگ سے بیان کریں۔ یہ ان کی انکساری اور خاکساری کی دلیل ہے۔

معروضیت اور غیر جانبداری کی طرح تواضع اور انکساری بھی ان کی خود نوشت کا ایک نمایاں وصف ہے۔ اس کی وجہ سے وہ انسانوں کے اندر موجود اس طبعی میلان پر غلبہ پا جاتے ہیں جو فخر و غرور اور تعلی کا سبب بنتا ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ایسی خوبیاں بہت وافر مقدار میں دی تھیں جن پر وہ دوسرے خود نوشت نگاروں کی طرح فخر کر سکتے تھے۔ اس معاملہ میں ان کی احتیاط کا عالم یہ تھا کہ کبھی کبھی وہ ضروری مقامات پر بھی اپنی خوبیوں کے بیان کرنے سے گریز کرتے تھے۔ اور محض اشارے میں بات کہہ دیتے تھے۔ چنانچہ جب وہ اپنے بچپن کا تذکرہ کرتے ہیں تو اسے ایک عام بچپن بتا کر گذر جاتے ہیں۔ اسمیں انہیں ذکاوت اور نجابت کا کوئی اثر دکھائی نہیں دیتا۔ حالانکہ اگر وہ چاہتے تو صرف دس سال کی عمر میں قرآن مجید ختم کرنے پر فخر و مباہاۃ کا اظہار کر سکتے تھے۔ یہ عمر کے لحاظ سے ان کا ایک بڑا کارنامہ تھا۔ لیکن ظاہر ہے کہ ان کے مخصوص معروضی اور متواضع انداز بیان نے انہیں اسکی اجازت نہیں دی۔ اس کے برعکس انہیں یہ وضاحت کرنے کی جرأت اور ہمت دیتا ہے کہ وہ ثانوی درجات میں متوسط طالب علم تھے۔

"میں نہ تو بہت آگے تھا اور نہ ہی بہت پیچھے تھا۔"[1]

بس یہ ایک حقیقت ہے کہ ہم ان کی خود نوشت سوانح حیات میں فخر و مباہاۃ کا ادنیٰ شائبہ بھی نہیں پاتے۔ یہاں تک کہ وہ ایسے مقام پر بھی فخر و غرور سے اجتناب کرتے ہیں جہاں اگر وہ کرتے تو اسے عیب نہیں سمجھا جاتا۔ مصری تاریخ میں انکے نمایاں مقام کی وجہ سے انہیں "استاذ الجیل" کا لقب دیا گیا۔ اس تعلق سے وہ اپنے بعض

---

[1] احمد لطفی السید، قصۃ حیاتی ص ۲۵۔

کارناموں اور اوصاف پر فخر کر سکتے تھے۔

صداقت، معروضیت، غیر جانبداری کا یہ انداز بیان انہوں نے اپنے بارے ہی میں اختیار نہیں کیا بلکہ اپنے علاوہ دوسروں کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے بھی ان کا طرز عمل یہی رہا۔ حتیٰ کہ وہ لوگ جن سے ان کے سیاسی، سماجی اور فکری امور و معاملات میں شدید اختلافات تھے، ان کی تحریروں میں کسی طرح کی بے جا تنقید یا تنقیص کے نشانہ نہیں بنے۔ بلکہ اس کے برعکس انہوں نے ان کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کے عمدہ اوصاف اور خصائل کی نشاندہی کی اور ان کی بہترین خدمات کو خراج تحسین پیش کیا۔ اس سلسلہ میں علی باشا اور مصطفیٰ کامل کے نام بطور مثال پیش کئے جا سکتے ہیں[1]۔ اسکی تفصیل پیچھے گذر چکی ہے کہ انہوں نے اس کا تعارف کس قدر سلجھے اور محتاط انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کے اس انداز سے ان کے بعض رفقاء اور تلامذہ مطمئن نہیں ہوئے وہ چاہتے تھے کہ یہ اپنے دل کی پوری بھڑاس نکال دیں۔ چنانچہ محمد حسین ھیکل نے مصطفیٰ کامل کے بارے میں ان کی اس تجویز پر کہ ان کی یاد میں ایک مجسمہ تعمیر کرا دیا جائے اپنے ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے۔

> "لطفی السید کا یہ موقف ان کے ان نظریات کے منافی ہے جن کی طرف وہ ہمیشہ سے دعوت دیتے رہے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ لطفی السید کا یہ موقف اس بات کی علامت ہے کہ وہ اپنے خوش نفسانی اور گروہ بندی سے ماورا تھے۔ اس سے معاصرین کے ساتھ

---

[1] احمد لطفی السید، قصۃ حیاتی ص ۹۷ - ۱۰۲

ان کی منصفانہ رائے اور مبنی برحق موقف کا بھی پتہ چلتا ہے۔ خواہ یہ معاصرین ان کے تحت مخالفت کیوں نہ ہوں؟"[1]

اس خود نوشت سوانح عمری کی ایک خاص خوبی یہ ہے کہ اس میں بعض ایسے حقائق سے پردہ اٹھایا گیا ہے۔ جس سے لوگ واقف نہیں تھے۔ یا اگر واقف تھے تو ان سے متعلق تمام گوشے واضح نہیں تھے۔ اس کے مصنف نے انتہائی جرأت اور لوگوں کے قیل و قال سے بے پرواہ ہو کر تمام باتیں واضح کر دیں۔ مثلاً انہوں نے صاف طور سے یہ لکھا ہے کہ مصری لڑکیاں حکومت اور عوام کی علم جانکاری میں جامعہ میں تعلیم حاصل کر رہی تھیں۔ یہ سلسلہ دس سالوں تک جاری رہا لیکن اخبار و جرائد وغیرہ میں ان کا کوئی ذکر نہیں ہوا۔ اور نہ ہی اس پر کوئی ہنگامہ ہوا۔ جب دس سال کے بعد لوگوں کو مخلوط تعلیم کا علم ہوا تو انہوں نے اس پر شدید احتجاج کیا۔ لیکن اس کی کوئی پرواہ نہیں کی گئی کیونکہ یونیورسٹی انتظامیہ پر یہ بات واضح تھی کہ اجتماعی ترقی اس کے بغیر ممکن نہیں اور یہ عدل و انصاف کے نقطۂ نظر سے ہر فرد کو خواہ وہ مرد ہو یا عورت، ارتقاء کے یکساں ذرائع حاصل ہونے چاہئے۔ پھر پوری قوم کا مفاد اس سے وابستہ تھا کہ اپنی خواہش و توقعات کی تکمیل میں ہر شخص زیادہ سے زیادہ جدید وسائل اور سہولیات سے آراستہ ہو۔ چنانچہ ان اسباب کی بنا پر لوگوں کے اعتراض کی کوئی خاص اہمیت نہیں دی گئی اور وہ خود رفع دفع ہو گیا۔[2]

اس صاف گوئی اور جرأت کی ایک دوسری مثال وہ انکشاف ہے جو انہوں نے قاسم امین کی کتاب "تحریر المرأۃ" کے بارے میں کیا۔ انہوں نے اس کتاب

---

[1] محمد حسین ہیکل، مذکرات ج ۱ ص ۳۳۔

[2] احمد لطفی السید، قصۃ حیاتی ص ۱۹۱۔

کے کچھ حصے جنیوا میں قیام کے دوران شیخ محمد عبدہ اور سعد زغلول کی موجودگی میں قاسم امین کی زبانی سنے تھے۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ شیخ محمد عبدہ نے مسلمات کے بعد ان مباحث پر کوئی اعتراض نہیں کیا جو بعد میں بہت زیادہ تنازع کا باعث بنے۔ اس سے انہوں نے ایک ایسی حقیقت کی وضاحت کر دی جس سے اکثر لوگ تعرض نہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انہوں نے یہ حقیقت واضح الفاظ میں تو نہیں البتہ اشاروں میں واضح کی ہے۔ لیکن اس طور سے کہ اس کا سمجھنا قارئین کیلئے دشوار نہ ہو۔

احمد لطفی السید کی یہ کتاب ان کی وفات سے کچھ دنوں پہلے منظر عام پر آئی۔ آپ کی طرف ان کی عظیم خدمات اور ان کے افکار کے دوررس اثرات ہیں اور دوسری طرف اپنی زندگی سے متعلق کتاب کی اشاعت میں اسقدر تاخیر۔ اس سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ شہرت اور خود نمائی سے بہت دور تھے۔ لطفی السید کی سیرت سے جو لوگ واقف ہیں وہ یہ بھی طرح جانتے ہیں کہ اس صدی کی ابتداء میں مصری قوم کی رہنمائی و قیادت و تعلیم و تربیت اور تعمیر و تشکیل میں ان کا مجدد نمایاں رول تھا۔ انہوں نے مصریوں کو خود اعتمادی اور خودداری کی تعلیم دی۔ انہیں ترقی کے لئے ضروری اصول و ضوابط سے واقفیت بہم پہنچائی۔ ان کو تعلیم و تربیت خصوصی دلچسپی تھی۔ وہ مصری یونیورسٹی کے قیام میں پیش پیش تھے۔ وہ آپ طویل عرصہ تک اس کے وائس چانسلر بھی رہے۔ ان کے شاگردوں اور عقیدتمندوں کا حلقہ بیحد وسیع ہے۔ بیسویں صدی کے تمام عرب ادباء، ناقدین اور مفکرین ان کی عظمت شان اور قدر و منزلت کے معترف ہیں۔ انہیں متفقہ طور سے اس صدی کے مربی، استاذ اور معلم کے لقب سے نوازا گیا۔ ظاہر ہے جس کا یہ مقام و مرتبہ ہو اس کے بارے میں عوام و خواص کی تلاش و جستجو ایک فطری بات ہے۔ اور بلاشبہ اس کا اظہار ان کے سامنے کیا جاتا رہا ہوگا۔ لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنی شخصیت کو نمایاں کرنے سے کلیتہً اجتناب کیا۔ اور پھر آخری عمر میں لوگوں کے مطالبہ پر توجہ بھی دی تو حتی الامکان اپنے ذاتی مسائل سے گریز کرتے ہوئے عمومی مسائل پر زیادہ توجہ صرف کی۔

هزہ حیاتی

عبدالعزیز فہمی

عبدالعزیز فہمی جدید مصر کی تاریخ میں ایک نمایاں اور ممتاز حیثیت کے مالک فرد تھے۔ ان کے اعمال، اخلاق اور کردار سے عظمت، بلندی اور مردانگی کا بہترین مظاہرہ ہوتا تھا۔ وہ مصری وکلاء اور سیاست دانوں کے درمیان اپنی صداقت، صاف گوئی، خودداری اور بیداری نیز اپنی گہرائی گیرائی تدبر اور معاملہ فہمی کی وجہ سے اپنی ایک علیحدہ شناخت رکھتے تھے۔ وہ جدید مصری تہذیب و ثقافت کے نمائندہ تھے۔ وہ طبیعتاً آزاد خیال تھے۔ قدرت نے انھیں بہترین صلاحیتوں سے نوازا تھا[1] علم و فن میں تبحر اور کمال نے انھیں انسانیت کی اعلیٰ معراج تک پہنچا دیا تھا۔ ان کی پرورش و پرداخت اور نشو و نما میں ان کے گھریلو ماحول، تعلیمی اداروں اور ذہنی کاوشوں کا خصوصی دخل رہا ہے۔ یہ عوامل گرچہ دوسرے لوگوں کی شخصی تعمیر و تشکیل میں بھی کارفرما رہے ہیں۔ لیکن ان کی بات ہی کچھ اور تھی۔ یہ اپنی فقہی اور سیاسی بصیرت، زبان و بیان پر قدرت، طرز استدلال اور طرز تحریر میں بلاشبہ اپنے معاصرین سے مشابہ تھے۔ لیکن اپنی اعلیٰ اخلاقی اقدار اور صفات میں سب سے یکہ و تنہا تھے۔ چاپلوسی، منافقت مکر و فریب، تدلیس و تلبیس اور کذب و افتراء سے وہ حد سے زیادہ متنفر تھے۔ اپنے افکار و خیالات کی برمحل اور صحیح وضاحت سے وہ ایک لمحہ کیلئے غافل نہیں ہوتے تھے۔ ان صفات نے انھیں ایک عظیم معلم بنا دیا۔ وہ کسی ایک میدان کے نہیں بلکہ مختلف میدانوں کے سپہ سالار تھے۔ وکالت، قضاء، فقہ، تشریع اور شوریٰ الغرض ہر کام میں ان کی فائقانہ شان نمایاں ہے۔ وہ اپنی تمام عقلی و فکری اور قانونی صلاحیتوں کے ساتھ میدان سیاست میں داخل ہوئے تھے۔ اس لئے ہمیشہ

---

[1] احمد حسن زیات ـــــ وحی الرسالۃ ص ۱۱ مکتبۃ النھضۃ المصریۃ القاھرۃ ۱۹۵۵م

عوامی فلاح و بہبود اور ملکی ترقی کیلئے کوشاں رہے۔[1] ۱۹۵۱ء میں ان کی اس دار فانی سے رحلت صرف مصر کیلئے نہیں بلکہ پوری انسانیت کیلئے ایک عظیم خسارہ ثابت ہوئی۔[2] عصر حاضر کی معروف علمی، ادبی، اور سماجی شخصیات کی طرح انھوں نے بھی اپنی خود نوشت سوانح تحریر کی ہے۔ اس کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی پیدائش "منوفیہ" ضلع کے ایک گاؤں "کفر المصلحۃ" میں ۲۳ دسمبر ۱۸۷۰ء کو ہوئی۔ ان کا خاندان مصر کے چند ممتاز دیہی خاندان میں سے ایک تھا۔ جہاں زراعت اور تعلیم دونوں پر یکساں توجہ دی جاتی تھی۔ اس خاندان کے لوگ بالعموم کھیتی باڑی کرتے تھے یا تعلیم حاصل کرتے تھے۔[3] حصول علم کے بعد یہ لوگ سرکاری نوکریوں کیلئے کوشش کرتے تھے۔ ایسے باشعور اور با اثر گھرانے میں ان کی پرورش ہوئی۔ چنانچہ ابتدا ہی سے ان کی مناسب تعلیم و تربیت کا خیال رکھا گیا۔ ان کی تعلیم کا آغاز گاؤں کے مکتب سے ہوا جہاں انھوں نے قرآن مجید حفظ کیا۔ پھر کی "جامع احمد" میں بھی کچھ دنوں زیر تعلیم رہے۔ اس کے بعد جامعہ ازہر میں داخلہ لے لیا۔ یہاں قرآن مجید کی تجوید کے علاوہ "الفیۃ بن مالک" اور مقامات حریری وغیرہ زبانی یاد کیا۔ پھر اس کے بعد جمالیہ پرائمری اسکول اور خدیویہ سکنڈری اسکول میں عصری تعلیم حاصل کی۔ یہیں ان کا تعارف احمد لطفی السید سے ہوا جو ہمیشہ کیلئے ایک گہری دوستی میں تبدیل ہو گیا۔ اس اسکول میں تعلیم کے دوران انھیں فرانسیسی زبان سیکھنے کی خواہش ہوئی۔ کیونکہ اس کے بغیر "مدرسۃ الحقوق" لا کالج میں داخلہ ممکن نہیں تھا۔ کافی محنت اور جد و جہد کے بعد ان کی یہ خواہش پوری ہوئی اور اسطرح "مدرسۃ الحقوق" میں داخلے کی سبیل پیدا ہوئی۔ ان دنوں اس کالج کا نام "مدرسۃ الادارۃ الموحدۃ" تھا۔[4]

تعلیم سے فراغت کے بعد انھوں نے وکالت کا پیشہ اختیار کر لیا۔

---

[1] احمد حسن زیات — وحی الرسالہ ص ۱۲ ، [2] ایضاً ص ۶۲ [3] ھنڈیاتی ص ۳۰-۳۲
[4] ایضاً ص ۳۰-۳۵ ،

اپنی صلاحیت اور لیاقت کی بنیاد پر وہ اپنے پیشے میں بہت جلد معروف و مقبول ہو گئے۔ عام وکلاء سے ہٹ کر انھوں نے اس پیشے کو کچھ اصول و ضوابط اور اخلاقیات کا پابند بنایا اور ان پر سختی سے کاربند رہے۔ کیونکہ وہ اپنے مزاج کے اعتبار سے اصلاح پسند واقع ہوئے تھے اس لئے وہ جس جگہ بھی رہے برائیوں کے قلع قمع کرنے اور صالح روایات کے فروغ دینے میں مصروف رہے۔ زمانہ وکالت کے دوران ان کی یہ شدید خواہش تھی کہ ان کی طرح دوسرے وکلاء بھی صرف حق بات کا ساتھ دیں اور کسی مالی منفعت کی طرف توجہ نہ دیں۔ اپنے بارے میں ان کا وطیرہ یہی تھا۔ وہ مقدمات پیش کرنے والوں کی طرف سے کوئی پیشگی شرط قبول نہیں کرتے تھے اور نہ ہی ان کے بنائے ہوئے کسی لائحہ عمل کے مطابق ان کا دفاع کرتے تھے۔ ظاہر ہے اگر وہ ایسا کرتے تو دوسرے وکلاء کی طرح ایک حقیر سی رقم ان کو اور مل جایا کرتی۔ لیکن ان کا معاملہ یہ تھا کہ وہ ہمیشہ مقدمات کی پیروی کے وقت اس اصول پر زور دیتے تھے "اخلاقیات، معدیات سے بہتر ہے" اور یہ بھی کہ دنیا میں کچھ چیزیں ایسی باقی رہیں گی جنھیں خریدا نہیں جا سکتا۔ اس وجہ سے جب انھیں معلوم ہو جاتا کہ ایک فریق حق پر ہے اور اس پر ظلم ہوا ہے تو وہ اس کے دفاع کیلئے آگے بڑھتے تھے اور اگر ضرورت ہوتی تو اس کے عوض کوئی اجرت بھی نہیں لیتے تھے۔[1]

وکالت کے دوران انھوں نے بعض قاضیوں کی اصلاح کا بیڑہ بھی اٹھایا۔ اس وقت ایسے بہت سے قاضی تھے جو وکلاء کے بحث و مباحثہ پر اکتاہٹ اور ترش روی کا اظہار کرتے تھے اور اس طرح ان وکلاء کو بلاوجہ کے اختصار پر مجبور کرتے تھے۔ عبدالعزیز فہمی نے اس پر روک لگانی چاہی چنانچہ ایسے مواقع پر وہ بالکل خاموشی اختیار کر لیتے تھے۔ ادھر ایک میں حصہ نہیں لیتے تھے۔ وہ ایک مرتبہ ایک انگریز قاضی "بوند" کے سامنے کسی مقدمے کی پیروی کر رہے تھے کہ وہ اپنی عادت کے مطابق جھنجلاہٹ

---

[1] عبدالعزیز فہمی ـــــ ھذہ حیاتی ص ۳۵-۳۰

کا اظہار کرنے لگا۔ انھوں نے اسے اپنے مذکورہ طریقہ کار سے مجبور کیا کہ وہ آئندہ سے ہر بحث غور سے سنے اور بیچ میں بات نہ کاٹے۔ اور نہ ہی ناپسندیدگی کا اظہار کرے[1]۔

مقدمات میں حق بات کی تائید اور اسکی طرفداری کی ایک بہترین مثال وہ مقدمہ ہے جسے سلطان حسین کامل نے اپنے اثر و رسوخ اور مال و دولت کے زور پر اپنے حق میں فیصلہ کرانا چاہا یہ مقدمہ ایک زمین سے متعلق تھا اور وہ اس کی پیروی کر رہے تھے۔ سلطان حسین کامل نے ان کو بھی خریدنا چاہا۔ انھوں نے صاف صاف انکار کر دیا اور یہ جواب دیا "اے بادشاہ سلامت! آپ نے مجھے بلاوجہ کی مشکل سے دوچار کر دیا۔ میں تو خود اس قضیے کے پس پیو سے واقف ہوں[2]"

وکالت کے دوران انھوں نے صرف اپنے پیشے ہی سے تعلق نہیں رکھا بلکہ اس کے علاوہ دوسرے سیاسی اور سماجی نوعیت کے کام بھی انجام دیتے رہے۔ مثلاً ۱۸۹۶ء میں انھوں نے اپنے دوست لطفی السید کے ساتھ مل کر برطانوی استعمار سے نجات دلانے کیلئے ایک خفیہ سیاسی جماعت تشکیل دی تھی۔ اس کے علاوہ وہ لطفی السید کے اہم کاموں مثلاً ان کے سوئٹزرلینڈ کے سفر، الجریدہ کا آغاز اور "حزب الامۃ" کی تشکیل میں برابر شریک رہے اور اپنی حیثیت، صلاحیت اور استطاعت کے بقدر حصہ لیتے رہے۔ ۱۹۱۳ء میں جب قانون سازی کے امور و مسائل پر نظر رکھنے اور ان کا مناسب حل تلاش کرنے کیلئے ایک کمیٹی "المجلس التشریعی" کے نام سے تشکیل دی گئی تو انھیں اسکا باضابطہ ممبر بنایا گیا۔ وہ اس میں پوری سرگرمی سے حصہ لیتے رہے۔ اپنی مدلل اور سنجیدہ گفتگو کی وجہ سے ان کی شخصیت وہاں نمایاں اور ابھری ہوئی تھی، وہ ان افکار اور مسائل کے سلسلے میں ہمیشہ پیش پیش رہے جو قوم کی فلاح اور بہبود سے متعلق ہوا کرتے تھے۔ ان کی اس خوبی کی وجہ سے عوام نے انھیں اس کمیٹی میں شامل رہنا ضروری تصور کیا۔

---

[1] عبدالعزیز فہمی — حدیث حیاتی، ص ۵۶-۵۷ ، [2] ایضاً ص ۶۲

چنانچہ جب انھیں ایک بار محکمہ استئناف (سپریم کورٹ) کے صدر بننے کی دعوت دی گئی تو عوام نے انھیں اس دعوت کو قبول نہ کرنے اور اپنی سابقہ ذمہ داریوں کو انجام دینے پر مجبور کیا۔ اس وقت لطفی السید نے اپنے اخبار "الجریدہ" میں "القدوۃ الحسنۃ" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا جس میں انھوں نے عبدالعزیز فہمی کی اصلاحی کوششوں کو خراج تحسین پیش کیا۔ اور انھیں اس بات پر مبارکباد دی کہ انھوں نے عوام کی خواہشات کا خیال رکھا۔ ان کے دوسرے ساتھیوں کے بعض اقوال سے بھی ان اہمیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ مذکورہ کمیٹی کے سکریٹری سعد زغلول نے اس موقع سے یہ کہا تھا "یہ کمیٹی پر بہت بڑا ظلم ہے" یہ بات انھوں نے اس وقت کہی جب انھیں یہ اطلاع ملی کہ عبدالعزیز فہمی کو مذکورہ ذمہ داری کے لئے کمیٹی سے نکالا جا رہا ہے[1]

عبدالعزیز فہمی وکالت کے ساتھ دوسرے امور اور مسائل میں اسی طرح سرگرمی اور دلچسپی کا اظہار کرتے رہے یہاں تک کہ پہلی جنگ عظیم کے بعد ان کی زندگی کا رخ تیزی سے تبدیل ہونے لگا اب وہ قوم کے مسائل میں اور زیادہ سرگرم عمل ہو گئے۔ چنانچہ جنگ کے خاتمہ کے بعد پوری دنیا کی سیاسی اور سماجی صورتحال میں جو تبدیلی اور تغیر آیا جس میں امریکی صدر ولسن کے چودہ نکاتی خاکہ موثر اور اس کے بعد پیرس میں صلح کانفرنس کے انعقاد کی خاص طور سے بڑی اہمیت ہے۔ اس سے کما حقہ فائدہ اٹھانے کیلئے جن مصری رہنماؤں کے ذہن میں ایک وفد کی تشکیل کا خیال پیدا ہوا تھا ان میں سعد زغلول، لطفی السید، علی شعراوی حمد الباسل کے علاوہ عبدالعزیز فہمی کا نام بھی قابل ذکر ہے۔ ستمبر ۱۹۱۸ء میں سعد زغلول، علی شعراوی اور عبدالعزیز فہمی نے مصر میں برطانوی وائسرائے سر رینالڈ ونجت سے ملاقات

---

[1] ایضاً ص ۲۲-۲۳

کی اور اس کے سامنے مصر کی مکمل آزادی کا مطالبہ رکھا۔ بعد میں بھی وفد صلح کانفرنس میں شرکت کے لئے پیرس جانے کی تیاریوں میں مصروف ہو گیا لیکن حکومت نے اس کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کی۔ اس کے ارکان نے عوام سے رابطہ قائم کر کے اپنے خیالات سے انھیں مطلع کیا۔ عوام نے اس پر سخت برہمی اور احتجاج کا اظہار کیا یہی احتجاج بعد میں ایک بغاوت کی شکل اختیار کر گیا۔ حکومت نے اس سے پریشان ہو کر فوراً نرم پالیسیوں کا اعلان کیا۔ لیکن یہ بظاہر بہلاوے کا سامان تھیں۔ عبدالعزیز فہمی نے خاص طور سے ان پالیسیوں کی دھجیاں بکھیر دیں۔ وکلاء اور قانون کے ماہرین کی ایک بڑی تعداد ان کے ساتھ تھی۔ جب عوام کا غصہ کسی طرح ٹھنڈا ہوتا نظر نہیں آیا تو حکومت نے وفد کے چار سرگرم ارکان کو جلاوطن کر دیا۔ ان میں سعد زغلول حمد الباسل۔ اسماعیل صدقی اور محمد محمود شامل تھے۔ اس سے عوام اور زیادہ بھڑک گئے۔ اور بغاوت کی آگ اور زیادہ پھیل گئی۔ برطانوی حکومت نے صورتحال پر قابو پانے کیلئے اپنے موجودہ وائسرائے کو واپس بلا کر ان کی جگہ لارڈ نسبی کو مبادالسرائے بنایا۔ اس سے پہلے یہ مشرق اوسط میں برطانوی فوجوں کے کمانڈر تھے۔ اور فاتح بیت المقدس کی حیثیت سے ان کی شہرت بہت زیادہ عام ہو گئی تھی۔ انھوں نے چارج لینے کے بعد فوراً نرم اور مصالحت آمیز پالیسیوں کا اعلان کیا۔ اور وفد کے جلاوطن اور گرفتار رہا کر کے صلح کانفرنس میں جانے کی اجازت دے دی۔ اس طرح مصریوں کی پہلی سیاسی فتح ہوئی۔ وفد کے باقی ارکان مصر سے روانہ ہو کر جلاوطن ممبران سے مل گئے اور سب لوگ پیرس کی طرف روانہ ہوئے لیکن راستے میں ہی انھیں یہ اطلاع ملی کہ صدر ولسن نے مصر پر برطانیہ کی علمداری اور کنٹرول کو تسلیم کر لیا ہے اس کے باوجود یہ لوگ پیرس پہنچے لیکن وہاں کانفرنس میں شرکت کی کوئی شکل نہ بن سکی۔ یہ

لوگ کچھ دنوں پیرس میں قیام کرکے بعض دوسرے کام انجام دیتے رہے۔ پھر وہاں سے لندن واپس آکر عدلی پاشا کے توسط سے برطانوی حکومت سے براہ راست مذاکرات کیا۔

عبدالعزیز فہمی ان تمام کوششوں میں شریک رہے۔ لیکن جیسا کہ وضاحت آچکی ہے کہ وہ ہر جگہ اپنے اصلاحی خیالات اور افکار کے سختی سے پابند رہے۔ چنانچہ وفد میں بھی شرکت کے دوران جہاں ضرورت محسوس ہوئی اپنے خیالات کا بے لوث اور برملا اظہار کیا۔ پہلی بار جب وہ سعد زغلول اور شعراوی کیساتھ برطانوی وائسرائے سے ملے تھے تو ایک مسئلے پر سعد زغلول سے سخت اختلاف کر بیٹھے تھے۔ اور چونکہ وہ اپنے موقف ہی میں قوم کی فلاح و بہبود مضمر دیکھ رہے تھے اس میں کوئی مصالحت نہیں کر سکے۔ پھر جب یہ وفد یورپ پہنچا تو وہاں بعض معاملات میں ان کے اختلاف اور زیادہ سخت ہو گئے۔ انھوں نے مجبور ہو کر اپنے خیالات عوام کے سامنے پیش کر دیئے اس پر کافی سرگرم بحث و مباحثہ ہوا۔ اور معاملہ یہاں تک پہنچا کہ وفدی اخبارات نے ان کے اوپر حملوں کی بوچھار کر دی۔ وہ اس صورتحال سے بیحد بددل ہو گئے۔ اور سیاست سے علیحدہ ہو گئے۔ وہ نفسیاتی طور سے اس قدر شکستہ کہ انقلاب کے بارے میں گفتگو کرنے یا اس کے لیڈروں کے ساتھ خاص طور سے سعد زغلول کے ساتھ اختلافات کا ذکر کرنے سے قطعاً احتراز کرنے لگے۔[1]

وفد کے مذاکرات، عدلی پاشا کی کوششوں، برطانوی وائسرائے لارڈ ایلنبی کے حقیقت پسندانہ موقف اور برطانوی حکومت کے اس یقین کے بعد کہ اب مصری عوام کو کچھ دیئے بغیر خاموش نہیں کیا جا سکتا۔ نیز برطانوی نو آبادیات کے وزیر لارڈ ملنر کی زیر سربراہی قائم کمیٹی کی مصر کے حالات کے بارے میں رپورٹ وغیرہ کے نتیجے میں برطانوی حکومت نے مصر پر اپنے

---

[1] ایضاً ص ۹۷ ۔

کنٹرول کے بارے میں از سر نو غور کرنا شروع کیا۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے اس وقت کے برطانوی وزیر خارجہ لارڈ کیرزون کا یہ بیان آیا کہ "مصر پر برطانوی تصرف اب دونوں ممالک کے درمیان ایک ناپسندیدہ عمل ہو گیا ہے۔ اور برطانوی حکومت اب اس بات کیلئے آمادہ ہے کہ دونوں ممالک کے درمیان پسندیدہ بنیادوں پر تعلقات کے قیام کیلئے سلطان معظم کے ذریعہ تشکیل شدہ کسی مصری حکومت سے سنجیدہ مذاکرات کرے۔ اس اعلان کے بعد مصری سیاست میں ایک نئی زندگی پیدا ہوئی اور عدلی پاشا کی نگرانی میں حکومت کے قیام اور برطانوی حکومت سے مذاکرات کے آغاز کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس میں پیچ میں رکاوٹیں بھی آئیں اور کبھی کبھی امید کی ہر شکل ختم ہوتی نظر آئی۔ حتیٰ کہ عدلی پاشا نے وزارت سے استعفیٰ دیدیا اور مصری عوام کے مسلسل غم و غصہ کو دیکھ کر سعد زغلول اور ان کے بعض ساتھیوں کو گرفتار کر کے مصر سے باہر بھیج دیا گیا۔ لیکن ان سب کے باوجود برطانوی حکومت پر یہ بات واضح تھی کہ اب زور و زبردستی کی سیاست سے کام نہیں چلے گا۔ اور مصریوں کا دل جیتنے کیلئے کچھ دوسرے کام کرنے ہونگے۔ اس احساس کو مستحکم کرنے میں مصر کے ہنگامہ خیز حالات کے علاوہ لارڈ لنسبی کا بڑا اہم رول تھا۔ بحر حال ان سب کے نتیجے میں ۲۸ فروری ۱۹۲۲ء کو برطانوی وزیر خارجہ نے مصر سے اپنی مملکت کے کنٹرول اور تصرف (حمایتہ) کے خاتمہ کا اعلان کیا۔ اور مصر کو ایک خود مختار اور آزاد مملکت تسلیم کیا۔ اب دفاع، غیر ملکیوں اور اقلیتوں کے تحفظ اور سوڈان سے متعلق بعض مسائل کا تصفیہ اور باقی رہ گیا تھا۔ اس اعلان کے بعد عبد الخالق ثروت پاشا کی نگرانی میں وزارت کی تشکیل ہوئی۔ اس وزارت نے سب پہلا کام یہ کیا کہ سلطان معظم کے ذریعہ پہلا باضابطہ سرکاری اعلان شائع کیا۔ یہ اعلان ان کی طرف سے اور مصر کے نام سے تھا۔ اس میں مصر کو ایک آزاد اور خود مختار حکومت

قرار دیا گیا تھا اور بادشاہ نے اپنے آپ کو اس کا اصل حاکم قرار دیا تھا۔ اور اپنے لئے "جلالۃ الملک" کا لقب اختیار کیا تھا۔ اس وزارت نے دوسرا کام یہ کیا ہے کہ مارچ ۱۹۲۲ء میں جدید اصولوں کی روشنی میں ایک دستور کی تدوین اور تشکیل کیلئے حسین رشدی پاشا کی نگرانی میں ایک کمیٹی تشکیل دی اس کمیٹی میں مختلف طبقات مکاتب فکر کے نمائندے اور قانون و فقہ کے عظیم ماہرین کی ایک قابل ذکر تعداد شامل تھی۔ عبدالعزیز فہمی بھی اس کمیٹی کے ایک اہم اور معزز ممبر تھے انھوں نے مختلف دستوری مباحث میں بہت بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ حق انتخاب، جبری تعلیم اور پارلیمنٹ میں اقلیتوں کی مخصوص نمائندگی کے بارے میں ان کی آراء کو خاص طور سے بہت اہمیت دی گئی۔ اور ان کے ذریعہ کمیٹی کے ممبران کے درمیان موجود مختلف افکار و خیالات میں یکسانیت اور موافقت پیدا کرنے میں مدد ملی۔[1]

یوں تو اس دستور ساز کمیٹی کی کامیابی کا سہرا حسین رشدی پاشا کے سر جاتا ہے جو بے انتہا محنتی، قانون اور دستور کے امور میں ماہر، منفرد افکار کے حامل لوگوں پر کنٹرول رکھنے کی صلاحیت کے حامل اور سبکی سننے، سبکو مطمئن کرنے اور سب کی عزت نفس کا خیال رکھنے کی خداداد صلاحیت کے مالک تھے۔ خود عبدالعزیز فہمی نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ مصر کے تمام لوگوں میں قانون کا سب سے زیادہ علم رکھتے تھے۔ لیکن صحیح بات یہ ہے کہ حسین رشدی پاشا کے بغرض علاج سفر یورپ کے بعد جب کمیٹی کی ذمہ داری احمد حشمت پاشا ہ۔ جو اس کے پہلے سے نائب صدر تھے۔ کے اوپر آئی تو انھوں نے یورپی کمیٹی کے ممبران کے درمیان مختلف مسائل پر بڑھتے ہوئے اختلافات کو حل کرنے اور دستوری کے عمل کو جلد از جلد حل کرنے کی غرض سے کمیٹی کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک کا نام

---

[1] ایضاً ص ۱۳۸

"مجلۃ التحریر" اور دوسری کا نام "مجلۃ قانون الانتخاب" رکھا۔ پہلی کمیٹی کے ذمہ دستور کے مسودہ کو آخری شکل دیکر نیشنل رکنی مکمل کمیٹی کے سامنے کرنا تھا۔ اور دوسری کے ذمہ انتخاب کے قوانین مرتب کرنا تھا۔ "مجلۃ التحریر" کی صدارت عبدالعزیز فہمی کو سونپی گئی[1] اور "مجلۃ قانون الانتخاب" کی صدارت علی بک ماہر پاشا کو۔

عبدالعزیز فہمی نے اپنا کام بہت ہی محنت سے انجام دیا وہ رات میں مختلف دساتیر اور قانونی و فقہی مسائل کا مطالعہ کرتے تھے اور اپنے مخصوص تشریعی اسلوب میں ایک بہترین مواد تیار کرکے روزانہ میٹنگوں میں شرکت کرتے تھے۔ وہ ایک ایک لفظ اور حرف پر توقف کرتے تھے اور اسے زیادہ سے زیادہ مناسب اور دقیق بنانے کی کوشش کرتے تھے پھر وہ اپنی تجاویز پر بحث و مباحثہ کو بہت غور سے سنتے تھے اور جہاں کہیں تبدیلی کی ضرورت پیش آتی اسے بلا جھجک انجام دے لیتے تھے۔ ان کو اپنے استعمال کردہ کسی لفظ یا حرف پر بے جا اصرار نہیں ہوتا تھا۔ ان کے اس خلوص، محنت اور لگن کی وجہ سے قوم نے انھیں "ابو الدستور" کا لقب دیا۔ یہ اس کے بجا طور پر مستحق تھے۔ اپنی عظیم فقہی معلومات کے ساتھ ساتھ یہ ان چند مصری لوگوں میں سے ایک تھے جو عربی زبان کے اسرار و رموز کو بہت بہتر طریقے سے سمجھتے تھے۔ بہرحال اس کمیٹی میں اور انتخاب کے قانون مرتب کرنے والی کمیٹی دونوں نے اپنا کام کرکے اسے نیشنل رکنی کمیٹی کے سامنے پیش کر دیا۔ معمولی بحث و مباحثہ کے بعد اس کمیٹی میں بھی اسے منظور کر دیا۔ اور پھر دستور اور انتخاب کا یہ مسودہ وزیر عبدالخالق ثروت پاشا کے سپرد کر دیا گیا۔[2]

عبدالخالق ثروت پاشا کی حکومت فی الواقع سلطان معظم کی نامزد کردہ تھی۔

---

[1] عبدالعزیز فہمی ۔ حیاتہ حیاتی ص ۱۴۲ ،

[2] " " ص ۱۴۸

لیکن یہ اور ان کے علاوہ بہت سے دوسرے لوگ جن میں مذکورہ دستور ساز کمیٹی کے اکثر ممبران بھی شامل ہیں۔ مصر کی سیاست میں ایک نئی سیاسی پارٹی کی ضرورت محسوس کر رہے تھے یہ لوگ سعد زغلول اور ان کی پارٹی پر تشدد، غیر مصالحت اور ڈکٹیٹرانہ پالیسیوں کے سخت مخالف تھے۔ چنانچہ ان لوگوں نے "حزب الاحرار الدستوریین" کے نام سے ایک نئی پارٹی بنا ڈالی اس پارٹی کا مقصد دستور کا نفاذ اور اس کا تحفظ تھا۔ یہ جمہوریت، حریت، تعلیم اور معاش کے سلسلے میں بہت واضح موقف رکھتی تھی۔ یہ فروری ۱۹۲۲ء کے اعلان برطانیہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے قوم کیلئے مزید آزادی کی شکلیں اور راہیں تلاش کرنے کی قائل تھی۔ قومی اتحاد کا قیام اور تمام اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر قوم کیلئے یکسو ہو جانے کی دعوت بھی اسکی پالیسی کا ایک اہم حصہ تھا۔ اس پارٹی کی صدارت عدلی پاشا کو سونپی گئی جو تاریخ مصر میں ایک اہم سیاسی شخصیت کے طور سے جانے جاتے تھے۔ اس کے دوسرے نمایاں ممبران میں مدحت پاشا، محمود پاشا محمود، حسن پاشا عبدالرزاق، دکتور حافظ عفیفی اور دسوقی بک اباظہ تھے۔ عبدالعزیز فہمی بھی اس پارٹی کے ابتدائی ارکان میں تھے۔ ان کے دوست لطفی السید گرچہ اس میں باضابطہ طور سے شامل نہیں تھے لیکن ان کی خاموش حمایت اس پارٹی کو حاصل تھی۔ عدلی پاشا کا افتتاحی خطاب انھوں نے ہی تیار کیا تھا۔ اس پارٹی نے اپنا ایک باضابطہ اخبار نکالا جس کا نام "السیاسۃ" تھا۔ اور جس کے مدیر مصر کی مشہور علمی، صحافی اور سیاسی شخصیت محمد حسین ہیکل تھے۔ اس پارٹی کو متعدد بار خود اور کبھی کبھی دوسری پارٹی کے ساتھ حکومت سازی کا موقع ملا۔ اس وزراء اعظم میں پارٹی کے دو عدلی پاشا اور محمد محمود پاشا خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ اس کی حمایت سے بعض دوسرے لوگوں کو بھی وزارت عظمیٰ کا منصب ملا۔

---

[1] ایضاً ص ۱۶۲

لیکن چونکہ اس زمانے میں مصری سیاست میں اتحاد پھل اپنے عروج پر تھی۔ جمہوریت کا پودا پوری طرح پنپنے نہیں پایا تھا۔ اور سیاسی پارٹیوں کی آپسی رقابت پورے شباب پر تھی اس لئے کسی بھی وزارت کو خواہ یہ "حزب الاحرار الدستوریین" کی ہو یا "حزب الوفد المصری" کی یا "حزب الاتحاد" کی، بہت دنوں کام کرنے کا موقع نہیں مل پاتا تھا۔ سیاسی پارٹیوں کا اندرونی حال بھی کوئی بہت بہتر نہیں تھا۔ چنانچہ صرف "حزب الاحرار الدستوریین" کو اپنے قیام کے بعد پانچ سال کے اندر تین بار اپنا صدر تبدیل کرنا پڑا۔ ۱۹۲۴ء میں عدلی پاشا کے استعفیٰ دینے کے بعد عبدالعزیز فہمی کو اس کا صدر بنایا گیا۔ ۱۹۲۶ء میں انھوں نے بھی استعفیٰ دے دیا اور ان کی جگہ محمد محمود پاشا کو اسکا صدر منتخب کیا گیا۔

۱۹۲۴ء سے ۱۹۲۷ء تک "حزب الاحرار الدستوریین" کی صدارت کے دوران عبدالعزیز فہمی نے کئی ایک نمایاں کارنامے انجام دیئے۔ اس منصب اور اس کے بعد کے دوسرے مناصب پر الغرض جہاں کہیں بھی وہ رہے اپنے اصلاحی خیالات کے پیش نظر اور ان پر اصرار کرنے سے کبھی بھی باز نہیں رہے۔ ۱۹۲۵ء میں جب زیور پاشا کی وزارت تشکیل پائی تو ان کی پارٹی نے اس کا ساتھ دیا۔ خود عبدالعزیز فہمی اس وزارت میں بحیثیت وزیر قانون شامل ہوئے لیکن اس وقت بھی ان کے اپنے اصول و ضوابط پر ثبات و استقامت کا عالم یہ تھا کہ سلطان ملک فؤاد نے جب اپنے بعض اہل کاروں اور درباریوں کے تحفظ کی خاطر سزاؤں کے قانون میں کچھ تبدیلی کرنی چاہی تو انھوں نے اس کی سخت مخالفت کی اور بادشاہ سے مخاطب ہو کر کہا "بادشاہ سلامت! اس دروازے کو نہ کھولئے۔ میرا خیال یہ ہے کہ اسی میں آپ کی بھی عافیت ہے"[1]۔

---

[1] ایضاً ص ۱۵۲

پھر اسی وزارت کے دوران قاضی محاکم شرعیہ شیخ عبدالرزاق کا معاملہ بھی آگیا۔ ان کی کتاب "الاسلام و اصول الحکم" پر جامعہ ازہر کی بالائی کمان کا سخت رد عمل سامنے آیا اور اس نے ان کی سند عالمیت ضبط کر لی۔ اس کتاب میں خلافت کے تصور کی نفی کی گئی تھی اور تمام مسلم خلفاء کو بادشاہ قرار دیا گیا تھا۔ عبدالعزیز فہمی نے اس پر علماء ازہر کے اعتراضات کی تردید کی اور کہا کہ مجموعی طور سے اس کتاب میں کوئی اہانت آمیز اور خلاف حق بات نہیں کہی گئی ہے۔ وہ جامعہ ازہر کے خلاف اپنے اس موقف پر شدت سے قائم رہے ادھر حکومت عوام کے احتجاج سے پریشان ہو کر ان سے نرم رویہ کی اپیل کرنے لگی۔ انھوں نے یہ بات واضح کر دی کہ وہ حق بات کی حمایت سے انحراف نہیں کریں گے۔ آخر کار جب مصالحت کی کوئی شکل نہ بن سکی اور عوام کا غصہ دن بدن بڑھتا گیا تو انھوں نے وزارت قانون سے استعفا دے دیا۔ ان کا یہ اقدام فی الواقع حریت رائے اور دستور کے تحفظ کے لئے انتہائی ضروری تھا۔[1]

عبدالعزیز فہمی نے وزارت قانون سے استعفیٰ دینے کے بعد اپنے اور اپنی پارٹی کے موقف کی وضاحت کی۔ وضاحت کے لئے ایک عظیم الشان اجتماع منعقد کیا۔ ۲۸ اکتوبر ۱۹۲۵ء کو پارٹی کے یوم تاسیس کے موقع پر منعقدہ اس اجتماع میں انھوں نے ایک انتہائی جامع، پر مغز اور مدلل تقریر کی۔ اس میں انھوں نے موجودہ حکومت کے موقف کو بے انتہا تنقید کا نشانہ بنایا۔ یہ خطاب بے حد پسند کیا گیا۔ سامعین نے تالیوں سے اسکا استقبال کیا۔ دوسرے دن جب یہ اخبار "الہیاسۃ" میں شائع ہوا تو اسکی ہر طرف سے تحسین کی گئی اور اسکی دوبارہ اشاعت کا مطالبہ کیا گیا۔ اس خطاب سے فی الواقع "حزب الاتحاد"

---

[1] ایضاً ص ۱۵۷—۱۵۰ ،

اور اس سے متعلقین کی دھجیاں بکھر گئیں اور ان کے سیاہ کارناموں سے عوام واقف ہو گئے۔

۱۹۲۵ء کے بعد مصر کے سیاسی حالات میں ایک اہم تبدیلی یہ آئی کہ وفد پارٹی کا رویہ "حزب الاحرار الدستوریین" کے بارے میں مصالحانہ ہو گیا۔ یہ غالباً سعد زغلول اور پارٹی پر اسکی حقیقت واضح ہو جانے کا مظہر تھا کہ سخنیوں، انفرادی خیالات کے ذریعہ اور دوسروں کو نظر انداز کر کے کامیابی کا حصول اور اقتدار پر قبضہ ممکن نہیں ہے۔ اس لئے پیش رفت سب سے پہلے ان ہی کی طرف سے ہوئی۔ سعد زغلول نے بنفس نفیس "حزب الأحرار الدستوریین" کے ممبران سے رابطہ قائم کیا اور ان دونوں پارٹیوں میں میل اور اتحاد و ائتلاف کی ضرورت واضح کی۔ اس کے نتیجے میں پارٹی کے بعض سرگرم ممبران جن میں اس کے سکریٹری محمد محمود پاشا پیش پیش تھے۔ ان کے ہمنوا اور ہم خیال ہو گئے۔ لیکن اس کے صدر عبدالعزیز فہمی اب بھی اس کے قائل نہیں ہو رہے تھے۔ وہ مصر کے پورے انتشار و اضطراب کا ذمہ دار سعد زغلول کو قرار دیتے تھے۔ اسطرح اتحاد و ائتلاف کے مسئلے میں پارٹی میں دو رائیں ہو گئیں۔ محمد محمود پاشا کے ساتھ پارٹی کی اکثریت تھی اور وہ بھی با اثر اور جری آدمی تھے اس لئے انھوں نے اپنے مکان پر دونوں پارٹیوں کے سرکردہ لوگوں کا اجتماع بلایا۔ اور باہمی امور پر تبادلۂ خیال کے بعد یہ طے پایا کہ دونوں پارٹیاں قومی مفاد کیلئے مل جل کر کام کریں گی۔ اس پیش رفت کے بعد عبدالعزیز فہمی نسبتاً بد دل اور مایوس ہو گئے۔ کچھ دنوں کے بعد انھوں نے اپنی پارٹی کی صدارت سے استعفیٰ دے دیا۔ ۱۹۲۷ء میں محمد محمود پاشا اس پارٹی کے نئے صدر منتخب ہوئے۔

"حزب الاحرار الدستوریین" کی صدارت سے استعفا کے بعد وہ سیاست سے ہمیشہ کیلئے علیحدہ ہو گئے۔ اس کے بعد اپنے پیشہ وکالت کے اعتبار سے بعض مناصب پر فائز ہوئے۔ ان میں "محکمہ الاستئناف الاھلیۃ" کی صدر اور "محکمۃ النقض والابرام" (سپریم کورٹ) کے چیف جسٹس کے مناصب زیادہ اہم تھے۔ پھر بعد میں ۱۹۴۳ء میں انھیں وکلاء کا منتخب کیا گیا۔ آخری عمر میں انھیں "مجمع اللغۃ العربیۃ" کا ممبر بنایا گیا ان تمام ذمہ داریوں کو انھوں نے بحسن وخوبی انجام دیا اور ہر جگہ اپنی مصلحانہ شان باقی رکھی، محکمہ استئناف کی صدارت سے استعفا کا سبب بھی یہ بنا کہ ایک ممبر پارلیمنٹ نے وزیر قانون سے بار بار یہ سوال پوچھا کہ محکمہ استئناف کا مقام و مرتبہ کیا ہے؟ کیا وہ ایک وزیر کے مساوی حقوق پا سکتا ہے؟ جب انھیں اسکی اطلاع ملی تو انھوں نے فوراً استعفا دے دیا اور ملک نواد کے پاس جا کر کہا "محترم! منصب قضا کے احترام کا تقاضہ یہ ہے کہ اس کے ساتھ کسی کو مذاق کرنے یا کھیل کھیلنے کی اجازت نہ دی جائے۔ ایک ممبر پارلیمنٹ برابر اس طرح کے سوالات کرتا رہتا ہے۔ چنانچہ اب میں اس منصب پر باقی نہیں رہ سکتا"[1]۔

جب وہ "مجمع اللغۃ العربیۃ" کے ممبر بنائے گئے تو یہاں بھی اپنی اصلاحی فکر کے پیش کرنے اور اسکی تشریح و توضیح کرنے میں کوئی تساہل نہیں کی۔ انھوں نے ترکی میں پیش آنے والے واقعات کو بنیاد بنا کر عربی رسم الخط کی اصلاح کا ایک مکمل خاکہ پیش کیا۔ چونکہ یہ خاکہ ایک ایسے آدمی کی طرف سے پیش کیا گیا تھا جو اپنی عربی قومیت، عربی زبان اور اس کے ورثے سے شدید تعلق کیلئے معروف تھا اس لئے اس پر لوگوں کو سخت تعجب ہوا۔ وہ خود اسکی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

---

[1] ایضاً ص ۱۶۲۔

"مجمع اللغۃ العربیۃ" کے ممبر بننے کے بعد جب میں نے اپنی ذمہ داریوں کو جاننا چاہا تو سب سے پہلے میری نظر اس کے اغراض و مقاصد کی اس شق پر گئی "عربی زبان کی سلامتی کا تحفظ کرنا" (المحافظۃ علی سلامۃ اللغۃ العربیۃ) پھر میری نظر کے سامنے وزیر معارف کا وہ بیان گزرا جسمیں انھوں نے کہا تھا کہ وہ اس زبان کی کتابت کو اس حد تک آسان بنانے کی کوشش کریں گے کہ قارئین کی زبانوں پر کوئی خطا یا لحن باقی نہ رہے۔ پس جب میں نے اسکی ممبر شپ قبول کی تو میرے سامنے دو راستے تھے یا تو میں اس ذمہ داری کو قبول کرتا یا اس سے الگ ہو جاتا۔ پس میں نے پہلا راستہ اختیار کیا۔ اب اس ذمہ داری کا حق ادا کرنے کا میرے پاس اس کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا کہ میں لاتینی حروف اختیار کرنے کی سفارش کروں۔ اسمیں حروف بھی اور حرکتیں بھی ہیں۔ وہ بھی یوں ہی نہیں ہیں بلکہ ایک خاص ترتیب سے ہیں[1]"

عبد العزیز فہمی کی شخصیت علم و فن، ذکر و تذکیر، اصلاح و تنبیہ اور جرأت و بہادری سے عبارت ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی میں جو کام بھی انجام دیا اور وہ جس منصب پر بھی فائز رہے اپنے اوصاف کا جیتا جاگتا ثبوت فراہم کیا۔ خاص طور سے اصلاح و تنبیہ کا وصف تو ان کی زندگی کا ایک اٹوٹ حصہ بن گیا تھا۔ ایام شباب سے لیکر تادم آخر وہ اس وصف سے ہمیشہ متصف رہے۔ بحیثیت وکیل انھوں نے وکلاء، قضاۃ اور حکمرانوں کے غلط کاموں پر اپنا ردعمل ظاہر کیا۔ سیاسی زندگی میں جہاں کہیں بھی بات اصولوں سے ہٹتی نظر آئی فوراً ٹوک دیا اور اس کے بعد بھی اگر معاملہ سلجھتا نہیں تھا تو پھر اپنی برأت کا اظہار کر دیا۔ حکومت کے محکموں میں مختلف ذمہ داریوں پر فائز رہے لیکن ان کا کبھی ناجائز استعمال نہیں کیا اور کسی نے ان کے ذریعہ کوئی غلط کام کرانا چاہا تو انھوں نے فوراً اسے جھڑک دیا اور سختی کے ساتھ ایسا کرنے سے منع کر دیا۔

---

[1] ایضاً ص ۱۹-۲۰

ان کی خود نوشت سوانح حیات کے مطالعہ سے ایسی بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ انکی تنقید، تنبیہ، اصلاح اور ردعمل سے عام لوگ تو کیا سلاطین وقت اور سربرآوردہ لوگ بھی محفوظ نہیں رہے۔ اپنی خود نوشت میں انھوں نے اپنی زندگی کے اسی پہلو کا تعارف پیش کیا ہے۔ گویا اصلاح و تصحیح ان کی خود نوشت نگاری کا بنیادی محور ہے جسکے گرد تمام حادثات و واقعات گردش کرتے ہیں۔ صحیح بات یہ ہے کہ اصلاح ان کی زندگی کا سب سے محبوب عمل تھا اور یہی ان کے تمام افعال کا رخ متعین کرتا تھا۔ مختلف مناصب اور ذمہ داریوں پر رہتے ہوئے انھوں نے اصلاح کے سلسلے میں جو کوششیں کی اور سب سے بڑی بات یہ کہ خود کو جسطرح اصول و ضوابط کا پابند رکھا اسکی تفصیلات گذشتہ صفحات میں آگئی ہیں۔ ان کے علاوہ سماج کے بعض مسائل کے بارے میں بھی ان کے موقف کی اصل بنیاد یہی فکر اور نظریہ تھا۔ عربی حروف کی اصلاح کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر بیان کیا جا چکا ہے۔ بقیہ سماج کے اہم مسئلہ تعدد ازدواج کے بارے میں ان کا موقف یہ تھا کہ اسکی اجازت نہیں دی جانی چاہیئے۔ اس پر بحث کرتے ہوئے انھوں نے اسے قرن اول کے مجاہدین کے لئے مخصوص قرار دیا اور یہ بتایا کہ قرآن مجید میں اسکا کہیں تذکرہ نہیں ہے۔ فقہاء نے عوام کی خواہش کا خیال رکھتے ہوئے اس عمل کو جو صرف بطور مجبوری ایک دور کے لئے مخصوص تھا ہمیشہ کے لئے مباح اور جائز قرار دے دیا۔ اس پوری بحث کے مطالعہ سے ان کی فقہی بصیرت اور جدید قوانین پر وسیع نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔[1]

اصلاحی افکار کی وضاحت کے ساتھ ساتھ انھوں نے اپنی خود نوشت میں یہ مقصد بھی پیش نظر رکھا کہ مختلف واقعات و حادثات کے تعلق سے ان کے اوپر جو تنقید کی جاتی تھی اور جسطرح کے الزامات لگائے جاتے تھے ان کا جواب دیں اور تصفیہ کریں۔ اس سلسلے میں

---

[1] ایضاً ص ۲۰۶-۲۰۷ ،

انقلاب ۱۹۱۹ء خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ انھوں نے اس انقلاب کے نسلق سے بہت سے اسرار و رموز سے پردہ اٹھایا اور اپنے بارے میں پائی جانے والی غلط فہمیوں کا ازالہ کیا۔ بعض دوسرے سیاسی زعماء کی پوزیشن بھی اس سے واضح ہوئی۔ انقلاب کے نسلق سے اس کتاب میں بعض حقائق بالکل نئے اور اچھوتے ہیں۔ وہ اس انقلاب کے عینی شاہد اور اہم لیڈر تھے اس لئے انھوں نے جو کچھ لکھا اس کا انھیں حق تھا۔

عربی زبان کی دیگر خودنوشت سوانح عمریوں کی طرح اس خودنوشت کی بھی کچھ خوبیاں ہیں۔ اسیطرح اس میں بعض کمزوریاں بھی پائی جاتی ہیں۔ مصنف کے بارے میں بات متعدد بار واضح کی جاچکی ہے کہ وہ نڈر، جری، بے باک اور حق گو واقع ہوئے تھے۔ ان کی خودنوشت سوانح پر ان کی شخصیت کے اس پہلو کا ظاہر بے اثر مرتب ہونا تھا۔ چنانچہ جب ہم اس لحاظ سے اس خود نوشت کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اسمیں مختلف اسمیں مختلف واقعات وحادثات کے بارے میں رائے قائم کرتے ہوئے خواہشات نفسانی کیطرف کوئی میلان نہیں پایا جاتا اور نہ ہی جھوٹی اور غیر منطقی باتوں پر اعتماد کیا جاتا ہے اس وجہ سے اس میں تواضع، سچائی، صاف گوئی اور معروضیت کی ایک وافر مقدار جمع ہوگئی ہے، خواہ وہ اپنے بارے میں گفتگو کریں یا دوسروں کے بارے میں، یہ وصف بہر حال ملحوظ رکھتے ہیں۔ اگر وہ اپنے ان معاصرین کے بارے میں جن کے ساتھ مختلف واقعات میں وہ شریک رہے ہیں اور جن سے بعد اوقات اختلافات بھی ہوئے ہیں، اظہار خیال کرتے ہوئے نرمش روی، کراہیت اور غصے کا اظہار کرتے تو یہ بات فطری تھی لیکن وہ اس طرح کی خواہشات نفسانی سے بہت دور تھے۔ اپنے ساتھیوں اور رفقاء کے بارے میں خاص طور سے ۱۹۱۹ء کے رفقاء کے بارے میں انکا انداز بالکل معتدل ہوتا تھا۔

ان کی سچائی کی بہترین مثال عدلی یکن کے بارے میں ان کا اظہار خیال ہے۔ انھوں نے سعد زغلول اور وفد پارٹی کے بعض دوسرے ممبروں کے عدلی یکن کے بارے میں خیالات کی تردید کی ہے۔ اس وقت یہ بات مشہور ہو گئی تھی کہ وہ وفد پارٹی کے راستے میں رکاوٹ ڈال رہے ہیں اور گفت و شنید کی راہ میں مشکلات حائل کر رہے ہیں[1]۔ ان حالات میں عبدالعزیز فہمی نے ان کے بارے میں انتہائی جرأت اور سچائی سے اظہار خیال کرتے ہوئے یہ اعلان کیا کہ موصوف ایک وطن پرست اور شریف آدمی ہیں۔ انھوں نے وفد پارٹی کی مدد کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ مصری قضیے کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کیلئے وہ برابر کام کرتے رہے کیونکہ ان کی کوششوں سے وفد پارٹی کو لندن میں ملنر کمیٹی سے مذاکرات کا موقع ملا۔ اور پھر کئی بار جب مذاکرات بالکل تعطل کا شکار ہونے والے تھے ان کی سوجھ بوجھ اور فہم و فراست سے ان میں دوبارہ جان آگئی[2]۔

ان کی صداقت اور معروضیت کی ایک مثال ان کی یہ کوشش ہے کہ وہ سعد زغلول اور عدلی یکن کے درمیان اختلافات کی کوئی ایسی تاویل پیش کریں جس سے یہ معلوم ہو کہ یہ اختلافات فی الواقع ان دونوں کے مزاج کے مختلف ہونے کی وجہ سے پیش آئے جبکہ یہ دونوں مقصد اور نصب العین کے اعتبار سے ایک تھے۔ پس سعد زغلول کے مزاج میں سختی ہے۔ ان کا اسلوب وکلاء کے اسالیب سے ملتا ہے جسمیں مخالف کو ہر ممکن طریقے سے پھانسنے اور ہر بات پر گرفت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جہاں تک عدلی پاشا کا معاملہ ہے تو وہ طبیعتاً نرم واقع ہوئے ہیں۔ ان کے لہجہ اور انداز تکلم میں بھی نرمی ہے۔ ان کی گفتگو میں سیاست اور ڈپلومیسی کا رنگ غالب ہوتا ہے۔ وہ بات چیت میں بیحد نرمی

---

[1] ایضاً ص ۱۰۵ ، [2] ایضاً ص ۱۱۲ ،

اور چابکدستی سے حصہ لیتے ہیں اسی لئے انگریزوں سے مذاکرات میں یہ بہت زیادہ کامیاب رہے۔ ان مذاکرات میں خاص طور سے تعطل کے وقت ان کی ضرورت پڑتی تھی۔ انگریزوں کے یہاں ان کی اسی اہمیت کی وجہ سے فی الواقع سعد زغلول اور ان کے درمیان رشک و رقابت کا وہ جذبہ پیدا ہوا جو بعد میں مخاصمت اور عدم مخاصمت پر منتج ہوا[1]۔

عبدالعزیز فہمی بھی سعد زغلول کے ساتھ بہت دنوں تک نہیں رہ سکے تھے انھوں نے بھی انکے سخت اور ڈکٹیٹرانہ مزاج سے بیزار ہو کر علیحدگی اختیار کر لی تھی لیکن اس کے باوجود جب وہ ان کے بارے میں رائے دیتے ہیں تو بہت اعتدال اور توازن کے ساتھ دیتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ان کے اچھے پہلوؤں کی تحسین کرتے ہیں۔ مثلاً ان کی یہ شہادت کہ سعد زغلول اپنی زندگی کے ہر مرحلے میں ایک ممتاز فرد رہے ہیں اور یہ کہ وہ اپنے زمانے کے تین وکلاء میں سے ایک تھے جنھیں وکالت پر پوری مقدرت حاصل تھی وہ ایک بے لوث قاضی کی حیثیت سے بھی بہت زیادہ مشہور ہوئے۔ ان کا ذہن بحث و تکرار میں بہت تیز کام کرتا ہے۔ بیشک وہ تعلیم یافتہ نہ تھے لیکن انکی عقل ان کے علم پر فائق تھی[2]۔ سعد زغلول کی طرح انھوں نے اپنے دوسرے معاصرین مثلاً علی شعرادی، حسین رشدی، عبدالخالق ثروت، عدلی یکن اور محمد محمود پاشا وغیرہ کے بارے میں بھی معروضی اور غیر جانبدارانہ انداز میں اظہار خیال کیا ہے اور ان تمام کے اوصاف عالیہ کو پیش کیا ہے[3]۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ جب وہ اپنے معاصرین کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں تو ان کے عیوب کے بجائے ان کے روشن پہلوؤں پر زیادہ توجہ دیتے ہیں لیکن اس کے باوجود شدید ضرورت کے وقت وہ تنقید اور تبصرہ سے بھی باز نہیں آتے ہیں۔ اس سے ان کا مقصود لوگوں کے سامنے

[1] عبدالعزیز فہمی ـــ مذکرات حیاتی، ص ۱۳۰، [2] ایضاً ص ۲۵،
[3] ایضاً ص ۲۶

وہ معتدل طرز بیان پیش کرنا ہے جو ان کی نظر میں تمام لوگوں کے لئے مناسب اور سب کے مفاد میں ہے۔ مگر باہر دن مگر اپنے رفقاء سے ان کے جو اختلافات ہوئے ان کی تصویر کشی اور تحریری وضاحت بھی اسی قبیل کی چیز ہے۔ کیونکہ یہاں یہی مناسب تھا کہ واقعات و حقائق اپنے صحیح پس منظر میں لوگوں کے سامنے آجائیں اور جن سے جو بات منسوب ہے وہ واضح ہو کر سامنے آجائے، خواہ اس کی وجہ سے بعض شخصیتوں کو تنقید کا نشانہ ہی کیوں نہ بنانا پڑے۔

وہ واقعات زیادہ تر اپنی یادداشت کی بنیاد پر قلمبند کرتے ہیں۔ ان واقعات کے ظہور کے لیے عرصے کے بعد ان کی تصویر کشی اور ترتیب و پیش کش کا کام انجام دیتے ہیں۔ ان کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ ان واقعات کے بارے میں اپنی یادداشت کی مدد سے سب کچھ بیان کر دیں۔ باوجود اس کے کہ انھوں نے اپنی زندگی کے بیشتر حادثات اور تجربات، ایک مدت گذر جانے کے بعد، اپنے حافظے کی مدد سے تحریر کیا۔ لیکن واقعات کا تذکرہ کرتے ہوئے تاریخ لکھنے سے غفلت نہیں برتی۔ خاص طور سے عمومی زندگی سے متعلق واقعات کی تحریر، جیسے وفد پارٹی کی تشکیل کا واقعہ اور پہلی منتخب وفدی وزارت کی تشکیل کا واقعہ وغیرہ۔ وہ تاریخ کے ساتھ دن کے تذکرہ کا بھی اہتمام کرتے ہیں۔ کبھی کبھی مقامات اور شخصیات کے ناموں کی صراحت بھی کر دیتے ہیں۔ اس سے بلاشبہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی یادداشت مضبوط تھی اور وہ اسے خودنوشت سوانح حیات میں استعمال کرنے میں کامیاب رہے۔

حقیقت کی ترجمانی کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ بڑھاپے میں خودنوشت کی تالیف کے باوجود وہ اپنے اور دوسروں کے درمیان ہوئے مکالمات اور باتوں کو ہو بہو نقل کرتے ہیں۔ حالانکہ ان مکالمات پر ایک طویل عرصہ گذر چکا ہوتا ہے۔ بغیر مضبوط قوت حافظہ کے ان کو نقل کرنا بہرحال

ممکن نہیں تھا۔ اس سلسلے میں ان کی سلطان حسین کامل اور ملک فؤاد سے گفتگو اور اسیطرح وفد پارٹی کے ممبران اور خاص طور سے سعد زغلول سے گفتگو کو بطور مثال نوٹ کیا جا سکتا ہے، انھوں نے سعد زغلول اور عدلی پاشا کے مکالمات بھی امانداری سے نقل کئے ہیں۔ بغیر کسی ڈائری کے حوالہ کے پوری صداقت سے اس طرح کی باتوں کے نقل کر دینے سے اس حقیقت پر یقین اور زیادہ مضبوط ہو جاتا ہے کہ انھیں اپنی زندگی کے تمام واقعات، مشاہدات اور مکالمات اچھی طرح سے یاد تھے اور بوقت ضرورت وحاجت وہ انھیں پیش کر دینے کی پوری صلاحیت رکھتے تھے۔

مکالمات اور باتوں کے ذہن میں محفوظ رہ جانے کی ایک مثال اس وقت کی ہے جب وہ دستور ساز کمیٹی کے صدر تھے۔ اس سلسلے میں شیخ مجیب سے ان کا ایک مکالمہ ہوا جس کے بارے میں وہ لکھتے ہیں

"اس کمیٹی نے دستور کی پہلی شق یہ رکھی تھی" مصر ایک خود مختار، آزاد اور محترم ملک ہے۔ نہ تو اس کی تقسیم کی جا سکتی ہے اور نہ ہی اس کے کسی حصہ سے دستبردار ہو یا جا سکتا ہے" (مصر دولة سيدة حرة مستقلة، ملكها لا يتجزأ ولا ينزل عن شئ منه)۔ ان کے اور میرے درمیان اس معاملے میں بڑی لمبی بحث ہوئی۔ پس شیخ مجیب نے کہا" مصر سیدة یعنی متر لیتہ، شئ للہ یا سیدة"[1]

اس طرح کی وہ گفتگو ہے جو عدلی یکن نے ملنر کمیٹی کے ساتھ ہوئے مذاکرات میں ناکامی کے بعد لندن سے واپس آتے ہوئے کی تھی۔ ان کا مقصد ان الزامات کا دفاع کرنا تھا جو ان کے اوپر وفد پارٹی کی کوششوں کو سبوتاژ کرنے کے سلسلے میں لگائے جاتے تھے۔ چنانچہ وہ وفد پارٹی کے ممبران سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں۔

---

[1] ایضاً ص ۱۳۲،

"تم میں سے کون شخص ہے جو یہ کہتا ہے کہ میں نے وطن کے ساتھ غداری کی ہے؟ تم میں کون ہے جس نے مجھ سے زیادہ اپنے وطن کی خدمت کی ہے اور اس راہ میں مجھ سے زیادہ پریشانیاں جھیلی ہیں؟"

جب ان کی اس بات سے وفد پارٹی کے ممبران ششدر رہ گئے تو انھوں نے ان سے کہا "یہ ٹیلی گرام پڑھو" پھر سعد اور عدلی میں سے ہر ایک کی آواز بلند ہونی گئی۔ سعد کہہ رہے تھے "کیا تم ملنر اور دوسرے انگریزوں سے بات چیت کے لئے نہیں جاتے تھے اور پھر اسکی تفصیلات سے ہمیں باخبر کرنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کرتے تھے۔" عدلی نے اس کا جواب یہ دیا "اے شیخ! گویا آپ اس طرح کی باتیں کہہ کر یہ اصول بنانا چاہتے ہیں کہ اگر کوئی مصری کسی انگریز سے گفتگو کرے اور پھر وہ اپنے بھائیوں کو اسکی تفصیلات سے آگاہ نہ کرے تو وہ اپنے وطن کا غدار ہوگا۔ آخر یہ کیسی بات ہے؟ میں ملنر وغیرہ سے ملاقات ان کی آفسوں، گھروں اور محفلوں میں کرتا تھا لیکن اسکا مطلب صرف اور صرف مصری حقوق کا مطالبہ ہوتا تھا۔ اور بہت سی ملاقات کی بنیاد تو وہ ذمہ داریاں تھیں جو آپ لوگوں نے مجھے دے رکھی تھیں"[1]۔

عبدالعزیز فہمی نے جو مکالمات نقل کئے ہیں ان کے بہت سے حصے ایسے ہیں جن سے بعض اہم مسائل اور مشکلات پر روشنی پڑتی ہے۔ ان سے بلا شبہ ان کے قوت حافظہ کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انھیں صحیح یادداشت پر کتنی مہارت حاصل تھی اور یہ کہ وہ واقعات کی روایت، ان کی تصویر کشی اور ان کے اعادہ کے بیحد حریص تھے۔ ان کی پوری کوشش ہوتی تھی کہ وہ ان میں حقیقت کا عنصر پوری طرح ملحوظ رکھیں۔

جسطرح ان کی خود نوشت سوانح حیات سے ان کی معروضی نظر، صداقت اور صراحت کا اندازہ ہوتا ہے اسیطرح اس سے ان کی جرأت و بے باکی کا بھی سراغ ملتا ہے۔ جب

---

[1] ایضاً ص ۱۰۵-۱۰۶

انھیں کسی مسئلے میں رائے زنی کرنی ہوتی یا ان کے سامنے کوئی غلط کام ہو رہا ہوتا تو پھر وہ بغیر کسی دباؤ اور خوف کے اپنا موقف پیش کر دیتے تھے۔ انھیں اس سے کوئی مطلب نہیں ہوتا تھا کہ وہ سلطان وقت کے بارے میں اظہار خیال کر رہے ہیں یا پارٹی صدر کے بارے میں۔ سلطان محمد حسین، ملک فؤاد، سعد زغلول اور عدلی یکن کے بارے میں ان کے خیالات سے اس کی حقیقت واضح ہو جائے گی۔

عبدالعزیز فہمی کو اپنی عزت نفس کا بہت زیادہ پاس و لحاظ تھا۔ وہ فخر و غرور اور کبر و تعلی سے دور تھے لیکن ایک شریف انسان کی طرح وہ اپنی ذات کا حد سے زیادہ احترام کرتے تھے۔ وہ کسی انسان کو اپنے بارے میں یا اپنی خاندان، قبیلہ اور ملک کے بارے میں بے جا ظن و تخمین کرنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ انھیں جس وقت اس بات کا گمان ہوتا کہ کوئی ان کی یا ان سے متعلق کسی فرد کی عزت پر حملے کرنا چاہتا ہے تو وہ فوراً احتجاج کرتے تھے یا استعفا دے دیتے تھے مثلاً جب وہ محکمہ استئناف کے صدر تھے تو ایک ممبر پارلیمنٹ کے بار بار انکی حیثیت اور اختیار کے بارے میں سوال کرنے کی وجہ سے انھوں نے استعفا دے دیا۔ یہ اقدام عہدہ قضا کے احترام کی بقا کیلئے ضروری تھا۔ اسیطرح تعلیم سے فراغت کے کچھ عرصہ بعد انھیں ایک ادارے میں معاون منتظم کی حیثیت سے کچھ دنوں کام کرنے کا موقع ملا تو اس کے منتظم اعلیٰ کی اپنے کسی معاملے میں ایک ادنیٰ مداخلت کی وجہ سے انھوں نے استعفا دیدیا۔[1]

اپنے اظہار بیان میں حد سے زیادہ غیر جانبداری اور معروضی نظر کا پاس و لحاظ رکھنے کی وجہ سے ان کا معاملہ یہ تھا کہ وہ جب مختلف واقعات کے تعلق سے اپنے اختلافات کا ذکر کرتے تھے تو صرف اسکے خارجی عوامل کے تجزیہ اور بیان پر اکتفا کرتے تھے۔ وہ اپنے نفس اور شعور و وجدان کی

---

[1] ایضاً ص ۱۶۱ ،

گہرائیوں میں اترنے سے احتراز کرتے تھے۔ چنانچہ لطفی السید کیطرح وہ صرف اتنا بتا کر خاموش ہو جاتے ہیں کہ مختلف واقعات و حادثات میں ان کا کیا رول رہا اور مختلف شخصیتوں سے ان کے تعلقات کیسے تھے؛ اگر کہیں بوقت ضرورت اپنے احساسات اور تاثرات کو وہ نوٹ کرنا چاہتے ہیں تو بہت سرسری اور مختصر طور سے نوٹ کرتے ہیں۔ اور پھر فوراً اپنے اصل مقصد کیطرف لوٹ آتے ہیں۔ اسکی مثال ۱۹۲۷ء میں سعد زغلول کی خبر مرگ ہے۔ اسے سن کر ان کے بقول انھیں بہت افسوس ہوا اور وہ سخت صدمے سے دوچار ہوئے تھے[1]

عبدالعزیز فہمی کی خود نوشت کے مباحث کا یہ مختصراً تعارف اور جائزہ تھا۔ ان پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے سے اس حقیقت کا بخوبی علم ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی پوری زندگی ایک مخصوص اصلاحی فکر کے علمبردار رہے اور زندگی کے ہر موڑ پر اسے پوری طاقت سے پیش کرتے رہے، اسکی وجہ سے انھیں بہت سخت قسم کی مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن انھوں نے اپنے نظریات و آراء سے رجوع کرنا کبھی بھی پسند نہیں کیا۔

یہ خود نوشت فی الواقع زندگی کے آخری مرحلے میں جب کہ اس کے مؤلف کی عمر اٹھہتر سال سے بھی کچھ ماہ زیادہ ہو گئی تھی تحریر کی گئی۔ اس وقت اس کے مؤلف دنیا کی ہنگامہ آرائیوں اور چہل پہل سے کنارہ کش ہو کر گمنامی اور گوشہ نشینی کی زندگی گذار رہے تھے۔ سیاست، معاشرت اور معاش کے میدانوں میں انتہائی سرگرم زندگی گذارنے کے بعد یہ تقریباً اس حقیقت کا غماز تھا کہ مؤلف مختلف نوع کی مخالفتوں کا بہادری سے مقابلہ کرنے کا عزم اور حوصلہ کھو بیٹھے ہیں اور اندرونی طور سے سخت تصادم اور کشمکش سے دوچار ہیں۔ چنانچہ ایک طویل خاموشی اور سکوت کے بعد اپنی سوانح حیات تحریر کرنے کا مقصد اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے دل میں موجود کڑھن اور

---

[1] ایضاً ص ۱۶۰ ،

خلش کو لوگوں کے سامنے پیش کرکے اپنا غم غلط کرنا چاہتے تھے اور اس طرح مختلف حادثات و واقعات کی تفصیلات پیش کرکے اپنے اصلاحی رول کی وضاحت کرنا چاہتے تھے۔ اس ضمن میں دوسرے لوگوں کے بھی رول کی وضاحت اور اس پر نقد کرنا چاہتے تھے۔

مؤلف نے اس کتاب کو مختلف چھوٹے چھوٹے مقالوں میں تقسیم کیا ہے اور ہر مقالے میں زندگی کے ایک مرحلے کے بارے میں گفتگو کی ہے۔ انھوں نے اپنے مقالات میں سے ایک دوسرے کو "فصل" کا نام دیکر الگ کیا ہے۔ سوانحی مقالات کل دس ہیں آخر میں تعدد ازدواج سے متعلق ایک مقالے کا اضافہ ہے۔ اس طرح کل گیارہ مقالات ہو جاتے ہیں۔ ان تمام مقالات کے مجموعے سے خود نوشت کی ترکیب عمل میں آتی ہے۔ ان مقالات کا ایک اہم وصف یہ ہے کہ مؤلف کی زندگی میں جس تدریج اور ترکیب سے پیش آئے اسیطرح نقل کئے گئے ہیں۔ اس طرح کسی حد تک اس خود نوشت کے اجزاء کے مابین رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس خود نوشت کا اسلوب مقالہ نگاری کے اسلوب سے قریب ہے۔ اسکے مؤلف عبدالعزیز فہمی اپنے دوست احمد لطفی السید کی طرح مقالہ نگاری میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ اس کے ذریعہ انھوں نے اپنے افکار و خیالات کو تحلیل و تجزیہ اور شرح و ربط کے ساتھ لوگوں کے سامنے پیش کیا۔[1] اس اسلوب سے بچپن سے لیکر بڑھاپے تک کے حالات زندگی، تجربات اور انکشافات بتدریج پیش کرنے میں بے انتہا مدد ملتی ہے۔ اسمیں واقعات کے درمیان زمنی ترتیب اور تدریج کے علاوہ وحدت اور یگانگت پیدا کرنے کی اور کوئی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ اس لئے فوت نما سلک، فنی وحدت اور ربط کی کمی معلوم ہوتی ہے۔ بیچ بیچ میں استطراد کی بھی بھرمار ہے اور یہ میلان ہر جگہ کام کرتا نظر آرہا ہے کہ زیادہ سے زیادہ خارجی احوال بیان کر دیئے جائیں۔ البتہ مؤلف اس بات کے لئے

---

[1] احمد حسن زیات ـــ وحی الرسالہ، ۲ ص ۱۲-۱۳،

پوری طرح یکسو نظر آتے ہیں کہ ان کا انداز بیان بالکل معروضی ہو۔ اسمیں کہیں غیر شعوری طور پر بھی ذاتیت اور انانیت کا عنصر شامل نہ ہو جائے اور اسکی وجہ سے ان کی کتاب کی وہ شناخت متاثر ہو جائے جو تاریخ نگاری کے اصولوں کو ملحوظ رکھنے کی وجہ سے بنی تھی۔ ان اسباب کی وجہ سے وہ اپنی خود نوشت میں دوسروں کیلئے دلچسپی اور شراکت کی وہ مقدار پیدا نہیں کر سکے جو ایک ادبی شاہکار کا طرۂ امتیاز ہوتا ہے۔ ایک ادبی شاہکار میں اس کا مؤلف شعور و احساس کو برانگیختہ کرنے اور نفس کی گہرائیوں اور رازہائے سربستہ کو پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

مؤلف نے اس بات کی پوری کوشش کی ہے کہ اس کے قارئین اسکی زندگی کے اہم مراحل اور اسمیں پیش آمدہ تغیرات سے واقف ہو جائیں۔ اپنی شخصیت کی تعمیر میں انھوں نے موروثی عوامل کی تفصیلات بہت زیادہ فراہم نہیں کی لیکن ماحول کے اثرات و عوامل کو واضح کیا ہے۔ ماحول میں انھوں نے خاص طور سے تعلیم کے عنصر کا تذکرہ کیا ہے۔ اسکے علاوہ ماحول سے متعلق زیادہ تر تفصیلات ذمہ داریوں، مناصب اور خدمات سے متعلق ہیں۔ ان میں انکا انداز بیان زیادہ تر احتجاج اور معارضہ کا ہے لیکن انداز چیخ و پکار اور ہنگامہ آرائی کے بجائے سنجیدگی اور متانت پر مبنی ہوتا ہے۔ وہ واقعات کی تفصیلات سے راہ فرار کے بجائے ان میں پوری طرح دخیل اور شریک ہونے کی کوشش کرتے ہیں اور ہر جگہ اپنے اصلاحی خیالات کی وضاحت کرتے ہیں تاکہ زندگی کا کوئی پہلو تشنہ اور نامکمل نہ رہ جائے۔

دوسروں کی طرح عبدالعزیز فہمی کا اسلوب بھی ان کی شخصیت اور فکر پر دلیل ہے۔ اسمیں سہولت اور وضاحت پائی جاتی ہے۔ وہ محدود الفاظ کا انتخاب کرتے ہیں تاکہ بلا کم و کاست ان کا مفہوم پوری طرح ادا ہو جائے۔ ان کی تحریروں میں پرسکون مناظرے کا وجود ملتا ہے اسمیں دلائل و براہین

پر اعتماد کیا جاتا ہے۔ وہ "اسلوب قضائی" کے عادی ہو گئے تھے اور اسے پوری عمر استعمال کرتے رہے تھے۔ انھوں نے اپنی فکری شخصیت کی تعمیر اس طور سے کی تھی کہ وہ جانچ پرکھ اور سکون و ٹھہراؤ کے عادی بن سکے۔ چنانچہ یہی مزاج ان کی تحریروں پر غالب آگیا۔[1]

وہ اپنے اسلوب میں لطفی السید کے اسلوب سے بہت مشابہت رکھتے ہیں گرچہ ان کا اسلوب اس حیثیت سے ان کے اسلوب سے بھی مختلف ہے کہ اسمیں عوامی زبان کے الفاظ پر بہت زیادہ اعتماد کیا گیا ہے۔ یہ الفاظ مصری سماج میں رائج تھے۔ وہ دو شخصیتوں کے درمیان مکالمات کو نقل کرتے ہوئے خاص طور سے ان الفاظ کا استعمال کرتے ہیں۔ اس کے برخلاف لطفی السید ایسے فصیح الفاظ کا استعمال کرتے ہیں جو عام لوگوں میں بھی معروف نہیں ہوتے۔ عبدالعزیز فہمی نے ان عوامی الفاظ کو استعمال کرکے اپنی خودنوشت میں بعض ادبی خوبیاں پیدا کردی ہیں۔ وہ واقعات و حادثات کی تصویر کشی میں ان سے مدد لے کر عبارت کے فنی حسن میں بے پناہ اضافہ کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی خودنوشت لطفی السید کی خودنوشت کے بالمقابل زیادہ ادبی خوبیوں کی مالک ہے۔

---

[1] احمد حسن زیات ـ وحی الرسالہ ص ۱۳۔

معی

شوقی ضیف

جدید عرب ادباء اور ناقدین کی فہرست میں ڈاکٹر شوقی ضیف کو مختلف پہلوؤں سے کافی اہمیت حاصل ہے۔ انھوں نے زمانہ طالب علمی ہی سے انشاپردازی کی مشق و ممارست کا آغاز کیا اور بہت جلد اس کی رفعتوں اور بلندیوں تک پہنچ گئے۔ ادب، تاریخ اور تنقید میں کا اختصاص یہ ہے کہ وہ قدیم و جدید افکار و خیالات سے منسلک ہیں۔ وہ شدت پسند اسلامی ادباء اور مغربیت زدہ و تجدد پسند عرب ناقدین کے درمیان اعتدال کی راہ پر گامزن تھے۔ انھوں نے عربی و مغربی دونوں ذرائع سے استفادہ کیا ہے اور دونوں کے مفید اور کارآمد اصول و ضوابط کو اپنی ادبی اور تنقیدی زندگی میں نافذ کر لیا ہے۔ ان کی تصنیفات کا دائرہ بیحد وسیع اور متنوع ہے۔ قرآنیات، تاریخ ادب عربی، تحقیقی نصوص، بلاغت، تذکرہ نگاری، ادبی تنقید اور دیگر ادبی فنون پر ان کی بیش بہا، گرانقدر اور یادگار تالیفات ہیں۔ ادبی تنقید، تاریخ عربی ادب اور تذکرہ نگاری میں تو ان کی امتیازی صلاحیتوں اور انفرادی خصوصیات کا اعتراف ہمیشہ کیا جاتا رہے گا۔ اس وقت ان کی گرانقدر تصنیف "معی"[1] کا تعارف پیش کرنا مقصود ہے۔ یہ فی الواقع ان کی خودنوشت سوانح حیات ہے جدید عرب ادباء میں ڈاکٹر شوقی ضیف واحد ادیب ہیں جنھوں نے "فن خودنوشت نگاری" پر اپنا رسالہ "الترجمة الشخصية"[2] کے عنوان سے تحریر کیا۔ اس میں عربی زبان کے اندر اس فن کے ابتدائی نقوش اور بعد کی کاوشوں پر اجمالی طور سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ آخیر میں دور حاضر کی بعض نمایاں خودنوشت سوانح پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ انھوں نے اس

---

[1] الترجمة الشخصية، دار المعارف ۱۹۸۶ء، [2] ایضاً دار المعارف ۱۹۵۶ء

فن کے اصول و ضوابط اور قابل تقلید نمونوں کے تعارف پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اس کی روشنی میں خود اپنی سوانح حیات لکھنے کا اہم کام انجام دیا۔

اس وقت میرے پاس ان کی سوانح کا جو حصہ موجود ہے اس میں صرف ان کی پیدائش اور تعلیمی زندگی کے تجربات و واقعات کا احاطہ کیا گیا ہے جو ۱۹۴۱ء تک کے احوال پر مشتمل ہے۔ ظاہر ہے مصنف نے بعد کی زندگی کی داستان ضرور قلمبند ہوگی اور یہ کتاب مکمل میں شائع ہوئی ہوگی لیکن افسوس ہے کہ اس تک ہماری رسائی ممکن نہیں ہو سکی۔

یہ کتاب کل آٹھ ابواب پر محیط ہے۔ ان ابواب کو آپ دوسرے سے عدد کے ذریعہ الگ کیا گیا ہے۔ ان کا کوئی عنوان نہیں ہے حتیٰ کہ ان پر "باب" یا "فصل" بھی نہیں لکھا ہے۔ اسی طرح موضوع اور مواد کے اعتبار سے ان کا کوئی اختصاص نہیں ہے۔ شروع کے دو ابواب میں مصنف نے اپنی زندگی، پیدائش، گاؤں، ماحول اور معاشرے پر روشنی ڈالی ہے اور بقیہ چھ ابواب میں اپنی تعلیمی زندگی کے مختلف ادوار سے ہمیں واقف کیا ہے لیکن خاص بات یہ ہے کہ وہ اپنی داستان حیات کے علاوہ بعض دوسرے امور سے متعلق بھی بہت سی اہم اور مفید معلومات بھی فراہم کرتے گئے ہیں۔ خاص طور سے اس وقت کی سیاسی زندگی کا آپ جامع اور مختصر نقشہ پیش کیا ہے۔

شرفی مصنف نے اس خودنوشت میں اپنی ذاتی زندگی کے بارے میں جو کچھ تحریر کیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ان کا گاؤں شہر "دھاٹ" کے قریب آب سرسبز و شاداب مقام پر واقع تھا۔ یہ گاؤں آب وسیع و عریض رقبے میں پھیلا ہوا تھا۔ اور ہر طرح کے قدرتی مناظر سے مالا مال تھا۔ اس کے چاروں طرف لہلہاتے کھیت، شاداب و پرہار

وادیاں، ہرے بھرے باغات اور چھوٹی چھوٹی نہریں تھیں۔ ان کے گھر کے تھوڑے فاصلے پر ایک خوبصورت سی جھیل تھی جہاں دور دراز سے سیاح آکر اس کے فطری مناظر سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ اور مچھلی و پرندوں کا شکار کیا کرتے تھے۔ یہ جھیل چاندنی راتوں میں بہت زیادہ حسین اور دلکش معلوم ہوتی تھی۔ چاندنی کرنوں سے اس کا پانی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے وہ پانی نہیں بلکہ صاف و شفاف بلوری شیشے کا آسمان ہے جو نیچے اتر آیا ہے۔[1]

ان کے گاؤں کے لوگوں کا پیشہ زراعت تھا۔ ان میں زیادہ تر لوگ غریب تھے۔ کچھ متوسط درجے کے بھی تھے۔ بقیہ جاگیرداروں کی تعداد بہت ہی کم تھی۔ گاؤں کے زیادہ تر مکانات گھاس پھوس اور گارہ مٹی کے بنے ہوئے تھے۔ کسانوں کی بڑی تعداد صوم و صلوٰۃ کی پابند تھی۔ ان کی عورتیں حسّاس اور محنتی تھیں۔ وہ صبح سویرے جھیلوں سے بڑے بڑے گھڑوں میں پانی بھر کر لے آتی تھیں۔ پھر جب ان کے شوہر اپنے کھیتوں کی طرف روانہ ہو جاتے تھے تو ان میں کچھ ان کے کاموں میں ہاتھ بٹانے کے لئے ان کے ہمراہ چلی جایا کرتی تھیں۔ اس گاؤں میں غربت عام تھی۔ اس لئے بہت کم لوگوں کے پاس ہل بیل کے علاوہ دوسرے سامان ہوا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ دودھ کے واسطے گائے صرف زمیندار قسم کے لوگوں کے پاس ہوا کرتی تھی۔ ان کے مکانات بالعموم دو کمروں پر مشتمل ہوتے تھے اور پورے خاندان کو ان ہی پر گزارا کرنا پڑتا تھا۔ مہمانوں کے لئے ان کے پاس الگ سے کوئی کمرہ، صوفے اور قالین نہیں تھیں۔ ان کے پاس چارپائی اور مسہری نام کی چیز کا کوئی وجود نہیں تھا۔ یہ کھجور کے پتوں یا پیال بچھا کر اس پر سویا کرتے تھے۔ ان کا معمول یہ تھا کہ یہ مغرب سے عشاء تک کا وقت بالعموم اپنے اہل و عیال کے ساتھ گزارتے تھے۔ نماز عشاء سے فراغت کے بعد یہ رات کا

[1] معی ـــ شوقی ضیف ص ۷۰۸،

کھانا کھایا کرتے تھے۔ یہ کھانے میں زیادہ تر مچھلی اور چاول کا استعمال کرتے تھے۔ گاؤں میں بجلی کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ روشنی کے واسطے یہ لوگ مٹی کا چراغ جلایا کرتے تھے اور پھر بہت جلد اسے بجھا کر نیند کی آغوش میں چلے جایا کرتے تھے۔ پوری رات تاریکی میں بسر ہوتی تھی۔ ہر طرف سکون ہوتا تھا۔ صبح مرغے کی بانگ سے لوگ بیدار ہوتے تھے۔ اور مسجد کی طرف روانہ ہو جایا کرتے تھے۔ غریب و افلاس کے باوجود ان کے چہروں پر تازگی اور مسرت ہوتی تھی۔ یہ امید و بیم کی زندگی بسر کرتے تھے اور ایسی زندگی بلاشبہ سرور بخش، فرحت انگیز اور جاذب نظر ہوتی ہے۔ گاؤں کی ان افلاس زدہ عوام کی عورتوں کا حال یہ تھا کہ وہ شہروں کے متمول خاندانوں کی عورتوں کے بالمقابل زیادہ تر و تازہ، چاق و چوبند اور نکھری ہوئی ہوتی تھیں۔ ان کے یہاں بناوٹ اور نمائش پرستی نہیں تھی۔ اپنے سادہ اور صاف ستھرے لباس میں وہ فطری حسن و جمال سے مکمل طور سے آراستہ معلوم ہوتی تھیں۔[1]

شوقی ضیف اس گاؤں کے اسی خاندان میں ۱۹۱۰ء میں پیدا ہوئے۔ ان کی پیدائش سے ان کے والدین کو بیحد خوشی ہوئی۔ کیونکہ اس سے قبل ان کے دو بھائی اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ اس وجہ سے ان کی والدہ ان کا بیحد خیال رکھتی تھیں اور ہر طرح سے ان پر شفقت اور محبت نچھاور کرتی تھیں۔ یہ اپنے فرمانبردار، اطاعت شعار اور سمجھدار خاتون تھیں۔ یہ ضعیف اور کمزور عورتوں کا بہت زیادہ خیال کرتی تھیں۔ ان کے رحم، مروت اور انسان دوستی کے بعض جذبات شوقی ضیف کو بھی بطور وراثت منتقل ہو گئے تھے۔ ان کے والدین کے تعلقات خوشگوار اور مستحکم تھے۔ چونکہ ان کی والدہ ان کو ضرورت کے بقدر دودھ نہیں پلا پاتی تھیں اس لئے انھیں گاؤں کی ایک دوسری خاتون کے حوالہ کر دیا گیا

---

[1] شوقی ضیف — معی ص ۱۲-۸،

جو انھیں روزانہ پابندی سے دودھ پلانے آیا کرتی تھیں۔ ان کے والد دمیاط شہر کے ایک ازہری اسکول سے فارغ التحصیل تھے۔ لیکن انھوں نے اپنے دینی علم کی بنیاد پر کوئی نوکری کرنا پسند نہیں کیا۔ اس لئے گاؤں واپس آکر اپنے مختصر سے قطعۂ اراضی پر اکتفا کیا۔ پورے گاؤں کے لوگ ان کی بیحد قدر اور عزت کرتے تھے۔ وہ مغرب اور عشاء کے درمیان کبھی کبھی دینی دروس کا اہتمام کرتے تھے۔ اس کے علاوہ گاؤں والوں کی فلاح و بہبود کے لئے بہت سے دوسرے کام بغیر کسی اجر و انعام کی لالچ کے انجام دیتے تھے۔ ان کے والدین ہر وقت ذکر و فکر میں مشغول رہتے تھے۔ والدہ اکثر و بیشتر اپنے ہاتھ میں تسبیح لئے رہتی تھیں اور والد صاحب نماز کے بعد دیر تک تسبیح و تحمید کرتے تھے۔ جب انھیں فرصت ملتی وہ تسکین قلب کے لئے کلام الٰہی کی تلاوت کرنے لگتے تھے۔ اس طرح کے دینی ماحول میں شوقی ضیف کی پرورش ہوئی۔ ظاہر ہے اس کے اثرات ان کی تربیت میں لازمی طور سے مرتب ہوئے۔ خدا کا نام تو ان کے سینے پر نقش ہو کر رہ گیا تھا۔ اسی طرح والدین اور رضاعی ماں و بہن کی خیر پسندی، محبت اور الفت کا بھی ان پر اثر پڑا چنانچہ یہ حسد، کینہ، عداوت اور بغض سے طبعاً بہت زیادہ دور ہو گئے تھے۔[1] وہ اپنے والدین کا بہت زیادہ احترام کرتے تھے۔ مصری گاؤں کی روایات کے مطابق وہ صبح سویرے ان کے ہاتھوں کا بوسہ لیتے تھے۔ اس روایت کے بارے میں ان کا یہ خیال ہے کہ اس سے مصر کے معاشرتی نظام میں والدین کا احترام و تکریم باقی تھا۔ لیکن جب سے مغربی اثرات کی بدولت اس روایت میں کمی واقع ہوئی یہ احترام بھی دن بدن ختم ہوتا جا رہا ہے۔[2]

ان کے گھر سے تھوڑے سے فاصلے پر ان کے دادا کا ایک فارم تھا۔ جس کے

---

[1] ایضاً ص ۱۲-۱۳ ، [2] ایضاً ص ۱۵ ،

چاروں طرف کھجور، انار، شہتوت اور انجیر وغیرہ کے درخت تھے۔ وہ ان درختوں کے نیچے گھنٹوں بیٹھتے اور آفتاب کے طلوع و غروب کا منظر بڑے شوق سے دیکھتے۔ وہیں مویشیوں کے تھن سے نکالا گیا تازہ دودھ بھی پیا کرتے۔ گاؤں کے بیشتر لڑکے ایسا ہی کیا کرتے تھے۔ گرمی کی چاندنی راتوں میں وہ گھر کی چھت پر چلے جایا کرتے جہاں سے قریب ہی واقع جھیل کا پُرکشش منظر دیکھتے۔ چاندنی رات میں جھیل کا منظر بڑا دلکش اور خوشنما معلوم ہوتا تھا۔ اسی طرح ان کے گھر کے بالکل سامنے آب تالاب تھا۔ جہاں گاؤں کی لڑکیاں اپنے گھروں کے کپڑے دھونے آیا کرتی تھیں اور تیز آواز میں ہنسی مذاق کیا کرتی تھیں۔ ان کو یہ منظر بہت اچھا لگتا تھا۔ وہ بچپن میں اپنی بہن کیا کو اکثر کھیتوں کی طرف کھیلنے اور ٹہلنے پھرنے کے لئے چلے جایا کرتے تھے۔ اس سلسلے کی بہت ساری باتیں اور یادیں انھوں نے اپنی آپ بیتی میں جمع کر دی ہیں۔[1]

مصر کے دوسرے دیہاتوں کی طرح شوقی ضیف کے گاؤں میں ڈھو یا آب مدرسہ تھا۔ یہاں قرآن مجید کی قراءت اور عربی کتابت کے علاوہ ریاضی اور سائنس وغیرہ کی بھی تھوڑی بہت تعلیم دی جاتی تھی۔ یہاں گاؤں کے تمام بچوں کو بلا تفریق تعلیم حاصل کرنے کے یکساں مواقع فراہم تھے۔ ذہین اور باصلاحیت بچوں کو بعض اوقات اعلیٰ تعلیم کے لئے دمیاط شہر بھیج دیا کرتے تھے۔ مدرسے کا نظام مخلوط تھا اور بچوں بچیوں کے درمیان مقابلے کی کیفیت رہتی تھی۔ بچیاں بالعموم املا لکھنے میں بچوں سے آگے ہوا کرتی تھیں اور بچے ریاضی اور سائنس میں ان سے آگے تھے۔ مدرسے کا ماحول بھی خوشگوار تھا۔ اساتذہ اپنے شاگردوں سے بالعموم شفقت و محبت سے پیش آتے تھے۔ وہ ریاضی کے علاوہ دیگر مضامین میں بچوں کی

[1] ایضاً ص ۱۸-۱۵

غلطیوں سے بالعموم صرف نظر کر لیا کرتے تھے۔ گاؤں میں لڑکوں اور لڑکیوں سے ہٹ کر آپس مقابلہ دو خاندانوں کے درمیان ہی ہوتا تھا۔ گاؤں کے اندر آپس ہی درجے کے دو خاندان زندگی کے ہر معاملے میں اپنے مدمقابل سے آگے نکلنے کی کوشش کرتے۔ یہ مقابلہ تعلیم کے میدان میں بھی تھا۔ گویا یہ دیکھنا ہوتا تھا کہ کس خاندان کا بچہ قرآن مجید ختم کرنے یا دیگر مضامین میں سبقت لے جاتا ہے۔ اس مسابقت کا آپس فائدہ یہ تھا کہ بچے تعلیم میں محنت کرتے اور آپس دوسرے سے آگے نکلنے کی ہر ممکن کوشش کرتے۔ اس مدرسے کی موجودگی کا آپس فائدہ یہ بھی تھا کہ اس سے گاؤں کے امیر غریب گھرانوں کے بچوں میں میل جول اور الفت و محبت پیدا ہوتی تھی جس کے اثرات بڑے دور رس ہوتے تھے۔ گاؤں کے لوگوں میں آپس دوسرے کا ادب و احترام اور قدر و منزلت کا جو شعور پایا جاتا تھا اس میں اس مدرسے کا بڑا دخل تھا۔[1]

شوقی ضیف کو اپنے والدین کی طرف سے بہت زیادہ پابندیوں یا سختیوں کا سامنا نہیں تھا۔ انھیں گاؤں کے لڑکوں کے ساتھ کھیلنے اور گھومنے پھرنے کے پورے مواقع حاصل تھے۔ چنانچہ وہ بچپن کی تمام سرگرمیوں میں برابر حصہ لیتے رہے۔ انھیں درختوں پر چڑھنے کا بہت شوق تھا۔ جب کبھی ان کو موقع ملتا اپنے دوستوں کے ساتھ باغات کی طرف نکل جاتے اور پیڑوں پر چڑھ کر کھجور توڑا کرتے تھے۔ ان کے لئے انجیر کے درختوں پر چڑھنا زیادہ آسان تھا۔ درختوں پر چڑھ کر اپنے ہاتھوں سے پھل توڑ کر کھانے میں انھیں بہت لطف آتا تھا۔ انھوں نے شہری زندگی سے متعلق اپنے اس احساس کا اظہار کیا ہے کہ وہاں دیہاتوں جیسے پھل اور پھول میسر نہیں ہیں۔ دیہاتوں میں موجود پھلوں اور پھولوں کے اندر جو تازگی، حلاوت اور

---

[1] ایضاً ص ۱۸-۱۹، ص ۲۸-۲۹،

شادابی ہوتی ہے وہ شہری تعقید اور مصنوعی فضا میں ممکن نہیں ہے۔ گاؤں میں انھیں کسانوں کو اپنے کھیتوں میں ہل چلاتے، بیج بوتے اور آب پاشی کرتے دیکھ کر خوشی ہوتی تھی۔ وہ چونکہ تیراکی سے واقف نہیں تھے اس لئے گاؤں کے لڑکوں کے ساتھ تالاب یا نہر میں نہانے سے ہمیشہ گریز کرتے تھے۔ وہ تیرنا سیکھنا بھی نہیں چاہتے تھے کیونکہ انھی بہتی لہروں آب تلخ تجربے سے دوچار ہو چکے تھے۔ اسی طرح انھیں کتوں سے بھی بہت ڈر لگتا تھا۔ ان کے بھونکنے کی آواز سن کر ان کی رگوں کا خون منجمد ہو جاتا تھا۔ وہ پرندوں کی چہچہاہٹ، پھولوں کی مہک، کھیتوں کی سرسبزی و شادابی، نہروں اور دریاؤں کی آہستہ روی اور پہاڑوں و جنگلات کی وسعت اور کشادگی الغرض ہر فطری منظر سے بیحد لطف اندوز ہوتے تھے۔ اس طرح کے قدرتی مناظر کے درمیان انھیں پروان چڑھنے اور شب و روز گزارنے کا موقع ملا۔ اس کے باعث ان کا ادبی ذوق نشاونما پانے لگا۔ وہ گھنٹوں طلوع آفتاب کے وقت اس کی کرنوں کو درختوں پر پھیلتے ہوئے اور اسکی وجہ سے شبنم کے قطروں کو چمکتے اور دمکتے ہوئے دیکھتے رہتے تھے۔[1]

ڈاکٹر شوقی ضیف کی پرورش اسی طرح کے گاؤں اور ماحول میں ہوئی تھی۔ ان کے گھر کے بارے میں یہ وضاحت پہلے ہی آچکی ہے کہ اس میں دینداری، تقویٰ اور علم و فن کا رواج عام تھا۔ ان کے والد کے پاس فقہ، حدیث وغیرہ پر مشتمل ایک ذاتی لائبریری تھی۔ ان کے دادا بھی ایک بڑے عالم تھے۔ اس دینی اور علمی ماحول کا ان کے اوپر لازمی طور سے اثر پڑا۔ وہ اسلام اور اس کے پیغمبرؐ کی محبت اور عقیدت سے سرشار تھے۔ ان کے والد کی لائبریری میں بعض دینی اور تاریخی کتابیں بھی تھیں۔ وہ ابتدائی عمر ہی سے کبھی دینی کتابوں

---

[1] ایضاً ص ۲۳-۲۰ ،

کی طرف حسرت اور تعجب کی نظر سے دیکھتے تھے تو کبھی ادبی و تاریخی کتابوں کی طرف۔[1]

ان کی والدہ محترمہ نے اپنے عمل اور کردار کے علاوہ اپنے اقوال، نصائح اور حکایتوں سے ان کی بہترین تربیت کی تھی۔ وہ ان کے سامنے اکثر اپنے والد کا ذکر کیا کرتی تھیں اور ان سے متعلق ایسے واقعات سناتی تھیں جن میں حکمت اور نصیحت کا پہلو پوشیدہ ہوا کرتا تھا۔ ان کے والد حق گو، انصاف پسند، جری اور نڈر انسان تھے۔ ان کی جرأت، بہادری اور حق گوئی کی وجہ سے بڑے بڑے حکام ان کا اعتماد حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان سے متعلق متعدد واقعات کے بار بار سننے کا اثر یہ ہوا کہ وہ خود بھی حق گو اور انصاف کے علمبردار بن گئے اور ہمیشہ ان تقاضوں کو ملحوظ رکھا۔[2]

ان کی والدہ کی طرح ان کی دادی نے بھی ان کی تربیت میں نمایاں رول ادا کیا۔ وہ آپ مذہبی اور نیک خاتون تھیں۔ انھوں نے ان کی عادات و اطوار اور اخلاق و کردار کے سنوارنے پر پوری توجہ دی۔ اس مقصد کے لئے وہ ان کو انبیاء کرام، اسلامی فتوحات اور عدل پسند بادشاہوں کے واقعات سنایا کرتی تھیں۔ جن میں نصیحت کے بہت سے پہلو پوشیدہ ہوتے تھے۔ وہ ان واقعات کو دلچسپی سے سنا کرتے تھے اور ان کا اثر قبول کیا کرتے تھے۔ اسطرح کے کئی آپ واقعات تحریر کرنے اور ان سے حاصل کردہ اسباق کی طرف توجہ دلانے کے بعد وہ زور دیکر کہتے ہیں کہ دور حاضر کی ماؤں کو اسی انداز پر اپنے بچوں کی تربیت کرنی چاہئے۔ اس تربیت کے اثرات تاحیات باقی رہتے ہیں۔ وہ اپنی دادی کے علم و حکمت سے لبریز واقعات کے علاوہ بعض دوسرے واقعات بھی نقل کرتے ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر تعلق بھوت پریت اور جن و شیطان سے ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی دادی بھی اور ملک کی ماؤں کی طرح بچوں کو ڈرانے دھمکانے

[1] ایضاً ص ۲۰-۲۳، ص ۱۴، [2] ایضاً ص ۲۵-۲۸،

کی غرض سے اسطرح کے من گھڑت اور چٹپٹے واقعات کا سہارا لیتی تھیں۔ ان واقعات کے اثرات شاید وقتی طور سے بہتر ہوتے ہوں لیکن مستقل طور سے یہ منفی نوعیت کے حامل ہوتے ہیں۔ شوقی ضیف نے خود لکھا ہے کہ بہت دنوں تک ان قصوں کے مضر اثرات سے اپنے آپ کو آزاد نہیں کر سکے۔[1]

والدین نے انھیں کم عمری ہی میں گاؤں کے اسکول میں داخل کر دیا۔ وہ روزانہ پابندی سے اسکول جایا کرتے تھے۔ مقابلے کا جو ماحول اسکول اور گاؤں تھا اس کا تھوڑا سا احساس انھیں بچپن ہی میں ہو گیا تھا۔ اس مقابلے کے بڑے فائدے تھے۔ جو شخص جس میدان میں ہوتا تھا سخت محنت کرتا تھا۔ مرد کھیتی باڑی میں، عورتیں گھر کے کام کاج میں اور بچے تعلیم میں آپس دوسرے سے آگے بڑھنے کی دھن میں لگے ہوئے تھے۔ شوقی ضیف کے اندر بھی ابتدا ہی سے اپنے مقابل خاندان کے بچوں سے آگے رہنے کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔ وہ جب تک گاؤں کے ابتدائی مدرسے میں زیر تعلیم رہے ہمیشہ اپنے ساتھیوں سے آگے رہے۔[2] گاؤں میں تعلیم کا معقول نظم نہ ہونے کی وجہ سے ان کے والد انھیں لے کر دمیاط شہر منتقل ہو گئے۔ یہاں انھوں نے کرایہ پر آپ مکان لیا۔ ان کی یہ خواہش تھی کہ ان کا لڑکا جامعہ ازہر کا آپ بڑا عالم بن کر مسند درس پر متمکن ہو۔ انھوں نے سب سے پہلے حفظ قرآن کے لئے آپ مدرسے میں داخل کر دیا۔ اس میں دمیاط شہر کے آپ مشہور و معروف قاری تدریس و تحفیظ کی ذمہ داری انجام دے رہے تھے۔ شوقی ضیف نے چند دنوں کے اندر ان پر یہ بات ثابت کر دی کہ وہ بیحد ذہین اور تیز طالب علم ہیں چنانچہ استاد ان کو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ سبق دیا کرتے تھے اور وہ اسے بہت جلد یاد کر کے سنا دیا کرتے تھے۔ وہ اپنے درجے میں تمام ساتھیوں سے چھوٹے تھے۔ اپنی محنت، لگن اور دلچسپی

---

[1] ایضاً ص ۲۵-۲۸ ، [2] ایضاً ص ۲۸ ،

کی وجہ سے انھیں کبھی اپنے استاد کی ڈانٹ پھٹکار کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ جب کہ ان کے دوسرے ساتھی ان سے ہمیشہ خوفزدہ رہتے تھے۔ انھوں نے صرف دس سال کی عمر میں قرآن مجید کا حفظ مکمل کر لیا اور کچھ ہی دنوں بعد تجوید بھی سیکھ لی۔ اس سے علاقے میں آپ بہترین مثال قائم ہوئی۔[1]

حفظ قرآن اور تجوید کی تعلیم کے بعد شوقی ضیف نے معہد دینی میں داخلہ لے لیا۔ یہ ۱۹۱۹ء کی بات ہے۔ سیاسی اعتبار سے یہ آپ پر آشوب دور تھا۔ ان اضطراب انگیز حالات سے ان کا مدرسہ بھی دوچار تھا۔ تقریباً پورا سال مظاہروں اور ہنگاموں کی نذر ہو گیا۔ وقت کی مناسبت سے ان کا سب سے بہترین مشغلہ اخبارات و جرائد کا مطالعہ تھا۔ نئے تعلیمی سال کے آغاز کے بعد ان کا سب سے بہترین مشغلہ اخبارات و جرائد کا مطالعہ تھا۔ اس کے بعد آگے کے کلاس میں داخل ہوئے اور ادب و لغت اور نحو و صرف کی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ ان کے اسکول میں نحو و صرف کی تدریس کا جو طریقہ رائج تھا اس سے انھیں کافی فائدہ ہوا اور بہت جلد وہ تمام ضروری معلومات اور مسائل سے واقف ہو گئے۔ انھوں نے اس طرز تدریس پر روشنی ڈالتے ہوئے موجودہ طرز تدریس کے بالمقابل اس کی افادیت کو ثابت کیا ہے اور جدید طرز تعلیم میں بعض نقائص کی طرف واضح اشارہ کیا ہے۔[2]

انھوں نے معہد دینی میں کل چار سال کا نصاب مکمل کیا۔ نصابی کتب کے علاوہ وہ اخبارات و رسائل میں شائع ہونے والے تحقیقی و تنقیدی مقالات کا پابندی سے مطالعہ کرتے رہتے تھے۔ اس زمانے کے اخبارات میں ادبی موضوعات کے لئے بعض کالم مخصوص ہوتے تھے۔ ان میں اس دور کے ممتاز ادباء مثلاً ڈاکٹر طٰہٰ حسین، محمد حسین ہیکل اور عباس محمود عقاد وغیرہ

---

[1] ایضاً ص ۳۸-۳۹ ، [2] ایضاً ص ۴۶-۴۷، ۵۳ — ۶۹

اپنے تنقیدی نظریات پیش کرتے تھے۔ ان کی تحریروں سے وہ بہت زیادہ متاثر تھے۔ "معہد دینی" کے تیسرے سال میں انھوں نے اور کتابوں کے علاوہ ابن ہشام کی "کتاب مغنی اللبیب عن کتب الأعاریب" کا مطالعہ کیا۔ نحو کے موضوع پر یہ کتاب ان کو بہت پسند آئی۔ اس سے انھیں آپ عام فہم اور مفید نحوی کتاب کی تصنیف کا خیال پیدا ہوا۔ نحو کے علاوہ فقہ، اصول فقہ اور دیگر علوم سے متعلق کتابیں بھی زیر مطالعہ رہیں[1]۔

۱۹۲۵ء / ۱۹۲۶ء کا تعلیمی سال معہد دینی کا آخری سال تھا۔ سیاسی ہنگامہ آرائی اور اضل چہل حسب سابق جاری تھی۔ وہ اپنے اسکول کے آزاد اور علمی ماحول میں حصول علم میں منہمک تھے۔ ان کے اساتذہ، طلبہ سے بہت قریب اور مانوس تھے۔ دوران درس طلبہ ان سے سوال کرنے میں بالکل نہیں جھجکتے تھے۔ شوقی ضیف اپنا سبق اور آموختہ یاد کرکے اسکول آیا کرتے تھے۔ سبق کی پوری تیاری کی وجہ سے اساتذہ سے مختلف مسائل میں لمبی بحثیں ہوجایا کرتی تھیں۔ اس اسکول کی تعلیم کا آپ مقصد طلبہ میں مناظرانہ صلاحیت پیدا کرنا ہی تھا۔ چنانچہ اساتذہ سے بحث و تکرار پر اظہار تکدر نہیں کیا جاتا تھا۔ بعض اہم فقہی مسائل میں حصہ لینے کی وجہ سے ان پر ان مناظروں کی اہمیت واضح ہوئی۔ پھر وہ برابر ان میں حصہ لیا کرتے۔ اس کی وجہ سے ان کی علمی و فکری سطح میں بلندی اور استدلال کی قوت میں پختگی پیدا ہوئی[2]۔

دمیاط شہر میں قیام کے دوران اپنے گھر میں واقع آپ لبنانی تاجر کی دوکان سے ان کا برابر رابطہ تھا۔ اس دوکان میں لبنان سے شائع ہونے والے بعض ادبی اخبارات و رسائل آیا کرتے تھے۔ وہ انھیں آپ دو روز کے لئے اپنے گھر لے جاتے اور پھر ان کا مطالعہ کرکے انھیں واپس کر دیتے۔ ان سے انھیں عربی زبان و ادب سے متعلق مغرب میں

---

[1] ایضاً ص ۵۷-۵۲، ۶۰ — ۵۸، ۶۳ — ۶۲، [2] ایضاً ص ۷۳-۶۵،

ہونے والی سرگرمیوں سے واقفیت کا موقع ملا۔[1]

دمیاط کے "معہد دینی" سے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ ثانوی تعلیم کے لئے "معہد زقازیق" میں داخل ہوگئے۔ جامعہ ازہر میں داخلہ کے لئے اس ادارہ سے فراغت ضروری تھی۔ چنانچہ وہ دمیاط شہر سے قاہرہ منتقل ہوگئے۔ یہاں بھی مختلف ادبی رسائل کا مطالعہ جاری رکھا۔ اسی دوران طٰہٰ حسین کی کتاب "فی الشعر الجاہلی" شائع ہوئی۔ بعض دوسرے اہم واقعات بھی اسی دوران ہوئے۔ "معہد زقازیق" میں سال اول کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد انھوں نے دوسرے سال میں داخلہ لیا۔ لیکن وہ یہاں کے تعلیمی ماحول سے مطمئن نہیں تھے۔ انھیں جدید عربی ادب اور تنقید سے دلچسپی تھی۔[2] اس کی وجہ سے ان کے دل میں "دارالعلوم" میں داخلہ لینے کا شوق پیدا ہوا۔ کیونکہ بیشتر جدید ادباء اور ناقدین کا اسی ادارے سے تعلق تھا۔ اس ادارے کی تعلیم و تربیت ان کی ادبی و تنقیدی صلاحیتوں کے ابھارنے میں معاون ثابت ہوسکتی تھی۔ اس کی وجہ سے انھوں نے اپنی والدین پسند کے برخلاف اس ادارے میں داخلہ لینے کا عزم صمیم کرلیا۔ لیکن اس میں داخل ہونے کے لئے "مدرسۃ التجہیزیۃ" سے سند عالمیت حاصل کرنا ضروری تھا۔ یہاں علم کلام، فقہ، تفسیر، حدیث، نحو، صرف اور ادب کے ساتھ جدید سائنسی علوم بھی پڑھائے جاتے تھے۔ ان علوم کا پڑھنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ پھر بھی انھوں نے ہمت نہیں ہاری اور ذاتی طور سے تمام مضامین کی تیاری میں منہمک رہے۔ انھیں خاص طور سے طبیعیات، کیمیا اور ریاضی میں دقتیں پیش آئیں۔ تاہم یہ اپنی محنت کے سبب اس کے دوسرے سال میں کامیاب قرار دیئے گئے۔ ۱۹۲۹ء / ۱۹۲۹ء کے تعلیمی سال کی ابتداء میں انھوں نے باقاعدہ طور پر اس اسکول میں داخلہ لے لیا۔ یہ ان کا تیسرا تعلیمی سال تھا۔ اس اسکول کے اساتذہ صرف ملکی کالجوں سے فارغ

---

[1] ایضاً ص ۶۳-۶۲ ، [2] ایضاً ص ۶۵-۶۴

نہیں تھے۔ بلکہ سائنس کے اکثر اساتذہ انگلینڈ اور فرانس کی یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتہ تھے۔ یہ طلبہ کو اسلامی اور مغربی تہذیبوں سے بیک وقت واقف کراتے تھے۔ اس اسکول کا نصاب تعلیم دارالعلوم کے نصاب کو سامنے رکھ کر بنایا گیا تھا۔[1]

قاہرہ میں قیام کے دوران انھیں یہ معلوم ہوا کہ جامعہ ازہر کے بعض اساتذہ نماز فجر کے بعد اپنے علمی وادبی حلقوں میں درس دیا کرتے ہیں۔ اس میں شرکت کے لئے ازہر کا طالب علم ہونے کی کوئی شرط نہیں ہے۔ ہر شخص اس سے استفادہ کر سکتا ہے۔ اس غیر منظم درس میں شرکت کا اہم فائدہ یہ تھا کہ اس میں شریک اگر کوئی شخص اپنے اندر عالمیت کے امتحان میں بیٹھنے کی صلاحیت پالیتا تو اسے اس کی اجازت دے دی جاتی تھی۔ ڈاکٹر شوقی ضیف نے اس غیر سرکاری طریقۂ تعلیم سے استفادہ کیا۔ انھوں نے اس کی بیحد تعریف کی۔ اور اسے بعد میں یورپی یونیورسٹیوں میں رائج مختلف نوعیت کے آزاد کورسز سے مماثل اور مشابہ قرار دیا ہے اور یہ مشورہ دیا ہے کہ اسی طرح کے طریقۂ تعلیم کو عرب ممالک میں پھر سے رائج کرنا چاہئے۔[2]

ملک کے سیاسی حالات کی بدستور ابتری کے باوجود انھوں نے اپنا تعلیمی سال مکمل کر لیا اور "المدرسۃ التجہیزیۃ" کے آخری سال میں داخل ہو گئے۔ انھوں نے ادبی رسائل اور مجلات کے مطالعہ کرنے کا اپنا محبوب مشغلہ برابر جاری رکھا۔ آخری سال میں اور مضامین کے علاوہ قرآن مجید سے بھی خصوصی دلچسپی پیدا ہوئی۔ کیونکہ "مدرسہ تجہیزیہ" کے آخری سال کے نصاب میں قرآن مجید کے بعض اجزاء کی تفسیر بھی شامل تھی۔ اسے شیخ علی حسب اللہ پڑھایا کرتے تھے۔ وہ اکثر بعض آیات کے سمجھنے میں ان سے مدد لیتے تھے۔ شیخ ان کی بعض باتوں اور خیالات کو کافی پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اس دوران انھیں تفسیر بیضاوی اور تفسیر کشاف

---

[1] شوقی ضیف ــ مص ص ۸۰-۸۲ ، [2] ایضاً ص ۸۲-۸۴ ،

کی مدد سے اپنے نصاب میں داخل اجزائے قرآنی کی مدد سے تفسیر لکھنے کا شرف بھی حاصل ہوا۔ یہ ابتدائی زندگی میں تصنیف و تالیف کی ان کی دوسری کوشش تھی لیکن پہلی کی طرح یہ بھی محفوظ نہیں رہ سکی۔[1]

تعلیمی سال کے ختم ہونے سے پہلے انھیں اپنے بعض اساتذہ سے یہ مسرت انگیز خبر موصول ہوئی کہ جامعہ فواد کی فیکلٹی آف آرٹس اب آئندہ سے مدرسہ تجہیزیہ اور جامعہ ازہر کے بعض فضلاء کو شعبۂ عربی میں داخلہ لینے کی اجازت دینے جا رہی ہے تاکہ وہ وہاں اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکیں۔ اس وقت آرٹس فیکلٹی کے ڈین ڈاکٹر طٰہٰ حسین کا یہ خیال بھی تھا کہ قرآن مجید کے بعض حفاظ کو خاص طور سے شعبۂ عربی میں داخلہ دینا چاہئے کیونکہ یہ حفاظ اگر عربی زبان و ادب پر توجہ دیں تو ان کے ذریعہ عربی زبان کے فروغ کا اہم کام انجام پا سکتا ہے۔ اس طرح شعبۂ عربی میں ایسے نوجوانوں کے داخلہ کی راہ ہموار ہوئی جو عربی زبان و ادب کے اسرار و رموز سے اچھی طرح واقف تھے۔ اب انھیں نقد و ادب کے جدید اصولوں سے واقفیت کا موقع مل گیا۔ اس طرح آئندہ بلاشبہ وہ جدید و قدیم کے سنگم ثابت ہوں گے۔ شوقی ضیف نے اس اسکول سے فراغت کے بعد اس یونیورسٹی میں داخل ہونے کا عزم مصمم کر لیا۔ انھیں اس میں کامیابی ملی۔ اور وہ جامعہ ازہر اور تجہیزیہ کے اسی طلبہ میں سے اب تھے جن کا انتخاب نئے تعلیمی سال ۱۹۳۰ء / ۱۹۳۱ء کیلئے ہوا تھا۔[2]

یونیورسٹی میں بی اے کی باقاعدہ تعلیم شروع کرنے سے قبل مدارس سے آنے والے طلبہ کیلئے اب اعدادیہ درجے کا نظم قائم کیا گیا تھا۔ تاکہ وہ جدید یورپی زبانوں سے واقف ہو سکیں۔ انگریزی، فرانسیسی اور جرمنی زبانوں میں سے کوئی دو زبان سیکھنا لازم

---

[1] ایضاً ص ۸۹-۹۱ ، [2] ایضاً ص ۹۱-۹۶ ،

تھا۔ شوقی ضیف نے انگریزی اور فرانسیسی زبانوں کا انتخاب کیا اور ان کے سیکھنے میں خوب محنت کی۔ آٹھ سال کے بعد وہ باقاعدہ طور سے بی اے سال اول میں داخل ہو گئے۔ آرٹس فیکلٹی میں لڑکوں کے ساتھ لڑکیاں بھی زیر تعلیم تھیں۔ اس وقت اس فیکلٹی میں کل سات شعبے تھے اور ہر شعبے کے طالب علم کو پہلے سال کے دوران انگریزی، فرانسیسی، فلسفہ، تاریخ، جغرافیہ، عربی ادب اور دیگر تمام ہی مضامین میں کامیاب ہونا ضروری تھا۔ اس تعلیمی یا تعلیمی سال کے دوران بھی حکومت کی ظالمانہ پالیسیوں کا سلسلہ جاری رہا۔ حکومت وقت نے ڈاکٹر طٰہٰ حسین سے اپنے موقف کی حمایت میں ڈاکٹر طٰہٰ حسین سے۔ لیکن انھوں نے صاف انکار کر دیا۔ اس کی وجہ سے انھیں یونیورسٹی سے وزارت تعلیم منتقل کر دیا گیا۔ ان کی حمایت میں یونیورسٹی کے طلبہ نے ہڑتال کر دی اور وائس چانسلر لطفی السید نے استعفیٰ دے دیا۔[1]

جامعہ ازہر اور تجہیزیہ کے طلبہ کے لئے انگریزی، فرانسیسی اور لاطینی زبانوں کا سیکھنا کافی مشکل ثابت ہوا۔ وہ یہاں کے مغربی ماحول سے بھی سخت پریشان تھے۔ کچھ دوسرے طلبہ ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی یونیورسٹی سے علیحدگی سے بددل ہو گئے۔ ان اسباب کی بنیاد پر اکثر طلبہ بی اے کی تعلیم ادھوری چھوڑ کر دارالعلوم واپس لوٹ گئے لیکن شوقی ضیف نے اپنا ارادہ تبدیل نہیں کیا۔ انھوں نے تمام مضامین کی خوب محنت سے تیاری کی اور امتیازی نمبرات سے پاس ہوئے۔[2]

۱۹۳۲ء / ۱۹۳۳ء کے تعلیمی سال کے دوران انھوں نے عربی ادب کو بی اے آنرس کے لئے منتخب کر لیا۔ یونیورسٹی میں ڈاکٹر طٰہٰ حسین کے جانشین شیخ احمد اسکندری ہوئے تھے۔ وہ بھی اپنے پیشرو کی طرح عربی ادب کے ممتاز محقق تھے۔ ان سے انھیں استفادہ کرنے کا بھرپور موقع ملا۔[3] وہ بی اے کا دوسرا سال مکمل کر کے تیسرے سال میں داخل ہو گئے۔ اس سال

---

[1] ایضاً ص ۹۶-۱۰۱ ، [2] ایضاً ص ۱۰۲-۱۰۱ ، [3] ایضاً ص ۱۰۳

انھیں نحو کی تعلیم کے لئے ڈاکٹر ابراہیم مصطفیٰ سے درس لینے کا موقع ملا۔ انھوں نے کلام عرب کی مدد سے نحوی اصولوں کو عام فہم اور دلنشین انداز میں طلبہ کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی۔ شوقی ضیف اس طریقہ تدریس سے بیحد متاثر ہوئے[1]۔

اسی طرح بلاغت اور تفسیر کے استاد شیخ امین الخولی نے ان کے اوپر اپنی صلاحیت اور مہارت کا بہترین نقش چھوڑا۔ وہ طلبہ کے اندر تنقید اور بحث و مباحثہ کی عادت پیدا کرنا چاہتے تھے اس لئے وہ ان کے اعتراضات کا خندہ پیشانی سے جواب دیا کرتے تھے[2]۔ شوقی ضیف نے فارسی زبان کا علم ڈاکٹر عبدالوہاب عزام سے حاصل کیا۔ وہ یونیورسٹی میں اپنے مضمون کے پہلے مصری استاد تھے۔ انھوں نے فارسی زبان کے مشہور شعراء کا کلام اس خوبصورتی کے ساتھ پڑھایا کہ طلبہ میں اس زبان کا بہترین ذوق پیدا ہو گیا[3]۔ ان کے مشفق اور محبوب اساتذہ میں ڈاکٹر احمد امین بھی شامل تھے[4]۔ وہ اخلاقیات اور مختلف علوم و فنون میں مسلمانوں کی خدمات پر درس دیا کرتے تھے۔ ان لائق و فائق اساتذہ کے شرف تلمذ سے وہ برابر فیضیاب ہوتے رہے۔ یوں تو وہ اپنے مضامین میں کامل یکسوئی اور دلچسپی سے لگے ہوئے تھے لیکن خاص طور سے عربی ادب اور تنقید نگاری سے انھیں زیادہ لگاؤ تھا۔ ان دونوں موضوعات پر انھیں جو کتاب بھی نظر آتی اسے فوراً حاصل کرتے اور بڑے شوق سے اس کا مطالعہ کرتے۔ وہ اخبارات و رسائل میں شائع ہونے والے ادبی و تنقیدی مضامین پر بھی برابر نظر رکھتے تھے۔ رسائل و جرائد میں شائع ہونے والے بعض تنقیدی مضامین ہی کو دیکھ کر انھیں اس میدان میں اترنے کی جرأت ہوئی۔ ان کا سب سے پہلا مقالہ مجلہ "الثقافۃ" میں شائع ہوا جس کے مدیر ڈاکٹر احمد امین تھے اور اس میں مشہور ادباء اور ناقدین کی نگارشات شائع ہوا کرتی تھیں۔ اس مقالے کی اشاعت سے ان کی حوصلہ افزائی ہوئی

---

[1] ایضاً ص ۱۰۲-۱۰۵ ، [2] ایضاً ص ۱۰۵ ، [3] ایضاً ص ۱۰۶ ،
[4] ایضاً ص ۱۰۶-۱۰۸ ،

اور انھوں نے دوسرے جرائد میں لکھنا شروع کر دیا۔[1] ۱۹۳۴ء / ۱۹۳۵ء کے تعلیمی سال کے دوران وہ بی اے کے سال آخر میں آ گئے۔ اس سال انھوں نے درسیات کی طرف پوری توجہ کی۔ وہ اسلامی اور مغربی فلسفہ کے موضوع پر شیخ مصطفیٰ عبدالرزاق کے لکچرس میں پابندی سے شرکت کرتے تھے۔ شیخ نے مغربی اور اسلامی فلسفہ کے مشہور مفکرین کے افکار و خیالات کا بالاستیعاب مطالعہ کیا تھا۔ وہ طلبہ کو دونوں افکار کے اسرار و رموز کی تفہیم کرانے اور دونوں کے معایب و محاسن سے انھیں آگاہ کرنے پر پوری طرح قادر تھے۔ شوقی کو ان سے کافی فائدہ پہنچا۔[2]

اس سال تک کے سیاسی حالات میں تبدیلی آئی اور ڈاکٹر طٰہٰ حسین کو آرٹس فیکلٹی کا ڈین مقرر کر دیا گیا۔ اس خبر سے دوسرے طلبہ کی طرح شوقی ضیف کو بھی بے حد خوشی ہوئی۔ کیونکہ وہ ڈاکٹر موصوف کی علمی و ادبی شخصیت ہی کی وجہ سے یونیورسٹی میں داخل ہوئے تھے۔ اس سال طٰہٰ حسین نے بی اے کے آخری درجے کے سامنے "نقد النثر" اور "موازنۃ بین ابی تمام والبحتری" پر لکچر دینا شروع کیا۔ وہ اپنے لکچرس میں مواد کے ساتھ زبان و بیان کا بھی پورا خیال رکھتے تھے۔ ان کے لکچرس میں سامعین کی تعداد اتنی زیادہ ہوتی کہ کمرے ہونے کی جگہ بھی بمشکل مل پاتی۔ شوقی ضیف کو اپنے استاد سے قریب ہونے کا برابر موقع ملتا گیا۔ وہ ان کے شیریں اور دلکش جملوں کو اکثر دہرایا کرتے تھے۔[3] بی اے فائنل کے تحریری امتحانات کے بعد تقریری امتحان کا نمبر آیا۔ اس میں احمد امین اور طٰہٰ حسین کے علاوہ یونیورسٹی کے دوسرے ماہر اساتذہ کی ایک جماعت بیٹھی تھی۔ اس میں ان سے احمد امین کی "ضحی الاسلام" اور "کتاب الاغانی" سے متعلق کئی سوالات کیے گئے۔ انھوں نے ہر سوال کا تشفی بخش جواب دے دیا۔ اور اس طرح بی اے کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کر لیا۔[4]

---

[1] ایضاً ص ۱۰۸-۱۱۰ ، [2] ایضاً ص ۱۱۲-۱۱۳ ، [3] ایضاً ص ۱۱۳-۱۱۵ ،
[4] ایضاً ص ۱۱۶-۱۱۷ ،

۱۹۳۵ء میں گریجویشن کے امتحانات میں تمام طلبہ سے ان کے نمبرات زیادہ تھے۔ وہ طٰہٰ حسین کے گھر گئے۔ انھوں نے مبارکباد دی۔ پھر خود ہی ادارہ مطبوعات کے ڈائرکٹر کو فون کیا اور یہ امید ظاہر کی کہ ان کے طالب علم کے لئے کوئی جگہ ضرور فراہم کی جائے۔ ڈائرکٹر نے نوکری دینے کا وعدہ کر لیا۔ اس کے بعد طٰہٰ حسین حسب معمول گرمائی تعطیلات گزارنے یورپ چلے گئے۔ چونکہ ملک کی مالی صورتحال بہتر نہیں تھی اس لئے انھیں نوکری نہیں مل سکی[1]۔ انھوں نے شیخ مصطفی عبدالرزاق سے ملاقات کی جن کے ذریعہ مختلف وزراء اور حکام سے تعارف ہوا لیکن بات آگے نہیں بڑھ سکی[2]۔ بہرحال یونیورسٹی کا نیا تعلیمی سال شروع ہو گیا اور شوقی نے ایم اے میں داخلہ لے لیا۔ اس سال آندھی بڑی سا راجے اور اسکی پھر مصری حکومت کے خلاف سخت مظاہرے ہوئے جن سے پوری زندگی معطل ہو کر رہ گئی۔ جب حالات معمول پر آئے اور یونیورسٹی دوبارہ کھل گئی تو شوقی ضیف پھر اپنی تعلیم میں مصروف ہو گئے۔ خوش قسمتی سے اسی دوران انھیں "مجمع اللغۃ العربیۃ" میں محرر کی نوکری مل گئی[3]۔ تعلیمی مصروفیات سے جو کچھ وقت ان کے پاس بچ جاتا اسے "مجمع اللغۃ" کے دفتر میں گزارتے۔ مجمع کے دفتر میں قدیم عربی ادبیات اور شعر و شاعری سے متعلق بہت سی اہم کتابیں موجود تھیں۔ انھوں نے آپ ترتیب کے ساتھ مختلف موضوعات کا مطالعہ شروع کیا اور ضروری معلومات کو چھوٹے چھوٹے کارڈ پر جمع کیا۔ عربی ادب اور تنقید نگاری ان کے پسندیدہ موضوع تھے۔ اسی کے ساتھ انھوں نے مغربی ادب اور تنقید کا بھی مطالعہ کیا۔ شامی امریکہ میں مقیم مہجری ادباء اور شعراء کے مطالعہ پر ان کی توجہ خاص طور سے مرکوز تھی۔ اسطرح انھوں نے ایم اے کا پہلا سال مکمل کیا[4]۔

۱۹۳۶ء / ۱۹۳۷ء کا تعلیمی سال ایم اے کا آخری سال تھا۔ اس سال پہلی بار

---

[1] ایضاً ص ۱۱۸-۱۱۹ ، [2] ایضاً ص ۱۱۹ ، [3] ایضاً ص ۱۲۱ ،
[4] ایضاً ص ۱۲۱-۱۲۲ ،

فیکلٹی کے مختلف شعبوں میں سے کچھ طلبہ کو تدریس کی خصوصی تربیت کے لئے منتخب کیا گیا۔ ان میں شوقی ضیف بھی تھے۔ ان کو اعدادیہ کے طلبہ کی تدریس کی ذمہ داری دی گئی۔ وہ اکثر عربی تنقید پر لکچر دیتے تھے[1]۔ انھوں نے ایم اے کے مقالہ کے لئے کتاب الاغانی میں عربی تنقید نگاری کے مسائل کا موضوع منتخب کیا تھا۔ یہ کتاب ۲۱ جلدوں پر مشتمل ہے۔ انھوں نے ان سب کا بالاستیعاب مطالعہ کیا اور اپنے موضوع سے متعلق معلومات یکجا کیں۔ جنوری ۱۹۳۹ء میں اس مقالے پر مباحثہ ہوا اور ایم اے ڈگری دے دی گئی[2]۔

ایم اے کرنے کے بعد ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے انھیں ڈاکٹریٹ کرنے کا مشورہ دیا۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ ان کا شاگرد چوتھی صدی ہجری میں عربی شاعری کے ارتقاء کو اپنا موضوع تحقیق بنائے۔ تاہم قطعی فیصلہ انھوں نے خود کرنے کے بجائے ان کے حوالہ کر دیا[3]۔ انھوں نے اس موضوع کے سلسلے میں کافی غور و فکر کیا اور اس سے متعلق ضروری مواد کی فراہمی کے امکانات کا جائزہ لیا۔ پھر انھوں نے مجوزہ موضوع میں تھوڑی سی تبدیلی کرتے ہوئے "الفن ومذاهبه فی الشعر العربی" پر اپنا تحقیقی کام شروع کیا۔ انھوں نے ایک سال کے اندر اپنا کام تقریباً مکمل کر لیا۔ ۱۹۴۰ء کے تعلیمی سیشن کے آغاز میں جب ڈاکٹر طٰہٰ حسین یورپ سے واپس آئے تو ان کے سامنے پورا مقالہ پیش کر دیا۔ انھوں نے اس کے ہر باب اور ہر فصل کی تعریف کی اور اسے اپنے موضوع پر بہترین کوشش قرار دیا۔ انھوں نے مقالے کو مزید بہتر بنانے کے لئے مفید مشورے دیئے۔ اس طرح یہ مقالہ مکمل شکل میں پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لئے پیش کر دیا گیا۔ اس پر بحث کے لئے علماء اور محققین کی ایک جماعت مدعو کی گئی تھی۔ عوام کا بھی جم غفیر تھا۔ شوقی ضیف نے اس مقالے کے موضوعات پر مشتمل ایک تقریر کی۔ بحث و مباحثہ کے بعد انھیں پی ایچ ڈی کی ڈگری کا مستحق قرار دیا گیا۔ بعد میں یہ مقالہ ڈاکٹر طٰہٰ حسین کے مقدمے کے ساتھ شائع ہو گیا[4]۔

---

[1] ایضاً ص ۱۲۲-۱۲۳ ، [2] ایضاً ص ۱۲۳-۱۲۶ ، [3] ایضاً ص ۱۲۶-۱۲۷ ،
[4] ایضاً ص ۱۲۸-۱۳۱ ،

کتاب پر ایک تجزیاتی نظر

جیسا کہ اس خود نوشت سوانح حیات کے تعارف کے آغاز ہی میں بتایا جا چکا ہے کہ یہ کتاب اپنے مصنف کی زندگی کی مکمل داستان نہیں ہے۔ یہ صرف ان کے ۱۹۲۱ء تک کے حالات پر مشتمل ہے۔ اس میں اس مختصر سے عرصے کی بھی تمام تفصیلات یکجا نہیں ہو سکی ہیں۔ ابتدائی دو فصلوں میں مصنف نے اپنے بچپن کے حالات کے ساتھ ساتھ گرد و پیش کی دوسری تفصیلات سے مناسب انداز میں تعرض کیا ہے تین بعد کی دوسری فصلوں میں جو تعلیمی زندگی پر مشتمل ہیں، صرف تعلیمی اور سیاسی احوال کا تذکرہ کیا ہے۔ بقیہ اور دوسرے امور جن میں سے بعض کی وضاحت انتہائی ناگزیر تھی، نامعلوم کن اسباب کی بنیاد پر مذکور نہیں ہو سکے۔

اختصار کے باوجود یہ آپ بیتی مصر کی دیہاتی زندگی کی ایک جامع تصویر پیش کرنے میں بڑی حد تک کامیاب نظر آتی ہے۔ دیہات کا فطری ماحول، وہاں کی خوشگوار آب و ہوا، نوع بنوع درختوں کی قطاریں، گندم، جو کے پھولوں کی لہلہاتی کھیتیں، پانی کے صاف و شفاف چشمے، اسی طرح دیہاتیوں کی سادہ اور بے تکلف زندگی، پاکیزہ خیالات، مذہب پسندی، محنت و جفاکشی، ان کی عورتوں کا بے آمیز فطری حسن و جمال، اور خانہ داری کی انجام دہی میں حد سے زیادہ انہماک، مرد کے شانہ بشانہ ان کی سرگرمیوں میں اشتراک اور تعاون اور اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے ان کا نت نئے طریقوں کی ایجاد اور ان کا کامیابی سے نفاذ نیز دیہاتی زندگی کی اہم رسوم و رواج، خوشی اور غم کے مواقع اور وہاں کی دینی و تعلیمی صورتحال الغرض بہت سی مفید اور دلچسپ معلومات اس سوانح کے مطالعہ سے بآسانی حاصل ہو جاتی ہیں۔[1]

---

[1] ایضاً ص ۳۶-۷۔

شوقی ضیف نے اس بات پر خاص طور سے توجہ دی ہے کہ وہ صرف اپنے احوال زندگی کے تذکرہ میں الجھ کر نہ رہ جائیں۔ بلکہ وہ اس کے ساتھ ساتھ اپنے گرد و پیش کا جائزہ بھی لیتے ہیں۔ اور قابل توجہ مقامات پر توقف کرتے اپنے گرانقدر خیالات سے قارئین کو واقف اور آگاہ کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ چنانچہ جہاں وہ آپ طرف اپنے تعلیمی سفر کا ذکر کرتے ہیں وہیں دوسری طرف اسکول، کالجز اور یونیورسٹیز کے تعلیمی ماحول، اساتذہ اور نصاب تعلیم پر روشنی ڈالتے ہیں اور بعض مقامات پر بڑی قیمتی رائوں کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ اپنے گاؤں کے تعلق میں اپنی ابتدائی تعلیم کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے ان حقائق سے بھی پردہ اٹھاتے ہیں کہ یہ تعلق گاؤں کے باگوں کے چندہ سے چلا کرتا تھا۔ اس میں امیر و غریب سب کو یکساں طور سے تعلیم کے مواقع حاصل تھے۔ گاؤں کے گوں میں اپنے بچوں کے عمدہ نتائج سے بیحد دلچسپی ہوتی تھی۔ یہاں کا نظام تعلیم مخلوط تھا۔[1] وغیرہ۔

مصنف نے اپنی آپ بیتی میں اپنی شخصیت کے ارتقا کے تعلق سے ان عوامل اور محرکات کی نشاندہی کی ہے جو وراثت یا ماحول کے ذریعہ ان کے حصے میں آئے تھے۔ چنانچہ وہ اپنے والدین کی مذہب پسندی اور ذکر و فکر میں ان کی ہمہ آن مشغولیت کا تذکرہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں

"بارش اور شبنم کے ان قطرات اور ہوا و خوشبو کے ان جھونکوں کے درمیان یہ بچہ بیل کے مانند بڑھتا اور کھلتا گیا۔ بس اللہ کا نام اس کے ان میں برابر گونجتا رہا بلکہ دل پر نقش ہوتا گیا۔ اس کے ساتھ اس کے اندر اپنے والدین وغیرہ سے الفت میں اضافہ ہوتا گیا۔ یہ اسے اپنے والدین سے وراثت میں ملا تھا۔ یہ دونوں بغض و عداوت سے بہت دور تھے۔ انھوں نے اپنے بچے کی اپنے طور پر تربیت کی۔ آج یہ بچہ کسی سے حسد نہیں کرتا ہے۔"[2]

---

[1] ایضاً ص ۲۹-۱۸ ، [2] ایضاً ص ۱۵-۱۴ ،

ان کی والدہ اور دادی انھیں بچپن میں بعض کہانیاں اور قصے سنایا کرتی تھیں۔ ان قصوں میں سے بیشتر مفید اور مؤثر تھے۔ البتہ بعض کے اثرات کچھ زیادہ اچھے نہیں تھے۔ انھوں نے ان میں سے بعض کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ چنانچہ وہ اپنی والدہ کے آپ قصے کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"ماں نے یہ قصہ اپنے بچے کو بار بار سنایا تھا۔ غالباً اس کا اثر ہے کہ مجھ اپنے افکار و خیالات میں حق گوئی اور صاف گوئی کا پابند ہے۔ وہ کسی سے مداہنت نہیں کرتا اور نہ ہی کسی کی چاپلوسی کرتا ہے۔ یہ آپ ایسا اخلاقی پودا ہے جسے اس کی ماں نے بالکل بچپن میں اس کے دل میں لگا دیا تھا۔"[1]

اسی طرح وہ اپنی دادی کے آپ قصے کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اسی وجہ سے انھوں نے ضد اور ہٹ دھرمی کرنے سے ہمیشہ کے لئے توبہ کر لی تھی۔ اور یہ بھی طے کر لیا تھا کہ وہ کسی شخص سے متعلق کوئی بات معلوم کرنے کی فکر میں نہیں لگے رہیں گے خواہ اس شخص سے ان کا کتنا ہی مضبوط تعلق کیوں نہ ہو۔[2] ان قصوں کے اچھے اثرات کی طرح انھوں نے بعض غلط اثرات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ اپنی دادی کے آپ قصے کے بارے میں وہ لکھتے ہیں۔

"دادی، ماؤں کی اور عورتوں کی طرح اس کہانی کو صحیح سمجھتی تھیں حالانکہ اس کا حقیقت سے دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔ اس طرح کے قصوں کا بچے کے ذہنی ارتقا پر بڑا گہرا اثر مرتب ہوا چنانچہ وہ جن، عفریت، کتے اور بلیوں سے آج بھی خوفزدہ ہے۔"[3]

انھوں نے اس کتاب میں اپنی تربیت کے تعلق سے بعض امور کی طرف ہماری

---

[1] ایضاً ص ۲۴، [2] ایضاً ص ۲۵، [3] ایضاً ص ۲۶،

توجہ خاص طور سے مبذول کی ہے۔ وہ تربیت کے ان طور طریقوں کو زیادہ مؤثر سمجھتے ہیں اسلوب کی آپ دو مثالیں درج ذیل ہیں۔

"والدین مختلف واقعات اور حکایات کے ذریعہ اپنے بچوں کو زندگی کے حقائق سے آگاہ کرتے تھے اور ان کی مناسب رہنمائی اور رہبری کرتے تھے ..... یہ واقعات بچوں کو زبانی یاد ہو جایا کرتے تھے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ بچے اپنے والدین کی زبانی حکمت و موعظت کے وہ گوہر پا جاتے تھے جو آج کے بچے "بچوں کے ادب" کے نام سے موجود قصوں اور کہانیوں میں نہیں پاتے ہیں۔ آج کی ماؤں کو چاہئے کہ وہ اس سے سبق لیں۔"[1]

بچپن میں شوقی ضیف کا معمول تھا کہ وہ صبح سویرے بیدار ہوتے ہی سب سے پہلے اپنے والدین کے دونوں ہاتھوں کا بوسہ لیتے تھے۔ وہ اس روایت کی افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"آج جو یہ دیکھا جا رہا ہے کہ بہت سے بچے اپنے والدین کا کما حقہ احترام نہیں کرتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس پسندیدہ روایت کو چھوڑ دیا گیا ہے۔ اس روایت کا سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ بچوں کی نظر میں والدین کی ذات بے حد مقدس ہو جاتی تھی۔ آج جب کہ یہ روایت متروک ہو چکی ہے تو ان کی نظر میں والدین کا تقدس اور ان کی عظمت شان ہی باقی نہیں رہ گئی ہے۔"[2]

ڈاکٹر شوقی ضیف اپنی اس کتاب میں اپنے تعلیمی سفر کی داستان بیان کرتے ہوئے بعض ایسے اہم تدریسی مسائل اور مشکلات پر بھی لب کشائی کی ہے جنہیں بالعموم لوگ نظر انداز

---

[1] ایضاً ص ۲۵ ، [2] ایضاً ص ۱۵ ،

تر دیا کرتے ہیں۔ اسی طرح یہ کتاب تدریس اور تعلیم کے نقطۂ نظر سے آپ مفید کتاب قرار دی جا سکتی ہے۔ مثلاً وہ کم عمری میں اپنے حفظ قرآن کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"شاید کہ پچھلی صدی میں ہمارے بہت سے متعلمین کا مروجہ دارتقا ان کی اس محنت اور جانفشانی کا مرہون تھا جس کا انھوں نے قرآن مجید حفظ کرکے اپنے آپ کو عادی بنا لیا تھا۔ انھوں نے سعی و جہد کا یہ سلسلہ جاری رکھا۔ یہاں تک کہ ان کی اعلیٰ جامعاتی تعلیم مکمل ہوئی۔"[1]

اسی طرح انھوں نے معہد دینی کے اندر نحو و صرف کی تدریس کے طریقے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ طلبہ کے لئے بہت زیادہ مفید تھا۔ باوجود اس کے کہ جدید طریقہ تعلیم اپنی پشت پر تدریس کا آپ فلسفہ رکھتا ہے اور وہ جدید ذرائع و وسائل سے آراستہ ہے لیکن وہ طلبہ کے ذہن میں نحوی مسائل کو مستحضر کرنے میں بری طرح سے ناکام ہے۔ وہ اپنا تجربہ بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے صرف آپ سال میں نحو کی اتنی استعداد پیدا کر لی تھی کہ ان کے والد جب ان کے سامنے کوئی شعر پیش کرتے تو وہ بلا کسی توقف اور تردد کے اس پر اعراب لگا دیا کرتے تھے۔[2]

جابجا از ہر کے نصاب تعلیم میں مختلف متون، حواشی اور شروح کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ ان سے ازہری طلبہ کی ذہنی، فکری اور عقلی نشاونما میں بڑی مدد ملتی تھی۔ گرچہ اس طریقہ تدریس پر خواہ کتنی ہی تنقید کی جائے یہ آپ حقیقت ہے کہ بزرگوں نے بحث و جدال کے اس طرز پر تعلیم حاصل کرکے بڑے نمایاں کارنامے انجام دیئے تھے۔ اس سے عرب اور عالم اسلام میں عقلی و فکری بالیدگی کو کافی تقویت ملی۔[3]

---

[1] ایضاً ص ۴۲ ، [2] ایضاً ص ۵۳-۵۰ ، [3] ایضاً ص ۶۸-۶۶ ،

ڈاکٹر شوقی ضیف نے جامعہ ازہر کے آزاد تعلیمی حلقوں سے فائدہ اٹھایا تھا۔

وہ آپ بہترین سلسلۂ تدریس سے اپنے آپ کو مستفید تصور کرتے ہیں۔ ان کا یہ خیال ہے کہ یورپ کی بعض یونیورسٹیوں میں رائج آزاد تعلیمی نظام (Open Education system) کا تصور یہیں سے ماخوذ اور مستفاد ہے۔ وہ زور دے کر کہتے ہیں کہ جامعہ ازہر کے طلبہ میں اس طرز تعلیم سے جو استعداد پیدا ہو جاتی تھی وہ آج یہیں نظر نہیں آتی۔ اس پر لوگوں کو غور کرنا چاہئے اور مناسب اقدامات کرنے چاہئے۔[1]

یوں تو اس کتاب کا بیشتر حصہ سیاسی اور تعلیمی معلومات سے لبریز ہے اس کی وجہ سے اس میں قدرتی مناظر کی تصویر کشی کا معاملہ تقریباً ناپید ہے۔ تاہم کتاب کی ابتدائی دو فصلیں اس کمی کو کسی حد تک پورا کرتی ہیں۔ بلکہ میرا خیال تو یہ ہے کہ یہی دو فصلیں فن خود نوشت کے معیار پر پوری اترتی ہیں اس میں حقائق کا اثبات اور اظہار ہے تو تخیلات کی بھی آپ پوری دنیا آباد ہے۔ اس میں مصنف کی قلبی کیفیات، داخلی کشمکش اور ذاتی تاثرات و مشاہدات کی وافر مقدار بھی موجود ہے اس سلسلے میں بعض اقتباسات بطور دلیل پیش کئے جا رہے ہیں۔

"بچہ ابھی چھ سال کا ہوا تھا کہ وہ پابندی سے اپنے کھیت جانے لگا۔ وہاں فصلوں، پھلوں اور پھولوں پر اس کی نگاہیں جم کر رہ جاتی تھیں۔ سب سے دلکش منظر ان بلند اور مہیب قد و قامت والی کھجوروں کا تھا جو اپنے ہرے بھرے پتوں کو فضا میں اسطرح پھیلائے ہوئے ہوتی تھیں کہ انھیں دیکھ کر ان کے جلال کبریائی اور عظمت کا نقش دل پر قائم ہو جاتا تھا۔"[2]

---

[1] ایضاً ص ۸۲-۸۶ ، [2] ایضاً ص ۱۶ ،

"گاؤں کے باغات، کھیتیاں، اور اس کے قدرتی مناظر نے بچے کے احساس و شعور پر گہرا اثر چھوڑا۔ وہ فطری حسن و جمال کا عاشق ہو گیا تھا اور گاؤں اور اس کے مناظر کی محبت اس کے رگ و پے میں سرایت کر گئی تھی۔"[1]

"شہروں میں جو پھول پائے جاتے ہیں ان میں اور گاؤں میں موجود پھولوں میں بڑا فرق ہے۔ گاؤں کے پھولوں میں تازگی، زندگی اور رونق ہوتی ہے۔ جب کہ شہروں میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان پھولوں کو کہیں سے کاٹ کر یہاں رکھ دیا گیا ہو۔ یہ پھول زندگی اور پھولوں کے مجموعی ماحول سے عاری ہیں۔ یہ منظر اس وقت بڑا خوشنما معلوم ہوتا ہے جب سورج کی شعاعیں ان پر پڑتی ہیں اور ان کے پتوں پر موجود شبنم کے قطرے آبدار موتیوں کے مانند چمکتے ہیں۔"[2]

خالص فنی لحاظ سے اس کتاب کا مطالعہ کرنے سے اس بات کا شدت سے احساس ہوتا ہے کہ مصنف نے زیادہ تر حالات و واقعات کے بیان کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ ان حالات و واقعات کے بارے میں ان کی اپنی قلبی کیفیت اور تاثر کیا ہے؟ اس کی وضاحت اس کتاب میں نہیں ملتی ہے۔ ابتدا کی دو فصلوں میں کسی حد تک اس کمی کا احساس زائل ہوتا نظر آتا ہے لیکن آخری فصلوں میں تو اس کی شدت میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ اکتاہٹ اس وقت ہوتی ہے جب مصنف بار بار اپنے سیاسی احوال کا تجزیہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ خود نوشت کو اپنے زمانے کی سچی تاریخ مان لیا گیا ہے۔ اس پہلو سے اگر سیاسی احوال وغیرہ کا ذکر اگر معتدل اور مناسب مقدار میں ہوتا تو کوئی مضائقہ نہیں تھا لیکن جب یہ بہت زیادہ طویل ہو جائے اور وہ بھی خالص تاریخی رنگ لئے ہوئے ہو اور اس میں

---

[1] ایضاً ص ۲۷ ، [2] ایضاً ص ۲۱-۲۲ ،

مصنف کی داخلی کیفیات کا کوئی عنصر شامل نہ ہو تو اس وقت ظاہر ہے یہ بات قابل اعتراض ہو جائے گی۔ ابتدائی دو فصلوں اور آخری چھ فصلوں کے مابین جب ہم تقابلی مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ ہی طرح کے بعض واقعات جب ابتدائی دو فصلوں میں آئے ہیں تو مصنف نے اپنا دل نکال کر رکھ دیا ہے۔ لیکن ویسے ہی مقامات جب آخری فصلوں میں آئے ہیں تو وہ بالکل خاموش ہیں۔ مثلاً لڑکیوں ہی کا معاملہ لیا جائے۔ کم عمری کے باوجود وہ گاؤں کی زندگی میں ان لڑکیوں کے حسن و جمال، ان کی متحرک رفتاری و نازک اندامی، صبح سویرے ان کا تالاب کی طرف جانا، گھڑوں میں پانی لے کر باتیں کرتے ہوئے واپس آنا اور راستوں میں گیتوں سے گزرتے ہوئے ان کا گنگنانا اور گیت گانا۔ الغرض ان تمام امور کا وہ بہت تفصیل سے نقشہ کھینچتے ہیں۔ اور ان سے اپنے متاثر ہونے کا حال بھی بڑے فخر سے بیان کرتے ہیں[1] لیکن یہی لڑکیاں جب یونیورسٹی میں ان کے ساتھ ہوتی ہیں، ان کے ساتھ ان کا اٹھنا، بیٹھنا، ہنسنا اور بولنا ہوتا ہے تو وہ صرف علمی انداز میں بعض مسائل سے تعرض کرتے ہوئے نکل جاتے ہیں حالانکہ مکان و زمان کا یہ تفاوت تھا کہ وہ ان کے بارے میں اپنی معلومات اور قلبی کیفیات بیان کرتے[2]۔ جو ظاہر ہے سخت تصادم اور کشمکش سے دوچار ہوئی ہوں گی۔

فن خود نوشت کی دوسری شرطیں مثلاً صداقت، صاف گوئی اور معروضی انداز بیان اس سوانح میں وافر مقدار میں پائی جاتی ہیں۔ مصنف نے فخر و غرور سے اپنے طور پر اجتناب کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ حالانکہ تعلیمی زندگی میں انھیں نمایاں کامیابیاں ملی تھیں ان کی وجہ سے یہ اپنے اوپر فخر کرنے کے بجا طور سے مستحق تھے۔ وہ اپنی ان کامیابیوں کا آخر ہر جگہ تذکرہ کرتے ہیں۔ ان کے تعلقات اپنے اساتذہ سے بہت گہرے تھے۔ ان میں سے بعض

---

[1] ایضاً ص ۱۰-۱۱، ص ۱۷، ص ۲۲-۲۳، [2] ایضاً ص ۹۹-۱۰۰

کی حیثیت علم و ادب کی دنیا میں آفتاب و مہتاب سے کم نہ تھی۔ ان اساتذہ اپنے شاگردوں کی بہت زیادہ مدح و ستائش بھی کی تھی لیکن وہ ان سب کا تذکرہ بالکل سرسری انداز میں کر جاتے ہیں اور کہیں بھی توقف کرکے اپنی عظمت شان کے اثبات کی فکر نہیں کرتے۔[1]

صداقت اور صاف گوئی کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے بعض کمزور پہلوؤں کا بغیر کسی کمی اور زیادتی کے تذکرہ کر دیا ہے۔ مثلاً یہی بات کہ انھیں موت ہر وقت کا بہت زیادہ خوف تھا اور انھوں نے اپنے والدین کو اسی خوف کی وجہ سے آبائی مکان چھوڑنے پر مجبور کیا۔ یا یہ بات کہ وہ کتوں کے بھونکنے سے بہت ڈرتے تھے اور تیراکی کے لئے پانی میں داخل ہونا ان کے لئے ممکن نہیں تھا۔[2] ان کے معروضی انداز بیان کی وضاحت اس حقیقت سے بخوبی ہو جاتی ہے کہ سعد زغلول اور پارٹی سے عشق کی حد تک تعلق ہونے کے باوجود جب نحاس پاشا نے اپنے سیاسی مقاصد کے لئے نوجوان نسل کو استعمال کرنا چاہا تو انھوں نے اس پر اپنی سخت ناراضگی کا اظہار کیا ہے۔[3] اسی طرح مصطفی صادق رافعی جن کی ڈاکٹر طٰہٰ حسین اور عباس محمود العقاد سے برابر معرکہ آرائی ہوتی رہتی تھی، کا جب وہ تذکرہ کرتے ہیں تو ان کی علمی و ادبی حیثیت کا پورا اعتراف کرتے ہیں اور ان کی شان کے مطابق الفاظ کا استعمال کرتے ہیں۔[4]

ان سب کے باوجود بعض مقامات پر ان کی مذکورہ حیثیت متاثر ہوئی ہے۔ خاص طور سے طٰہٰ حسین اور سعد زغلول کے بارے میں ان کا انداز بیان بہت جذباتی لگتا ہے۔ وہ سعد زغلول کے ہر عمل اور قول کی تحسین کرتے ہیں اور مصر کی تمام شخصیتوں میں ان کو سب سے اہم اور معزز قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ ان کی شخصیت کے بعض پہلو ایسے بھی تھے جن پر تنقیدی نظر ڈالی جا سکتی تھی۔[5] یہی معاملہ ڈاکٹر طٰہٰ حسین کا بھی ہے۔[6]

---

[1] شوقی ضیف ـ معی ص ۱۰۱-۱۰۲ ، [2] ایضاً ص ۳۹-۴۰ ، [3] ایضاً ص ۱۲۴
[4] ایضاً ص ۵۶ ، [5] ایضاً ص ۱۱۴-۱۱۵ ، [6] ایضاً ص ۷۱ ،

ڈاکٹر شوقی ضیف کا اسلوب تحریر ان کی شخصیت کا ترجمان ہے۔ وہ ادب و تنقید کے آپ مشہور اور ماہر شہسوار ہیں۔ انھوں نے اپنے دور کے ماہر ناقدین اور ادباء سے استفادہ کیا اور ان کے اسلوب کو اپنانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ وہ محمد حسین ہیکل سے ان کے صاف ستھرے اسلوب، عقاد سے ان کی منطق اور صاف گوئی اور طٰہٰ حسین سے ان کی سلاست، سہولت، روانی اور شیرینی کی وجہ سے بیحد متاثر تھے[1]۔ وہ اپنے اسلوب کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے خود لکھتے ہیں:

"یہ آپ مستحکم، سنجیدہ اور مکمل اسلوب ہے۔ مصنف نے الفاظ کے انتخاب اور ان کے استعمال کے صحیح موقع و محل کا اہتمام کیا ہے۔ اس کے ساتھ اس میں تصور کشی اور تخیل سے بھی بھرپور مدد لی گئی ہے۔ مصنف کی یہ خواہش تھی کہ اس کا اسلوب سہل اور رواں ہو۔ اس کا یہ خیال تھا کہ اس کے اسلوب پر حافظ کی کتابوں کا بہت زیادہ مطالعہ کرنے کی وجہ سے اس کے اسلوب کی چھاپ ہے۔ وہ بعض فرانسیسی ناقدین کے اس قول سے متفق تھے کہ اسلوب کسی شخص کا دوسرا نام ہے۔ وہ جب قلم پکڑتے تھے تو یہ اسلوب اس کے ساتھ ہوگا خواہ وہ زندگی کے آخری مرحلہ ہی کیوں نہ ہو۔"[2]

اس اقتباس کی روشنی میں جب ہم ان کی سوانح عمری کا مطالعہ کرتے ہیں تو بلاشبہ اس میں مذکورہ اوصاف موجود پاتے ہیں۔ کتاب کی ہر بات بالکل واضح ہے۔ کہیں کوئی ابہام یا غموض نہیں ہے۔ انداز علمی اور تقریری ہے۔ بعض مقامات پر قرآنی الفاظ اور تراکیب کا استعمال بھی ملتا ہے۔ ان کے اسلوب کے بارے میں سب سے اہم بات یہ کہی جا سکتی ہے کہ یہ

---

[1] شوقی ضیف ــــ معی ص ۵۷، [2] ایضاً ص ۱۱۰،

ڈاکٹر طٰہٰ حسین کے اسلوب تحریر سے مطابقت پیدا کرنے کی آپ بہترین کاوش ہے۔ وہ ان کے معزز استاذ تھے اور ان کی ہر ادا انہیں پسند تھی۔ اس حقیقت سے ہر شخص واقف ہے کہ ڈاکٹر طٰہٰ حسین کا اپنا آپ نرالا اسلوب ہے۔ اس میں بے باکی اور جرأت کے ساتھ ساتھ تسلسل اور حرکت ہے۔ اس میں ان کے مزاج کے ساتھ ساتھ ان کی جسمانی ساخت کا بھی دخل ہے۔ خدا نے بچپن ہی میں ان کی بصارت سلب کر لی تھی[1] لیکن اس کے بدلے میں عظیم بصیرت عطا کی جو عام طور سے عبقری شخصیات کو عطا ہوتی ہے۔ جسم کی آپ طاقت کے ختم ہونے سے آپ دوسری طاقت اجتہاد سامنے آجاتی ہے جس سے بڑی حد تک کھوئی ہوئی طاقت کی تلافی ہو جاتی ہے۔ طٰہٰ حسین اپنی تحریروں میں آپ بات کو مختلف پیرائے میں پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں جس میں اکثر و بیشتر تکرار بھی ہو جاتی ہے لیکن ان کی فنکارانہ صلاحیت اور انوکھے انداز بیان کی وجہ سے تکرار کا پتہ بھی نہیں چلتا۔ اور پڑھنے والے کو آپ ہی وقت میں فکر و فن دونوں کی حرارت محسوس ہوتی ہے۔ شوقی ضیف نے اپنے استاذ کے اسلوب کی نقالی نہیں کی کیونکہ اسکی نقالی ناممکن ہے البتہ الفاظ کا اتار چڑھاؤ اور سلیس ترکیبوں کا استعمال انہوں نے اپنے محبوب استاذ سے اخذ کیا ہے۔ جس میں وہ پوری طرح کامیاب ہیں۔ چنانچہ "الأیام"، "الوعد الحق"[2] اور "علی هامش السیرة"[3] کی جھلک ان کی تحریروں میں پوری طرح سے نظر آتی ہے جو اپنی جگہ خود آپ انوکھا اور پیارا اسلوب ہے۔ انمیں فکر و فن کے ساتھ ساتھ حسین اور عمدہ الفاظ کا بہترین امتزاج ہے۔ اس لئے ان کی خود نوشت "معی" کو جدید دور کے اعلیٰ شاہکاروں میں آپ شاہکار قرار دیا جا سکتا ہے۔

---

[1] طٰہٰ حسین ـــ الأیام ار ۱۵ دار المعارف بمصر ۱۹۵۷ء [2] طٰہٰ حسین ـــ الوعد الحق

[3] طٰہٰ حسین ـــ علی هامش السیرة " ۱۹۶۰ء

ذکریات علی طنطاوی

دور جدید کے عرب ادباء میں شیخ علی طنطاوی کا نام اس حیثیت سے کافی معروف ہے کہ ان کا قلم ایک طرف زبان و ادب کے اعتبار سے اعلیٰ نمونہ ہے تو دوسری طرف یہ انسانیت، اخلاق اور مذہب کی مضبوط اساس اور اصول و مبادی پر قائم ہے اور ان ہی کی ترجمانی کرتا ہے۔ وہ عصری اداروں سے فارغ التحصیل تھے لیکن خاندانی پس منظر اور علماء و مشائخ کے فیض صحبت کی وجہ سے اسلام اور اس کی تعلیمات ان کے رگ و پے میں رچ بس گئی تھیں۔ عنفوان شباب سے انہوں نے تحریر و تقریر سے اپنے شغف اور دلچسپی کا اظہار کیا تو اس کے مظاہر اس وقت سے لے کر آج تک علم و ادب کی دنیا میں آتے رہے ہیں۔ اس کا اندازہ صرف اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اخبارات و جرائد میں ان کے جو مقالات شائع ہوئے وہ دس ہزار سے زائد صفحات پر محیط ہیں[1]۔ ان کی متعدد وقیع تصنیفات ہیں جن میں ادب، تنقید اصلاح معاشرہ، سیرت، سفرنامے، احساسات و خواطر الغرض مختلف و متنوع موضوعات پر کلام کیا گیا ہے۔ وہ ایک مضبوط اور مستحکم فکر اور نظریے کے مالک ہیں۔ اس کی اساس اسلام اور عربی زبان پر گہرے ایمان و یقین پر قائم تھی۔ اس ایمان میں سچائی، حرارت اور جذباتیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ بلا شبہ وہ صحیح معنوں میں قدیم و جدید اسلوب کے سنگم ہیں۔ انہوں نے قدیم عربی سرمایے سے مواد حاصل کیا اور اسے عصری اسلوب میں اس طرح پیش کیا کہ وہ بالکل نئی باتیں نظر آنے لگیں۔

---

[1] المحافظة والتجديد في النثر العربي المعاصر، انور الجندي ص ۷۶۰
مطبعة الرسالة القاهرة ۱۹۶۲م

یوں تو ان تحریروں میں مقالہ، افسانہ، اجتماعی اصلاح، ادبی تنقید اور اسلامی مباحث سے متعلق وافر ذخیرہ موجود ہے لیکن اپنے آباء واجداد کی تاریخ سے انہیں جنون کی حد تک عشق تھا کہ اگر اس تاریخ کو صحیح انداز میں لوگوں کے سامنے پیش کر دیا جائے تو دنیا کی تمام اقوام کی تاریخوں سے بے نیاز ہو جائیں گے اور صرف مسلم شخصیتوں کے کارناموں سے دلچسپی کا اظہار کریں گے۔[1] وہ مغرب سے استفادہ کے قائل ہیں لیکن اندھی تقلید نہیں بلکہ ہوش گوش اور نقد وتبصرہ کے ساتھ اور صرف مفید باتوں اور اعمال کی حد تک یہ استفادہ محدود رکھنا چاہتے ہیں۔ وہ ادب کے ذریعہ قوم اور دین کی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔ اسے لہو ولعب اور سیر وتفریح کا سامان بنانے سے وہ سخت متنفر ہیں۔ چونکہ ان کی زندگی کا ایک بڑا اور قیمتی حصہ فرانسیسی استعمار کے تحت گذرا تھا اس لئے اس کے خلاف جو غم وغصہ پوری قوم میں پایا جاتا تھا اس میں یہ بھی برابر کے شریک تھے۔ اس کے باعث وہ ہر جابر وظالم حکومت کے ہمیشہ مخالف رہے اور عزت وشرافت اور حریت و مساوات کے علمبردار رہے۔ ان کے افکار وخیالات سے واقفیت کا سب سے بہترین ذریعہ ان کی تصنیفات ہیں۔ اس وقت ان کی ایک اہم تصنیف "ذکریات" کا تعارف پیش کیا جا رہا ہے۔ اس سے مصنف کو سمجھنے میں بڑی حد تک مدد ملے گی۔

یہ کتاب علامہ علی طنطاوی کی یادوں کا مجموعہ ہے۔ وہ انہیں مرتب کرنے کا کوئی خاص منصوبہ نہیں رکھتے تھے۔ ان کے پاس ڈائری وغیرہ نوعیت کی کوئی چیز نہیں تھی جس سے وہ رجوع کریں۔ کبر سنی کی وجہ سے حافظہ بے حد کمزور ہو گیا تھا لیکن ان کے بعض عقیدتمندوں نے ان سے اصرار کر کے ان یادوں کو مرتب کرنے پر آمادہ کیا۔ ابتداء میں ایسا معلوم

---

[1] النور الجندی ـــــ المحافظۃ والتجدید فی النثر العربی المعاصر ص ۷۶۰

ہوتا ہے کہ چند قسطوں میں یہ یادیں سمٹ جائیں گی لیکن جب ان کے لکھنے کا آغاز ہو گیا تو یہ وسعت اختیار کرتی گئیں۔[1] اور صرف ۳۲ سال کی یادیں یعنی ۱۳۵۱ھ تک کے حالات تقریباً بارہ سو صفحات پر پھیل گئے۔ مصنف نے کسی ایک واقعہ، حالت یا مرحلے کی وضاحت کے لئے ایک حلقہ قائم کیا ہے اور اس پر نمبر ڈالے ہیں۔ مذکورہ ۳۲ سال کی یادداشتیں کل ایک سو تیس حلقوں پر مشتمل ہیں[2] اور چار جلدوں میں شائع ہوئی ہیں۔ میرے پاس اس کتاب کی دو جلدیں ہیں۔ اس میں ۶۴ حلقے ہیں اور صرف ۱۹۳۳ء تک کے حالات کی ترجمانی کرتی ہیں۔ کتابی شکل میں شائع ہونے سے پہلے یہ مجلہ "المسلمون" اور مجلہ "الشرق الاوسط" میں قسط وار شائع ہوئی تھیں۔ اسی لئے اس میں کہیں کہیں قارئین کے تاثرات بھی درج ہیں۔

مصنف نے بڑی تفصیل سے یہ وضاحت کر دی ہے کہ ان کی منتشر اور بکھری ہوئی یادیں ہیں۔ ان میں کوئی ترتیب نہیں ہے۔ اسی لئے انہوں نے اس کتاب کا نام "ذکریات" رکھا "مذکرات" نہیں رکھا۔ مذکرات میں تسلسل اور ترتیب ہوتی ہے۔ اس میں پہلے سے تحریر کردہ مواد سے مدد لی جاتی ہے لیکن یہاں صورت حال یہ ہے کہ پہلے سے موجود یادوں کے بعض دھندلے نقوش ہیں۔ قوت حافظہ کے کمزور ہونے کی وجہ سے انہیں یکجا کرنا بھی مشکل ہے تاہم مصنف نے اپنی حد تک کوشش کی ہے کہ مفید اور کارآمد یادداشتوں کا ایک قابل لحاظ حصہ قارئین کے سامنے پیش کر دیں۔[3] چنانچہ انہوں نے جو کچھ لکھا ہے ان کے مطالعہ سے انتہائی دلچسپ باتیں معلوم ہوتی ہیں اور ان سب کے مجموعی مواد سے فی الواقع ایک شخص ہی نہیں بلکہ ایک پورے زمانے کی تاریخ سامنے آجاتی ہے۔ میں نے اس کتاب کے پڑھنے کے بعد اس سے ضروری معلومات فراہم کر لی ہے۔ اب انہیں اپنی قائم کردہ ترتیب کے مطابق بہت اختصار سے پیش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

---

[1] علی طنطاوی ـــ ذکریات ۱/۶-۵، دار المنارۃ للنشر المملکۃ العربیۃ السعودیۃ ۱۹۸۵ء

[2] " " ۱/۷، [3] ایضاً ۱/۱۰-۹،

شیخ علی بن مصطفی بن احمد سبط الطنطاوی کی پیدائش ۲۳ جمادی الاولی ۱۳۲۷ھ کو دمشق میں ہوئی۔ ان کا اصل وطن مصر تھا[1] لیکن ان کے آباء و اجداد ۱۲۵۵ھ میں دمشق منتقل ہوگئے تھے۔ چونکہ مصر میں ان کے گاؤں کا نام " " تھا اس لئے دمشق میں طنطاوی کا لقب دیا گیا۔ ان کے آباء و اجداد نے حصول علم اور حصول معاش کی خاطر گھر سے ہجرت کی تھی اس لئے دمشق میں یہ دونوں مقاصد ان کی تمام مساعی کے مرکز تھے۔ ان میں سے بعض حکومت کے اعلیٰ مناصب پر فائز رہے اور بعض نے حکومت کے مذہبی امور و مسائل کی نگرانی کی۔ علامہ علی طنطاوی کے دادا احمد طنطاوی عثمانی فوج میں ملازم تھے۔ وہ نظم و ضبط کے بہت پابند تھے۔ ان کے تمام مشاغل کے اوقات متعین تھے۔ ان کی شخصیت بڑی بارعب تھی گھر کا کوئی آدمی ان سے آنکھ ملا کر بات نہیں کر سکتا تھا۔ مشترکہ خاندانی نظام ہونے کے باوجود گھر میں کوئی انتشار یا اختلاف نہیں تھا کیونکہ ہر شخص دادا کے حکم کا پابند تھا۔[2]

ان کے والد شیخ مصطفی طنطاوی شام کے جید عالم اور مشہور فقیہ تھے۔ ان کا شمار فقہ حنفی کے چند لوگوں میں ہوتا تھا۔ انہوں نے دار الافتاء میں سکریٹری شپ کی ذمہ داری انجام دی پھر وہ خود مفتی ہوگئے۔ بعد میں وہ " محکمۃ النقض والتمییز " کے صدر بنا دیئے گئے تھے۔ انہیں سلطان شریف فیصل کے زمانے میں اہم شرعی مسائل پر بحث و مباحثہ اور غور و تدبر کے سلسلے میں مدعو کیا جاتا تھا۔ وہ طبعاً سخی اور فیاض تھے۔ ان کے یہاں مہمانوں کی آمد کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ ان کے تلامذہ اور معتقدین کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ اسی طرح دمشق کے مشہور علماء و مشائخ سے ان کے قریبی تعلقات تھے۔ گھر پر ان لوگوں کی علمی نشستیں ہر وقت ہوتی رہتی تھیں۔ جن میں کبھی کبھی بہت اہم علمی مسائل چھڑ جایا کرتے تھے۔[3]

---

[1] علی الطنطاوی ـ ذکریات ۱/۱۳۲ ، [2] ایضاً ص ۱۳۳-۱۳۸ ،
[3] ایضاً ص ۱۷۵-۱۷۸ ،

ان کی والدہ رئیفہ بنت ابی الفتح الخطیب انتہائی محنتی، دیندار اور اطاعت شعار خاتون تھیں۔ ان کی تربیت اور پرورش ایک سنجیدہ اور متدین گھرانے میں ہوئی تھی۔ ان کا خاندان شام کے چند علمی خانوادوں میں سے ایک تھا۔ یہ اصلاً بغداد کا رہنے والا تھا لیکن دو صدی قبل دمشق منتقل ہوگیا تھا۔ اس خاندان میں بڑے بڑے علماء اور ائمہ گذرے ان میں شیخ عبدالقادر الخطیب خاص طور سے قابل ذکر ہیں[1]۔ ان کی والدہ کے حقیقی بھائی شیخ محب الدین الخطیب مجلہ "الفتح" کے مدیر "جمعیۃ الشبان المسلمین" کے بانی تھے۔ انہوں نے مستقل طور سے مصر میں سکونت اختیار کرلی تھی[2]

شیخ علی طنطاوی کی ابتدائی تعلیم گھر میں اور محلے کے مکتب میں ہوئی۔ پھر ۱۹۱۴ء میں انہیں "مدرسہ تجاریہ" میں داخل کردیا گیا۔ یہ شام کے تین بڑے کالجز میں سے ایک تھا۔ جہاں ثانوی تک کی تعلیم ہوتی تھی[3]۔ اس کالج کے پرنسپل ان کے والد مصطفی طنطاوی تھے۔ وہ اس کالج میں ۱۹۱۸ء تک زیر تعلیم رہے۔ چار سال کے عرصے میں انہیں دو واقعات خاص طور سے ہمیشہ یاد رہے ان میں پہلا واقعہ شام کا وہ مشہور قحط تھا جب ہر طرف بھکمری کا عالم تھا لوگ معمولی چیزوں کو دیکھ کر ٹوٹ پڑتے تھے۔ ہر سامان کی قیمت کئی گنا زیادہ ہوگئی تھی۔ کھانے پینے کی اشیاء باہر سے منگائی جاتی تھیں۔ دوسرا واقعہ جنگ عظیم اول کا تھا جو گرچہ شام کی سرحد سے بہت دور لڑی جارہی تھی لیکن اس میں عثمانی حکومت کی شرکت کی وجہ سے شام سے بھی نوجوانوں کو زبردستی فوج میں شامل کیا جارہا تھا۔ لیکن اس جبریہ بھرتی کے علاوہ اور کوئی خبر اس جنگ سے متعلق بہت کم لوگوں کو معلوم تھی کیونکہ اس وقت ذرائع ابلاغ کی سہولیات آج کی طرح نہیں تھیں[4]۔

۱۹۱۸ء میں جب کہ مذکورہ کالج میں پانچویں کلاس کے طالب علم تھے مغربی طاقتوں کی ریشہ دوانیوں سے ترکوں کے خلاف عربوں کی بغاوت اپنے شباب پر پہنچ گئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ترک

---

[1] علی الطنطاوی ــ ذکریات ص ۲۰۲-۲۰۱ ، [2] ایضاً ص ۲۶۱-۲۵۹ ،
[3] ایضاً ص ۲۹ ، [4] ایضاً ص ۳۰-۳۳ ،

دیار عرب سے ہمیشہ کے لئے نکال دیئے گئے۔ عربوں کو اپنی فتح پر بے حد ناز تھا ہر طرف خوشی کے شادیانے بج رہے تھے، ترکوں کی تمام یادگاریں ختم کی جارہی تھیں۔ ترکی زبان میں تحریر شدہ تمام چیزیں عربی زبان میں تحریر کی جارہی تھیں۔ اس کے اثرات ان کے کالج پر بھی پڑے۔ اس میں ترکی ترانے کی جگہ عربی ترانہ پڑھا جانے لگا اور اس کا نام اور علم تبدیل ہوگیا۔ معاملہ یہیں تک محدود نہیں رہا بلکہ کچھ ہی دنوں میں اسے بند کرنے کا حکم صادر کردیا گیا کیونکہ اسے ترکوں نے قائم کیا تھا اور ان کی انجمن "جمعیت اتحاد و ترقی" سے اس کا معمولی تعلق تھا۔[1]

اس کالج کے بند ہونے کے بعد ان کے والد نے "مدرسہ سلطانیہ ثانیہ" میں ان کا داخلہ کرادیا۔ "مدرسہ تجاریہ" کے علی الرغم اس اسکول میں ذریعۂ تعلیم عربی تھی۔ یہاں صبح کا ترانہ بھی عربی میں پیش کیا جاتا تھا اور غیر ملکی زبانوں میں فرانسیسی کے بجائے انگریزی پڑھائی جاتی تھی۔ اس اسکول میں ابتدائی اور ثانوی درجات تک کی تعلیم ہوتی تھی۔ یہ اسکول بھی ترکوں کا قائم کردہ تھا اس کے پرنسپل، اساتذہ اور دیگر منتظمین کافی دلچسپی اور محنت سے اپنا کام انجام دیتے تھے۔ دریائے بردی کے کنارے واقع ہونے کی وجہ سے یہ ہر وقت سیلاب کی زد میں رہتا تھا۔ اس اسکول میں ان کا داخلہ پانچویں کلاس میں ہوا تھا حالانکہ اس سے پہلے وہ "مدرسہ تجاریہ" سے پانچ پاس کرچکے تھے۔[2] اس اسکول کے پہلے سال یعنی ۱۹۲۰ء میں امیر فیصل کو شام، لبنان اور فلسطین کا بادشاہ بنا دیا گیا۔ یہ گویا عرب قوم پرستی کی ایک بڑی فتح تھی۔ ہر جانب خوشیوں اور مسرتوں کا اظہار کیا جارہا تھا۔ مقررین اور شعراء کی تو عید ہوگئی تھی۔[3] لیکن ابھی اس فتح کا جشن ختم ہی نہیں ہوا تھا کہ فرانسیسیوں نے شام پر حملہ کردیا اور "میدان میلون" میں عربوں کا اقتدار اپنے عہد طفولیت ہی میں ادبار و تنزل سے دوچار ہوگیا۔ شام کی تاریخ کا یہ عظیم سانحہ تھا۔ گرچہ علماء و مشائخ اور وطن پرستوں نے فرانسیسی

---

[1] علی الطنطاوی ــ ذکریات ۱/۵۲-۵۹، [2] ایضاً ص ۶۰-۵۷

[3] ایضاً ص ۶۲-۶۱،

سامراج کے خلاف اپنی تمام کوششیں صرف کردیں لیکن اسے آگے بڑھنے سے روکا نہیں جاسکا اور یہ طویل عرصے تک شام کے افق پر ایک منحوس سایہ کی طرح چھایا رہا۔[1]

شیخ طنطاوی "مدرسہ سلطانیہ ثانیہ" کے دوسرے سال میں داخل ہی ہوئے تھے کہ ان کے والد نے انہیں یہاں سے نکال کر "مدرسہ جقمقیہ" میں داخل کردیا۔ جقمقیہ ایک عمارت کا نام ہے جسے جقمق م ۸۲۴ھ نے تعمیر کیا تھا۔ یہ عمارت سلطان صلاح الدین ایوبی کے مقبرہ کے پاس واقع ہے۔[2] اس کے پرنسپل عبدالسفر جلانی صحیح معنوں میں "معلم شام" کہے جانے کے مستحق ہیں۔ وہ حدیث، فقہ اور عربی زبان و ادب پر قادر تھے۔ طنطاوی کو ان سے مختلف حیثیتوں میں استفادہ کرنے کا موقع ملا۔ اس اسکول میں دینی و عصری درسگاہوں کے فارغ التحصیل اساتذہ کی ایک اچھی ٹیم موجود تھی۔ اس کی وجہ سے طلباء بیک وقت جدید و قدیم اسلوب سے متمتع ہوتے تھے اور بجا طور سے وہ ان دونوں کے امین اور حامل بن جایا کرتے تھے۔[3]

مدرسہ جقمقیہ وہ پہلا اسکول ہے جس کے اثرات کو مصنف نے اپنی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں ذاتی طور سے محسوس کیا۔ اس سے قبل جن اداروں میں انہوں نے تعلیم حاصل کی تھی مختلف اسباب کی بنیاد پر ان کے اثرات کی کارفرمائی واضح طور سے نظر نہیں آتی تھی۔ اس اسکول کے پرنسپل اور اساتذہ کی شفقت و محبت اور پیشہ تدریس سے ان کی مکمل وابستگی اور دلچسپی سے وہ بہت متأثر تھے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

> "یہ ہمارے اولین اساتذہ ہیں۔ ان کی حیثیت ہمارے باپ کی طرح ہے۔ ہمارے مربی تھے، ناصح تھے اور نگراں تھے۔ ان کی شخصیت اور ان کے کارناموں سے بیشتر لوگ آگاہ نہیں ہیں۔ یہ کسی کی توجہ مدح و توصیف اور داد و دہش کے محتاج بھی نہیں تھے۔ وہ محض اللہ کے یہاں اجر و انعام کے متمنی تھے اور مجھے امید ہے کہ وہ انہیں ضرور ملے گا۔"[4]

مدرسہ جقمقیہ سے وابستگی کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ طنطاوی نے جامع اموی کے حلقہائے تدریس میں پابندی

---

[1] علی الطنطاوی ـــ ذکریات ص ۶۸-۷۵ ، [2] ایضاً ص ۶۹-۷۱ ،
[3] ایضاً ص ۶۸ ، [4] ایضاً ص ۷۵ ،

سے شرکت کی اور ان سے بیش از بیش فائدہ اٹھایا۔ یہ مسجد مدرسے کے شمالی گیٹ کے عین سامنے واقع تھی یہ عالم اسلام کی تین چار اہم مساجد میں سے ایک ہے۔ مدرسے کے طلبہ کے لئے یہ مسجد عبادت گاہ، تفریح گاہ اور درس گاہ سب کچھ تھی۔ عالم اسلام کے جید علماء فقہاء اور محدثین انتہائی پابندی سے اپنے اپنے موضوع پر درس دیا کرتے تھے۔ یہ مسجد شاید ہی کبھی "قال اللہ" اور "قال الرسول" سے خالی رہتی ہو۔ اس میں مبلغین اور واعظین کے بھی مشہور حلقے تھے۔ الغرض پوری مسجد ایک درس گاہ بنی ہوئی تھی[1] اس سے استفادہ کرنے والوں کے لئے کوئی شرط نہیں تھی۔ مدرسہ جقمقیہ کے اور طلبہ کی طرح شیخ علی طنطاوی نے بھی اس سے خوب خوب استفادہ کیا[2] لیکن تھوڑے دنوں کے بعد ان کے والد نے دمشق کے محلہ صالحیہ میں ایک نیا مکان کرایہ پر لے لیا۔ یہ مکان بے حد کشادہ تھا اور دمشق کے انتہائی پر فضا مقام پر واقع تھا۔ اس نقل مکانی کی وجہ سے انہیں ۱۹۳۱ء میں "مدرسہ النموذج المہاجرین" میں داخلہ لینا پڑا۔ سوئے اتفاق سے یہاں ان کا داخلہ پھر پانچویں کلاس میں ہوا۔ اس سے قبل وہ دوبار پانچ پاس کر چکے تھے لیکن اسکول کی تبدیلی اور نصاب تعلیم کے تغیر کی وجہ سے انہیں تیسری بار اسی کلاس میں لوٹنا پڑا۔ تاہم وہ اسے عمر کا ضیاع نہیں سمجھتے بلکہ مختلف اداروں کی علمی و ادبی فضا سے مستفید ہونے کی وجہ سے فخر محسوس کرتے ہیں۔[3]

"مدرسہ النموذج المہاجرین" ایک حکومتی ادارہ تھا اس کا پرنسپل ایک عیسائی تھا یہاں کا ماحول مدرسہ جقمقیہ سے بالکل مختلف تھا۔ شیخ عبد السفر جلانی جیسی یہاں کوئی شخصیت نہیں تھی[4] شام میں فرانسیسی سامراج کی جڑیں مضبوط ہو چکی تھیں۔ قوم کی طرف سے جدوجہد آزادی کا آغاز ہو گیا تھا جس کا اختتام آزادی اور فتح و کامیابی پر ہوا۔ فرانسیسی سامراج کے اثرات اسکول اور کالجوں پر بھی پڑے۔ وہاں نصاب میں تیزی سے تبدیلیاں کی گئیں۔ تاہم علی طنطاوی نے اپنے آپ کو اپنے گھریلو پس منظر کی وجہ سے غلط ماحول سے بچا لیا اور اسکول کے ماہر اساتذہ سے اپنی بساط بھر کسب فیض کیا۔ اس وقت کے طلبہ اپنے اوقات کو

---

[1] علی الطنطاوی ــ ذکریات ۱/۷۹-۷۶ ، [2] ایضاً ص ۸۲-۸۱
[3] ایضاً ص ۸۶-۸۵ ، [4] ایضاً ص ۸۹ ،

لہو و لعب میں ضائع کرنے کے بجائے حصول علم اور قراءت و مطالعہ میں صرف کرتے تھے۔ فحش اور بازاری لٹریچر کا رواج بالکل نہیں تھا۔ ان کا بیان ہے کہ "اس وقت کے طلباء جن کتابوں کا مطالعہ کر لیا کرتے تھے ان کا اگر تذکرہ کیا جائے تو آج کے لوگ یقین نہیں کریں گے۔"[1] وہ اپنے بارے میں وضاحت کرتے ہیں کہ وہ ہمیشہ اسکول سے واپس آکر گھر کی لائبریری میں مصروف ہو جایا کرتے تھے اور کتابیں خواہ ان کی سمجھ میں آئیں یا نہ آئیں الٹتے پلٹتے رہتے تھے۔[2] اس اسکول کے امتحان کے بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ یہ تقریری ہوتا تھا اور اس میں طالب علم کے گرد ذی علم اور باصلاحیت لوگوں کی ایک ٹیم بیٹھ جایا کرتی تھی اور زبانی سوالات کی بوچھاڑ کر دیتی تھی۔ شروع میں یہ سوالات بالعموم مشکل ہوا کرتے تھے۔ بعد میں آسان ہوتے تھے۔ اسی لئے طالب علم ہمیشہ بعد میں جانے کی کوشش کرتا تھا۔ شیخ طنطاوی ان امتحانات میں کافی صبر و سکون سے شرکت کرتے تھے اور ہر سوال کا خندہ پیشانی سے جواب دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں اس اسکول کے آخری امتحان اخلاقیات کے علاوہ ہر پرچے میں دس میں سے دس نمبر حاصل ہوئے تھے۔ اخلاقیات میں نمبر کم ہونے کی وجہ فرانسیسی اقتدار کی مخالفت تھی۔[3]

شیخ علی طنطاوی اس اسکول سے پرائمری کی سند حاصل کرنے کے بعد "مکتب عنبر" میں داخل ہو گئے۔ یہ شام کا سب سے مشہور اور اہم ثانوی اسکول تھا۔ یہ وطن پرست تحریکوں اور افراد کا مرکز اور منبع تھا۔ شام کے تقریباً تمام بڑے لوگوں نے اس اسکول سے تعلیم حاصل کی تھی۔[4] شیخ علی طنطاوی کے ذاتی ارتقا میں اس اسکول کا بڑا دخل ہے۔ اس سے ان کے فکر و عمل کو ایک نیا رخ ملا۔ اس اسکول میں گذرا ہوا زمانہ ان کے لئے بے حد اہم اور خوشگوار تھا۔ اس میں انہوں نے جن اساتذہ سے علم حاصل کیا اور جو کتابیں پڑھیں وہ ان کی زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ ثابت ہوئیں۔[5] اسی اسکول میں ان کی زندگی تلخ تجربات سے بھی دوچار ہوئی۔ شام کے لئے آزادی کی تحریکیں اپنے شباب پر

---

[1] علی الطنطاوی ۔ ذکریات ص ۹۳-۹۲ ، [2] ایضاً ۱/۹۳ ، [3] ایضاً ص ۹۹-۹۷ ،
[4] ایضاً ص ۱۰۵ ، ایضاً ۱/۱۲۱-۱۱۶ ،

تھیں۔ انہوں نے ان میں سے بعض میں سرگرم حصہ لیا۔ پھر دوران تعلیم ہی والد بزرگوار اللہ کو پیارے ہوگئے جس کی وجہ سے حصول رزق کی فکر دامنگیر ہوئی۔ اور اس سلسلے میں مختلف تجربات کیے[1] لیکن حالات نے دوبارہ اسی اسکول میں واپس لوٹا دیا۔ اور وہ یہاں سے نوجوانوں کے عظیم قائد بن کر نکلے۔

"مکتب عنبر" قدیم دمشق کے ایک محلہ "خراب" میں واقع تھا۔ اس کی شہرت کی وجہ سے دور دور سے طلبہ یہاں تحصیل علم کے لئے آتے تھے۔ ان میں سے بعض طلبہ B.A. پاس ہوتے تھے۔[2] عنبر ایک عام آدمی کا نام تھا جس نے یہ عمارت تعمیر کی تھی۔[3] شیخ طنطاوی اس میں ۱۹۲۳ء میں داخل ہوئے تھے۔ ان کے ساتھیوں میں انور عطار اور زکی المحاسنی بعد میں کافی مشہور ہوئے۔[4] یوں تو ان کے اساتذہ میں سب ہی اپنے فن کے ماہر تھے لیکن شیخ عبدالرحمان سلام، سلیم الجندی، استاذ عبدالقادر المبارک کی بات ہی کچھ اور تھی۔[5] شیخ سلام انشاء پردازی اور خطابت، سلیم الجندی لغت، نحو اور علم عروض اور استاذ مبارک لغوی روایات میں اپنی مثال آپ تھے۔ مؤخر الذکر دو کے بارے میں طنطاوی کا بیان ہے کہ عربی زبان وادب اور علوم وفنون کا ان سے زیادہ جاننے والا اس روئے زمین پر موجود نہیں ہے۔[6] ان اساتذہ کے علاوہ شیخ داؤدی اور مشہور شامی شاعر استاذ محمد البزم کی بھی علمی وادبی فیوض وبرکات ہمیشہ یاد رکھنے کے قابل ہیں۔ عربی زبان وادب کے علاوہ عصری علوم کے ماہر اساتذہ کی بھی ایک جماعت اس اسکول میں موجود تھی۔ ان میں سے بعض کی خدمات ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔[7]

"مکتب عنبر" سے متعلق یادیں علی طنطاوی کو سب سے زیادہ عزیز ہیں۔ وہ اپنے خونی رشتوں کے بالمقابل اس کالج کے طلباء، اساتذہ، ماحول اور منتظمین سے زیادہ لگاؤ محسوس کرتے ہیں۔[8] چنانچہ انہوں نے بہت تفصیل سے ان امور پر بحث کی ہے۔ اس کے نصاب تعلیم کے بارے

---

[1] علی الطنطاوی - ذکریات، ص ۱۱۱، [2] ایضاً ص ۱۰۸-۱۰۷، [3] ایضاً ص ۱۲۱،
[4] ایضاً ص ۱۱۳، [5] ایضاً ص ۱۱۰-۱۱۱، [6] ایضاً ص ۱۵۶-۱۵۷، [7] ایضاً ص ۱۵۷-۱۵۶،

میں ان کا خیال ہے کہ یہ آج کل کے کالجوں کے نصاب سے بہت زیادہ طویل اور وسیع تھا۔ اس کے پڑھنے پڑھانے میں طلبہ اور اساتذہ دونوں بہت محنت کرتے تھے۔ بہت اساتذہ کو چھوڑ کر بیشتر لوگ باصلاحیت اور اپنے مضمون کے ماہر تھے۔ حالات کی ناسازگاری اور غیر ملکیوں سے کشمکش کی وجہ سے ہر شخص کو مستقبل کی بہترین تعمیر کی فکر تھی۔ اس وقت لہو ولعب کے سامان بھی بہت کم تھے۔ الغرض ہر طالب علم کو کچھ بننے کی فکر تھی۔ شیخ طنطاوی کو اس کالج سے سب سے زیادہ فائدہ عربی زبان اور عربی علوم پر قدرت حاصل کرنے میں ملا۔ اور اس کا اصل سہرا استاذ مبارک اور استاذ سلیم الجندی کو جاتا ہے گرچہ ان کے علاوہ استاذ عبدالرحمان سلام نے بھی طلبہ کے اندر عربی زبان میں لکھنے پڑھنے اور تقریر کرنے کی صلاحیت بہم پہنچائی[1]۔ استاذ مبارک عربی زبان کے الفاظ کی شرح و توضیح کا ایک منفرد انداز رکھتے تھے۔ وہ بہت مختصر الفاظ میں بڑی بڑی باتیں کہہ جاتے تھے۔ جہاں تک سلیم الجندی کا معاملہ ہے تو وہ ایک خاموش طبع آدمی تھے۔ وہ تقریری انداز تدریس کے مخالف تھے۔ وہ طلبہ کے اندر غور و فکر کرنے اور ٹھہر کر سوچنے کی عادت پیدا کرنا چاہتے تھے۔ کسی لفظ کا معنی بتانے سے پہلے اشتقاق اور اعراب وغیرہ کی وضاحت ضروری سمجھتے تھے۔ وہ نحو و صرف کی جس کتاب کی تعلیم دیتے طلبہ ان کے استفادات و ملاحظات سے کئی کئی کاپیاں بھر لیتے تھے[2]۔ طنطاوی اپنے استاذ سلیم الجندی سے کس قدر متأثر تھے اس کا اندازہ درج ذیل پیراگراف سے ہو سکتا ہے۔

"میں استاذ سلیم الجندی سے ویسی ہی محبت کرتا ہوں جیسے ایک بیٹا اپنے باپ سے کرتا ہے۔ میں ان سے ہر وقت استفادہ کرتا تھا۔ درجے میں، فرصت کے اوقات میں اور اسٹاف روم میں، ہر جگہ علم کے اس چشمۂ صافی سے مستفید ہوتا تھا پھر بھی تشنگی باقی رہتی تھی۔ میں مزید استفادے کے لئے تگ و دو کرتا تھا تاکہ زندگی کے آئندہ مراحل میں یہ زاد

---

[1] علی الطنطاوی ۔ ذکریات ۱/۱۲۹ ، [2] ایضاً ص ۱۵۵-۱۵۶ ،

سفر کے طور پر کام آئے۔[1]

علی طنطاوی نے جب "مکتب عنبر" میں داخلہ لیا تھا تو اس وقت گرچہ ان کی عمر پندرہ سال تھی لیکن علمی اعتبار سے وہ اپنی عمر سے بہت زیادہ بڑے معلوم ہوتے تھے۔ ان کے پاس معلومات کا بہت بڑا ذخیرہ تھا۔ یہ زیادہ تر مصنف کا اپنی ذاتی محنت کا ثمرہ تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

"میں نے ابتدائی سالوں میں وہ کتابیں پڑھ لی تھیں جو آج کے بعض اساتذہ بھی نہیں پڑھ سکے ہوں گے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میرا اکثر وقت گھر میں گذرتا تھا۔ میرے ساتھیوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ گھریلو تربیت کی وجہ سے میں لہو ولعب سے بھی بہت دور تھا۔ میرے گھر میں ایک بڑا کتب خانہ تھا۔ مجھے کتابوں کے پڑھنے، دیکھنے اور چھونے کی اجازت تھی۔"[2]

وہ اپنے گھر کے کتب خانہ کی اکثر کتابیں اٹھاتے، دیکھتے اور پڑھتے رہتے تھے۔ اگر کوئی کتاب پسند نہیں آتی تو کم از کم اس کا نام اور اس کے مصنف کا نام یاد رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ کم عمری میں ان کے مطالعہ سے شوق کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے پرائمری کے دوران "کتاب الأغانی" کے بہت سے ابواب کا مطالعہ کر لیا تھا۔ منفلوطی کی بعض کتابیں اور مجلہ "رابطہ ادبیہ" کے بعض شمارے بھی ان کے زیر مطالعہ تھے۔[3] ان کی تعلیم و تربیت میں شروع سے جدید و قدیم عناصر کی بیک وقت آمیزش رہی۔ ایک طرف وہ اپنے والد کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے والے علماء و مشائخ کے قدیم ازہری اسلوب تکلم سے مستفید ہوتے تھے۔ تو دوسری طرف پرائمری سے لے کر یونیورسٹی کی اعلیٰ تعلیم تک جدید اسلوب نگارش اور طرز ادا سے متمتع ہوتے تھے۔ اس کی وجہ سے وہ اپنے حقیقی معنی میں جدید و قدیم کے سنگم بن گئے لیکن ان کا اصل ذریعۂ تربیت ان کا ذاتی مطالعہ ہی تھا۔[4] بچپن سے لے کر آج تک ان کا بیشتر وقت مطالعہ میں گذرا۔ ان کا ایک دن کا اوسط مطالعہ ایک سو صفحات کا آتا ہے۔ اس طرح انہوں نے اپنی زندگی میں کم از کم

---

[1] علی طنطاوی ـ ذکریات ۱/۱۵۶، [2] ایضاً ص ۱۶۰-۱۵۹، [3] ایضاً ص ۱۶۱-۱۶۰،
[4] ایضاً ص ۱۶۳-۱۶۲،

ستر ہزار صفحات کا مطالعہ کیا[1]

۱۹۲۵ء میں جب کہ شام کے فرانسیسی قبضہ کے پانچ سال مکمل ہو چکے تھے برطانوی وزیر خارجہ بالفور نے شام کا دورہ کیا۔ مسئلۂ فلسطین کے بارے میں تمام یورپی ممالک خاص طور سے برطانیہ کی خباثتیں سب لوگوں پر عیاں تھیں اس لئے "مکتب عنبر" کے طلبہ نے اس شخص کے خلاف احتجاج کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ وہ پوسٹرس، بینرس اور پلے کارڈس لے کر سڑکوں پر نکل آئے۔ عوام نے بھی ان کا ساتھ دیا[2]۔ طلبہ کا یہ احتجاج شام کی ۱۹۲۵ء کی مسلح جدوجہد آزادی کا ایک بڑا سبب بن گیا۔ شام کے مسلم عوام برطانیہ سے سخت نالاں تھے بالفور کے دورہ نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ عوام سامراجیت کے خلاف سینہ سپر ہوگئے اور تقریباً آٹھ ماہ تک اپنے شدید غم وغصہ کا اظہار کیا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس مسلح عوامی تحریک نے فرانسیسیوں کا شام میں عرصۂ حیات تنگ کر دیا۔ عوام کے پاس معمولی بندوقیں اور تلواریں تھیں لیکن اپنے عزم وحوصلہ اور ایمانی جذبہ کی وجہ سے جنگ عظیم کی فاتح قوم کو ناکوں چنے چبوا دیئے۔ اس تحریک آزادی کی خبریں اس وقت کے ذرائع ابلاغ کی سب سے اہم خبریں ہوا کرتی تھیں۔ اس دوران "حسن خراط" اور "جسر تورا" کا نام اخبارات میں بہت زیادہ آیا۔ حسن الخراط وہ مرد مجاہد ہے جس نے اس تحریک کی بڑھ چڑھ کر قیادت کی[3] اور "جسر تورا" وہ پل ہے جسے عبور کرنے کی فرانسیسیوں نے بہت کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہوئے[4]۔ جب میدان جنگ میں ان کی تمام تدبیریں ناکام ہوگئیں تو انہوں نے اپنے نام نہاد اصولوں اور اخلاقی ضوابط سے بالاتر ہو کر شہر دمشق پر اندھا دھند بمباری کر دی۔ اس سے بے شمار معصوم جانیں، عمارات، تاریخی مقامات اور دکانیں ضائع ہوگئیں[5]۔ شہر کے بہت سے خوبصورت علاقے تہس نہس ہوگئے۔ اس سے گرچہ

---

[1] علی الطنطاوی ـــ ذکریات ۱/۱۶۲، [2] ایضاً ص ۱۶۸-۱۷۰، [3] ایضاً ص ۲۰۷-۲۰۸،
[4] ایضاً ص ۲۱۱-۲۱۲، [5] ایضاً ص ۲۱۳،

شہر کے قلب پر ان کا قبضہ بحال ہو گیا لیکن ایک عرصہ تک گرد و نواح مجاہدین آزادی کے تصرف میں رہا پھر انہوں نے مختلف ذرائع سے طاقت کا بے دریغ استعمال کر کے مجاہدین کی صفوں میں انتشار پیدا کیا اور سازشوں کے بہت سے جال بچھا کر تمام علاقوں کو واپس لے لیا۔ اس میں غیروں سے زیادہ اپنوں کی بے ضمیری اور مفاد پرستی کا دخل تھا۔[1]

۱۹۲۵ء کا انقلاب جیسا کہ وضاحت آچکی ہے "بالفور" کے دورۂ دمشق کے فوراً بعد شروع ہوا۔ اس انقلاب کے پیچھے دوسرے اسباب میں "نہضۃ المشائخ" کی سرگرمیاں خاص طور سے قابل ذکر ہیں "نہضۃ المشائخ" شام کے جید علماء کی ایک ایسی جماعت کا نام ہے جس نے عوام سے بعض دینی مقاصد کے تحت رابطہ قائم کیا۔ اس میں شیخ بدرالدین، شیخ علی دقر اور شیخ ہاشم خطیب کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ اس جماعت نے پورے شام کے شہروں، قصبات اور دیہاتوں کا دورہ کیا۔ لوگوں کے سامنے وعظ و تلقین کی اور اسلامی حکومت کے قیام کے تعلق سے ان کی ذمہ داریوں کو یاد دلایا۔ اس سے لوگ بہت متاثر ہوئے اور وہ ان کا ساتھ دینے کے لئے ہر طرح سے آمادہ ہو گئے۔ اس طرح یہ دورہ انقلاب کی آمد کا ایک اہم سبب بن گیا۔ اس جماعت کی کوششوں کا اعتراف خود فرانسیسیوں نے بھی کیا۔[2] اس کے علاوہ بھی بعض دوسرے اسباب ہیں جو انقلاب کی آگ بھڑکانے کا سبب بنے۔[3] اس انقلاب میں اور ذرائع کی طرح شعر و شاعری سے بھی مدد لی گئی۔ علی طنطاوی نے بھی بعض ایسے قصائد لوگوں کے سامنے پیش کئے جن سے ان کی حمیت اور غیرت بھڑک اٹھے۔ اس انقلاب کے تعلق سے احمد شوقی، خیرالدین زرکلی، خلیل مردم بک، احمد شفیق جبری اور محمد البزم کے قصائد بہت زیادہ مشہور ہوئے۔ ان کے علاوہ بھی بعض دوسرے شعراء کے اشعار بھی پسند کئے گئے۔[4]

---

[1] علی طنطاوی — ذکریات ۱: ۲۱۳ - ۲۱۴، [2] ایضاً ص ۲۱۸-۲۱۹،
[3] ایضاً ص ۲۲۰-۲۲۲، [4] ایضاً ص ۲۲۵-۲۳۰،

"مکتب عنبر" میں تعلیم کے دوران ان کی ذاتی زندگی میں ایک سانحہ یہ پیش آیا کہ ۱۳۴۳ھ میں ان کے والد اللہ کو پیارے ہوگئے۔ اس وقت ان کی عمر ۱۷ سال کی تھی اور وہ آٹھویں کلاس میں تھے۔ اس اچانک حادثے کا ان کی زندگی پر گہرا اثر پڑا۔ وہ اس سانحے سے اس قدر نڈھال اور افسردہ ہوگئے کہ انہیں والد صاحب کی تجہیز و تکفین کے تمام مراحل کا بھی صحیح طور سے احساس نہیں ہو سکا۔ والد صاحب ایک معروف علمی شخصیت کے مالک تھے اس لئے ان کے جنازے میں بہت زیادہ لوگ شریک ہوئے۔ بعد میں تعزیت کے لئے آنے والوں کا سلسلہ بھی بہت طویل رہا۔[1] انتقال کے بعد مصنف کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ اپنے گھر کی مالی کفالت کا تھا۔ والد صاحب نے ترکے میں کوئی خاص رقم نہیں چھوڑی تھی۔ یہ اپنے بہن بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ ایک بہن اور تین بھائیوں کے علاوہ والدہ بھی باحیات تھیں۔ گھر کے تمام ضروری اخراجات کم کرنے کے باوجود وقت بڑی پریشانیوں سے گذر رہا تھا۔ والدہ نے کمال حکمت، تدبر اور بردباری سے معاملات کی دیکھ ریکھ کی اور اپنا آرام و آسائش قربان کرکے بچوں کے دکھ درد کا ہمیشہ خیال رکھا۔ والد کے اکثر دوست و احباب نے ان لوگوں کو کوئی سہارا نہیں دیا۔ ایک دو رشتہ داروں کو چھوڑ کر دوسروں نے بھی کوئی خبر گیری نہیں کی۔ ان حالات میں شیخ طنطاوی کو معاشی بھاگ دوڑ میں حصہ لینا پڑا۔ یہ ان کے لئے ایک نیا تجربہ تھا۔ اس کے علاوہ تعلیم وغیرہ کے تعلق سے ان کے جو حسین خواب تھے اور جو روشن امکانات نظر آتے تھے وہ سب بکھرتے اور ٹوٹتے ہوئے نظر آرہے تھے۔ تاہم انہوں نے عزم و حوصلے سے کام لیا۔[2] سب سے پہلے انہوں نے "نہضۃ المشائخ" کے زیر اہتمام قائم ایک اسکول میں تدریسی خدمت انجام دینی شروع کی۔ یہ ایک دینی مدرسہ تھا۔ اور اس کا قیام حکومت کے زیر اہتمام چلنے والے اسکولوں کے غلط نظام تعلیم کے مضر اثرات سے نئی نسل کو محفوظ رکھنے

---

[1] علی طنطاوی — ذکریات ۱/۱۷۹-۱۷۵ ، [2] ایضاً ص ۱۸۲-۱۷۹ ،

کے لئے عمل میں آیا تھا۔ لیکن کچھ ہی دنوں کے بعد ادارہ کے منتظمین سے طنطاوی کا اختلاف ہوگیا اور انہوں نے اس سے علیحدگی اختیار کرلی[1]۔ پھر چونکہ ثانویہ کی ڈگری لینے میں ایک سال رہ گیا تھا اس لئے انہوں نے تعلیم کا سلسلہ دوبارہ شروع کردیا۔ ڈگری حاصل کرنے کے بعد انہوں نے الگ سے حساب اور ریاضی میں مہارت حاصل کی۔ اس کے بعد انہوں نے بہت سے تاجرین کے یہاں محرر اور محاسب کی حیثیت سے کام کیا۔ ایک بار خود بھی تجارت کا کام شروع کردیا[2]۔ لیکن بہت جلد ان پر یہ بات واضح ہوگئی کہ ان کے مزاج سے تجارت کا کوئی میل نہیں ہے۔ اس دوران اپنے بعض مخلصین کے مشورے پر انہیں مزید تعلیم حاصل کرنے کا شوق ہوا۔ وہ "مکتب عنبر" آئے تو اس کے منتظم نے انہیں داخلہ لینے کی اجازت دی کہ وہ امتحان میں اچھے نمبر لے آئیں گے۔ چنانچہ انہوں نے امتحان میں شرکت کی اور جب نتیجہ نکلا تو یہ طلبہ میں سب سے آگے تھے[3]۔ یہ ۱۹۲۷ء کا واقعہ ہے۔ اس کے بعد اصولاً انہیں آگے کے کلاس میں داخلہ مل جانا چاہئے تھا لیکن اسی زمانے میں فرانسیسیوں نے شام کا تعلیمی نظام اپنے ملک کے نظام کے مطابق چلانے کے لئے B.A. کا کورس متعارف کیا۔ اور اس میں داخلہ کے لئے ایک امتحان بھی رکھ دیا۔ تیاری کے لئے وقت بہت کم تھا لیکن بہرحال وہ شریک ہوئے اور کامیاب قرار دیئے گئے۔ B.A کا کورس مکمل کرنے کے بعد وہ اس کے امتحان میں شریک ہوئے۔ یہ امتحان ایک دوسری عمارت میں تھا اور اس میں طلبہ وطالبات دونوں شریک تھے۔ امتحان کا نتیجہ نکلا تو انہیں کامیاب قرار دیا گیا۔ اس سے انہیں بے انتہا خوشی ہوئی۔ اس طرح ان کے نام کے ساتھ "بکالوریا فی الآداب" لکھا جانے لگا[4]۔

۱۹۲۸ء میں ان کے ماموں استاذ محب الدین الخطیب نے انہیں ایک خط لکھ کر مصر آنے کی دعوت دی۔ انہوں نے اس خط میں ان کی بہن کا اپنے ایک شریک کاروبار "عبدالفتاح قتلان"

---

[1] علی طنطاوی ــــ ذکریات ص ۱۸۵-۱۸۶ ، [2] ایضاً ص ۱۸۶-۱۸۹ ،
[3] ایضاً ص ۱۹۰ ، [4] ایضاً ص ۲۴۱ ،

کے ساتھ رشتہ تجویز کیا تھا۔ اسے گھر کے لوگوں نے قبول کر لیا۔ اور وہ اپنی بہن کے ساتھ مصر روانہ ہو گئے۔ ان کی روانگی ستمبر ۱۹۲۸ء میں ریل گاڑی کے ذریعہ ہوئی۔ دوسرے دن کی رات بارہ بجے کے قریب وہ قاہرہ پہنچے وہاں لوگوں کی چہل پہل اور گہما گہمی دیکھ کر انہیں تعجب ہوا کیونکہ دمشق میں اس وقت سناٹا طاری ہو جاتا تھا۔ گھر پہنچنے پر کھانے وغیرہ سے فارغ ہوئے اور سونے کی کوشش کی لیکن نئی جگہ اور نئے ماحول کی وجہ سے نیند نہیں آئی۔ اس کے بعد دو تین دن وہ اپنے بہنوئی کے ساتھ مصر کے تاریخی مقامات، باغات اور دریائے نیل کی سیر کرتے رہے۔ ان کے ماموں ایک مصروف آدمی تھے اس لئے ان کی معیت کا کوئی سوال نہیں ہوتا تھا۔[1]

مصر کا یہ سفر ان کی زندگی کا ایک تاریخی موڑ ثابت ہوا۔ اس سے ان کی ذات، فکر اور طریقہ کار پر بڑے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔[2] مصر میں ان دنوں طٰہٰ حسین کی کتاب "فی الشعر الجاھلی" اور شیخ عبدالرزاق کی کتاب "الاسلام واصول الحکم" کی اشاعت کی وجہ سے مخلص اور صحیح العقیدہ علماء و ادباء کی ایک جماعت کو اسلام اور اس کی تعلیمات کی صحیح ترجمانی کی فکر دامن گیر ہو گئی تھی۔[3] اس کے نتیجے میں مجلہ "الفتح" کا صدور اور "جمعیۃ الشبان المسلمین" کا قیام عمل میں آیا۔ یہ گویا بیسویں صدی میں دعوت اسلامی کی ابتداء تھی۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس سے قبل دعوت دین کا کام ٹھپ پڑا تھا بلکہ صحیح بات کہ یہ کام ہمیشہ انجام پاتا رہا ہے۔ البتہ اس سے پہلے اس کی نوعیت زیادہ تر انفرادی تھی اور وہ بھی ذکر و فکر کی حد تک محدود تھی۔ مجلہ "الفتح" کی اشاعت ۱۹۲۶ء میں عمل میں آئی تھی۔[4] مسلمانوں کی نشأۃ ثانیہ، ان کی اصلاح و ہدایت، جدید و قدیم کے درمیان رابطے کی استواری اور ملکی و بین الاقوامی مسائل میں مسلمانوں کو صحیح زاویۂ فکر کی طرف رہنمائی میں اس مجلے کا بہت بڑا حصہ ہے۔

---

[1] علی طنطاوی — ذکریات ص ۲۵۶-۲۴۳ ، [2] ایضاً ص ۲۴۹ ، [3] ایضاً ص ۲۵۶
[4] ایضاً ص ۲۵۹ ،

جہاں تک "جمعیۃ الشبان المسلمین" کا معاملہ ہے تو اس کے قیام میں بھی ان کے ماموں کا بہت بڑا رول ہے ابتداء میں اس کی سرگرمیاں مخفی رکھی گئیں۔ پھر جب حلقۂ تعارف وسیع ہوا تو باضابطہ ایک جلسۂ عام میں اس کے ذمہ داروں کو متعارف کرایا گیا۔ اس وقت اس کے صدر عبدالحمید سعید، سکریٹری محب الدین الخطیب اور خازن احمد تیمور پاشا تھے۔ استاذ سید محمد خضر حسین ابتداء میں اس تنظیم کے ساتھ تھے لیکن بعد میں انہوں نے الگ سے "جمعیۃ الھدایۃ الاسلامیۃ" کے نام سے ایک الگ جماعت بنالی۔ یوں تو یہ دونوں جماعتیں مصر کے دینی حلقوں میں متعارف تھیں لیکن ان کی سرگرمیاں کوئی خاص نتیجہ نہیں لاسکیں۔ نتیجے کے اعتبار سے دعوت کا اصل کام حسن البناء نے انجام دیا جو جدید تعلیم یافتہ، قادر الکلام اور مؤثر شخصیت کے مالک تھے۔[1]

مصر میں دو ماہ کی قلیل مدت تک قیام کرنے کے بعد وہ دمشق واپس لوٹ آئے۔ اس وقت تعلیمی سال کا آغاز ہوچکا تھا۔ ان کے پاس شعبۂ علوم سے بی۔ اے۔ کی ڈگری تھی انہوں نے وقت ضائع کئے بغیر مزید تعلیم حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ شعبہ فلسفہ میں داخلہ لے لیا۔ اور ایک سال کے اندر بی۔ اے۔ کی دوسری ڈگری حاصل کرلی۔ اس شعبے میں انہیں بعض دشواریاں بھی پیش آئیں۔ اگر خاندان اور شخصیت کا طویل مذہبی پس منظر نہ ہوتا تو شاید فلسفیانہ گتھیوں میں یہ ہمیشہ کے لئے الجھ کر رہ جاتے۔[2]

شیخ علی طنطاوی نے مصر سے واپسی کے بعد شام میں ان تجربات اور خطوط کار کے مطابق کام کرنا شروع کیا جو انہوں نے وہاں دیکھا اور حاصل کیا تھا۔ وہ خطابت اور صحافت میں سرگرم حصہ لینے لگے اور اپنے بعض ساتھیوں کے مشورے سے "جمعیۃ الشبان المسلمین" کے طرز پر "جمعیۃ الھدایۃ الاسلامیۃ" کے نام سے ایک اسلامی تنظیم کی داغ بیل ڈالی۔ ۱۹۳۰ء کا واقعہ

---

[1] علی طنطاوی — ذکریات ص ۲۶۱-۲۶۲ ، [2] ایضاً ص ۲۶۳ - ۲۶۲ ،

تھا۔ اس کا اصل مقصد شامی معاشرہ میں رائج بدعات و خرافات کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنا اور اصلاح کی سنجیدہ کوشش کرنا تھا۔ شیخ طنطاوی نے بعض رسوم و روایات کے خلاف مقالات لکھے اور انہیں پمفلٹ کی شکل میں شائع کیا۔[1]

۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۱ء تک کا زمانہ طنطاوی کے لئے تبدیلیوں اور تغیرات کا زمانہ تھا۔ انہوں نے اس میں مختلف نوعیت کے کام انجام دیئے۔ علماء و مشائخ کی صحبت اختیار کی۔ پرجوش اور مؤثر تقریریں کی۔ طلبہ کی قیادت کا فریضہ انجام دیا۔ اخبارات و جرائد میں مضامین لکھے۔ مقامی مکاتب میں درس و تدریس کی خدمت بھی انجام دی۔ ڈرامہ نگاری اور اس کی پیشکش کا بھی شوق ہوا۔ اسی دوران بی۔ اے۔ کی ڈگری حاصل کی اور "بکالوریس فی الآداب والفلسفۃ" کے لقب سے نوازے گئے۔[2]

تعلیم مکمل کر لینے کے بعد وہ مستقل سکونت کی غرض سے قاہرہ چلے گئے۔ وہاں انہوں نے مصری یونیورسٹی میں داخلے کی غرض سے اسناد پیش کر دیں۔ آرٹس فیکلٹی میں ان کی ملاقات ڈاکٹر طٰہٰ حسین اور ڈاکٹر عبدالوہاب عزام سے ہوئی۔ مؤخرالذکر سے یہ ملاقات مسلسل دوستی اور محبت میں تبدیل ہوگئی۔ ان دنوں مصر میں ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی بدنام زمانہ کتاب "فی الشعر الجاھلی" پر زبردست ہنگامہ برپا تھا۔ اسے ہوا دینے میں ان کے ماموں اور ان کے پیریس کا بڑا دخل تھا۔ اس کی وجہ سے طٰہٰ حسین کے ان سے تعلقات خراب ہوگئے۔ چنانچہ انہوں نے یونیورسٹی چھوڑ کر "دارالعلوم العلیا" میں داخلہ لے لیا۔ یہاں ڈرامہ نگاری سے ان کی دلچسپی ابھر کر سامنے آئی اور وہ بہت جلد طلبہ میں بے حد مقبول ہوگئے۔ لیکن یہاں ان کا دل نہیں لگا اور وہ اسے چھوڑ کر دمشق واپس چلے آئے۔[3]

---

[1] علی طنطاوی ــ ذکریات ص ۲۶۵-۲۷۳ ، [2] ایضاً ص ۲۷۵

[3] ایضاً ص ۲۷۵-۲۷۶ ،

دمشق واپس آئے تو "الجامعۃ السوریۃ" میں داخلے کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ انہیں گھریلو ضروریات کی وجہ سے کسی مناسب ذریعۂ معاش کی تلاش تھی۔ چنانچہ انہوں نے کئی ایک پرائمری اسکولوں میں تدریس کی خدمت انجام دی۔ اسی دوران انہیں یونیورسٹی سے ملحق ایک کالج میں بھی جز وقتی تدریس کا موقع ملا۔ یہاں انہوں نے بشار بن برد سے متعلق لکچرس دیئے اور انہیں یکجا کر کے ۱۹۳۰ء میں شائع کیا۔ اسی سال وہ باضابطہ طور سے صحافت کے میدان میں داخل ہوئے۔[1] یوں اس سے قبل وقتاً فوقتاً ان کے مقالات شامی اور مصری جرائد میں شائع ہوتے رہے۔ ان کا سب سے پہلا مضمون ۱۹۲۶ء میں اخبار "المقتبس" میں شائع ہوا تھا۔[2] مصر میں اپنے قیام کے دوران انہوں نے مجلہ "الفتح" اور مجلہ "الزہراء" میں بعض مضامین لکھے تھے۔[3] صحافت سے باضابطہ وابستگی کے بعد جن اخبارات و جرائد میں انہوں نے کام کیا یا ان کے مقالات شائع ہوئے ان میں اخبار "فتی العرب" اخبار "الف باء" مجلہ "الناقد" اور مجلہ "القبس" خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ "فتی العرب" میں وہ معاون مدیر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔[4] اس میں ان کے کل ایک سو چالیس مقالات شائع ہوئے۔ وہ اکثر و بیشتر اس کے پہلے صفحہ کا دوسرا مقالہ لکھا کرتے تھے۔ کبھی کبھی اداریہ بھی لکھتے تھے۔ اس اخبار میں ان کی کارکردگی کی مدت کل چھ ماہ ہے لیکن اس سے ان کو بہت فائدہ ہوا۔ اس کے مدیر استاد معروف ارناؤط ایک مشہور صحافی اور ادیب تھے۔[5] ان کی صحبت سے ان کو مالی فائدہ تو کم ہوا لیکن ادبی و صحافتی فوائد بہت زیادہ ہوئے۔ "فتی العرب" میں کام کے دوران ہی انہوں نے استاذ ادیب صفدی کے مجلہ "الناقد" میں بعض کہانیاں قسط وار شائع کیں۔ اس وقت ان کے زیادہ تر مقالات "ابو الہیثم" کے نام سے شائع ہوتے تھے۔ انہوں نے ان مقالات کو یکجا

---

[1] علی طنطاوی — ذکریات ص ۲۷۸-۲۸۲ ، [2] ایضاً ص ۲۸۱ ، [3] ایضاً ۲/۶ ،
[4] ایضاً ص ۹ [5] ایضاً ص ۱۱-۱۲ ،

کرکے "ہیثمیات" کے نام سے شائع کردیا۔[1] "فتی العرب" سے علیحدگی کے بعد انہوں نے "الف باء" میں کام کرنا شروع کیا۔ اس کے مدیر شام کے ایک کامیاب صحافی یوسف عیسیٰ تھے۔[2] اس اخبار میں طنطاوی نے زیادہ تر فلم اور فلمی کہانیوں پر لکھا۔ اس سے قبل وہ فلم بینی کے عادی نہیں تھے لیکن اس اخبار سے وابستگی کے بعد مجبوراً اس میں دلچسپی لینی پڑی۔ تاہم سینما ہالوں میں ان کی توجہ فلمی مناظر سے زیادہ اپنے کاغذ اور قلم پر مرکوز رہتی تھی۔[3] اس اخبار میں کام کے دوران ان کے بعض پرجوش اور جذباتی مقالات مجلہ "القبس" میں بھی شائع ہوئے۔[4] اس اخبار میں کام کے تھوڑے ہی دنوں کے بعد اس کے مدیر سے ان کے بعض معاملات میں اختلاف ہوگیا۔ جس کے نتیجے میں انہوں نے اس سے علیحدگی اختیار کرلی۔[5]

شیخ علی طنطاوی علماء و مشائخ اور جدید تعلیم یافتہ طبقے کے درمیان تال میل کے قائل تھے۔ بدقسمتی سے اس وقت شام میں بھی ان دونوں طبقوں کے درمیان فاصلے باقی تھے۔ دونوں کے اسالیب، طرز ہائے ادا اور طریقۂ فکر جدا جدا تھے۔ شیخ علی طنطاوی جدید تعلیم سے آراستہ تھے لیکن علماء و مشائخ کی صحبت سے قدیم علوم پر بھی ان کو دسترس حاصل تھی۔ انہوں نے ۱۳۴۸ھ میں بعض ایسے پمفلٹس شائع کئے جن میں اسلام کی سچی تصویر پیش کرنے کی کوشش کی اور اس کے تعلق سے علماء و مشائخ اور جدید تعلیم یافتہ طبقے پر کھلی تنقید کی۔ یہ تنقید بعض حکومتی اداروں پر بھی پڑی۔ ان پمفلٹس کا نام "رسائل الاصلاح" تھا۔ ان کی اشاعت کے بعد ہر طبقے کی طرف سے ان کی مخالفت شروع ہوگئی۔ اور انہیں مادی طور سے بھی بعض نقصانات اٹھانے پڑے۔[6] اس کے بعد انہوں نے "رسائل سیف الاسلام" کے نام سے پمفلٹس کی اشاعت کا ایک دوسرا سلسلہ شروع کیا

---

[1] علی طنطاوی — ذکریات ۲ ص ۲۲، [2] ایضاً ص ۳۰، [3] ایضاً ص ۳۱-۳۲،
[4] ایضاً ص ۳۳، [5] ایضاً ص ۳۳، [6] ایضاً ص ۳۴-۳۵،

یہ مختلف موضوعات پر کل دس رسائل تھے۔ ان میں انہوں نے بعض باطل افکار و نظریات کے علاوہ نماز کی اہمیت، دعوت اسلامی کے وجوب، قومی ادب اور مہدی موعود پر بھی اظہار خیال کیا تھا۔ یہ سب رسائل ۱۳۴۹ھ اور ۱۳۵۰ھ کے دوران بعض اہل خیر حضرات اور بعض تنظیموں کے تعاون سے شائع ہوئے۔[1]

شیخ علی طنطاوی بچپن سے تنہا زندگی گزارنے کے قائل تھے۔ ان کا محبوب مشغلہ تحریر و تقریر اور درس و مطالعہ تھا۔ لیکن ملکی حالات اور بعض اساتذہ اور طلبہ کی تحریک اور تشویق پر وہ سیاست کے میدان میں اترنے پر مجبور ہو گئے۔ اور اپنی تقریری صلاحیت، جوش و جذبہ، طرز استدلال اور وسیع معلومات کی وجہ سے عوام و خواص میں بہت جلد مقبول ہو گئے۔[2] یہاں تک کہ وہ ۱۹۲۹ء میں "لجنۃ العلیا لطلاب سوریا" کے صدر بنا دیئے گئے۔ اس سے قبل انہوں نے اپنے کالج کے بعض طلبہ کے اخراج کو لے کر سخت احتجاج کیا تھا۔ اس سے وطنی قیادت کی توجہ ان کی طرف مبذول ہو گئی۔ وطنی قیادت ان دنوں "الکتلۃ الوطنیۃ" کے نام سے جانی جاتی تھی۔ اس وقت یہ کوئی باضابطہ سیاسی پارٹی نہیں تھی۔ بلکہ وطن پرستوں کی اجتماعی کوششوں کا ایک نام تھی۔ اس کی طلبہ شاخ کا نام "اللجنۃ العلیا لطلاب سوریا" تھا۔ اس کمیٹی میں طلبہ کی تعداد بہت زیادہ نہیں تھی۔ لیکن اس کے اثرات پورے ملک میں محسوس کئے جاتے تھے۔[3]

۱۹۳۱ء میں جب "الکتلۃ الوطنیۃ" نے "الایام" کے نام سے ایک ترجمان نکالنے کا فیصلہ کیا تو شیخ طنطاوی کو اس کا داخلی مدیر بنا دیا گیا۔ اس کے چیف ایڈیٹر شام کی مشہور علمی و ادبی شخصیت استاذ عارف الکندی تھے۔ "الایام" شام کا پہلا

---

[1] علی طنطاوی ـــ ذکریات ۲/۲۹-۳۳، [2] ایضاً ۲/۵۶-۵۵،
[3] ایضاً ۲/۶۷-۶۲،

جریدہ تھا جو آٹھ صفحات پر مشتمل ہوتا تھا۔ اور جس میں متعلقہ افراد کا نام لے کر ان پر تنقید کی جاتی تھی۔ عوام میں اس کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ لوگ اسے لے جانے والی گاڑیوں پر ٹوٹ پڑتے تھے اور ہاتھوں ہاتھ لے لیتے تھے۔ اس کی خبروں کے انتخاب کا کام خاص طور سے شیخ طنطاوی کے ذمہ تھا۔ اس وقت ان کی عمر صرف ۲۳ برس کی تھی۔ اسی دوران دسمبر ۱۹۳۱ء میں عام انتخابات کا اعلان ہوا۔ مگر حکومت کی جانب سے بے ضابطگیوں کو دیکھ کر عوام نے احتجاج کر دیا اور معاملہ مسلح ٹکراؤ تک جا پہنچا۔ "الکتلۃ الوطنیۃ" نے انتخاب کے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا۔ جریدہ "الأیام" نے قوم کی مدافعت اور فرانسیسیوں پر تنقید میں دن بدن سختی کر دی جس سے تنگ آ کر حکومت نے اس پر پابندی عائد کر دی[1] پارٹی نے "الیوم" کے نام سے دوسرا جریدہ نکالا لیکن کچھ ہی دنوں میں اسے بھی بند کر دیا گیا[2] شیخ طنطاوی کو اس اخبار سے وابستگی کے ذریعہ دو فائدے حاصل ہو رہے تھے۔ ایک تو استاذ عارف الکندی کے علم، مردانگی، حق پرستی، اخلاق اور اعلیٰ ظرفی سے مستفید ہونے کا موقع مل رہا تھا[3] تو دوسری طرف اس سے ان کا معاشی مسئلہ بھی کسی حد تک حل ہو رہا تھا چنانچہ اخبار کے بند ہونے کے بعد وہ سخت قسم کی مالی پریشانیوں سے دوچار ہو گئے۔ ان کی حالت زار کو دیکھ کر ان کے ایک دوست نے ان سے حکومت کے کسی شعبے میں ملازمت کی پیشکش کی۔ ابتداء میں انہوں نے ٹال مٹول سے کام لیا کیونکہ وہ ملازمت کو اپنی حریت اور جرأت و بے باکی کے لئے ایک بڑا خطرہ سمجھتے تھے۔ لیکن سخت کشمکش کے بعد انہوں نے مجبوراً اس کے لئے آمادگی ظاہر کر دی۔ چنانچہ کچھ ہی دنوں میں انہیں وزارت معارف سے تقرری نامہ مل گیا۔ اس کی رو سے انہیں حمص اور حماۃ کے درمیان مشرق میں واقع ایک گاؤں "سلمیہ" کے مکتب میں

---

[1] علی طنطاوی — ذکریات ۲ ر ۱۰۳-۹۳ ، [2] ایضاً ص ۱۰۳ ، [3] ایضاً ص ۸۵-۸۲

تدریس کی خدمت انجام دینی تھی۔ انہوں نے وہاں پہنچ کر اپنا کام شروع کر دیا۔[1]

شیخ علی طنطاوی فلسفہ سے بی اے کرنے کے بعد مصر چلے گئے تھے وہاں سے واپس آئے تو یونیورسٹی میں داخلے کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ چنانچہ انہوں نے صحافت اور تدریس کا مشغلہ اختیار کیا لیکن ساتھ ہی حتی الامکان اپنی علمی و ادبی صلاحیتوں کو نکھارنے میں بھی مصروف رہے چنانچہ "مدرسۃ الآداب العلیا" میں داخلہ لے لیا۔ ان دنوں یہ شام کی وزارت معارف کی براہ راست نگرانی میں چل رہا تھا۔ یونیورسٹی سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس کی سند اس زمانے میں سب سے اہم اور معتبر سند مانی جاتی تھی۔ کیونکہ اس میں "کلیۃ الآداب" کے مضامین کے علاوہ اور بہت سے مضامین پڑھائے جاتے تھے۔ اس ادارے میں شیخ طنطاوی کے اہم اساتذہ میں استاذ شفیق جبری، شیخ عبد القادر المغربی، شیخ سعید البانی، سلیم الجندی اور استاذ مبارک تھے۔ استاذ کرد علی بھی اس میں تدریس کی غرض سے آئے تھے لیکن وہ کامیاب نہیں ہو سکے اور واپس چلے گئے۔ اس ادارے کے پرنسپل استاذ شفیق جبری تھے۔ وہ ہر ہفتہ کسی شاعر یا ادیب کے اوپر لکچر دیا کرتے تھے۔ ۱۹۲۹ء اور ۱۹۳۰ء کے دوران انہوں نے متنبی کے بارے میں بہت تفصیلی اور قسط وار لکچر دیا۔ وہ اپنا لکچر زیادہ تر لکھ کر لاتے تھے اور یہ کم از کم چھ صفحات پر مشتمل ہوتا تھا۔ یہ لکچر بڑا معلوماتی ہوتا تھا موصوف شام کے چار اہم شعراء میں سے ایک تھے۔ ۱۹۲۹ء میں انہوں نے اپنے ایک لکچر میں ادب کو سامان تفریح اور لہو و لعب قرار دیا۔ اس وقت چونکہ آزادی کی تحریک

---

[1] علی طنطاوی ـــ ذکریات ۲ / ۱۰۶ ـــ ۱۰۳ ،

بہت شباب پر تھی اس میں ادب سے بھی بھرپور مدد لی جارہی تھی۔ اس لئے شیخ طنطاوی نے اس پر اعتراض کیا اور پھر کئی دن تک بحث و مباحثے کا سلسلہ جاری رہا۔ جب باہمی گفت و شنید سے کوئی فیصلہ ہوتا نظر نہیں آیا تو انہوں نے عوام کے سامنے پیش کر دیا۔ اور اس مسئلے پر اپنے خیالات ایک مطبوعہ پمفلٹ کی شکل میں شائع کر دیا۔[1]

قرائن سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیخ طنطاوی نے مذکورہ ادارے سے کوئی ڈگری حاصل نہیں کی لیکن ظاہر ہے علمی و ادبی استفادہ تو خوب کیا۔ انہیں قانون کی تعلیم حاصل کرنے کا بے حد شوق تھا چنانچہ نومبر ۱۹۳۰ء میں شامی یونیورسٹی کی لا فیکلٹی (کلیۃ الحقوق) میں داخلہ لے لیا۔ اور ۱۹۳۳ء تک اس کے باقاعدہ طالب علم رہے۔ اس وقت یونیورسٹی میں ایک فیکلٹی اور تھی اس کا نام کلیۃ الطب (میڈیسن فیکلٹی) تھا۔[2] شیخ طنطاوی نے اس میں قانون کے بہت سے مضامین کی سبقاً سبقاً تعلیم حاصل کی۔ یہاں ان کے اساتذہ میں فارس بک خوری، شیخ ابوالیسر عابدین، سعید محاسن، فرانسیسی استاذ ستیف اور فایز خوری خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔[3] انہوں نے تعلیمی میدان میں رہتے ہوئے بھی تدریس اور صحافت سے اپنا تعلق باقی رکھا۔ تاکہ معاش کا مسئلہ حل ہو سکے۔[4] اس کے علاوہ ملکی سیاست میں سرگرم حصہ لیتے رہے۔ بسا اوقات ٹیوشن بھی کیا۔ اس وقت امتحانات میں حاضری کی ایک متعین مقدار حاصل کرنا ضروری تھا۔ اس کی وجہ سے انہیں بڑی دقتیں پیش آئیں۔ وہ حاضری لینے کے لئے وہ تمام طریقے استعمال کرتے تھے جو آج کل کے طلبہ استعمال کرتے ہیں۔[5] وہ امتحانات میں تھوڑی سی محنت کر کے اچھے نمبرات حاصل کر لیتے تھے۔ ان کے سامنے فیس

---

[1] علی طنطاوی - ذکریات ۲ / ۲۰۶ - ۲۰۲، [2] ایضاً ۲ / ۱۶۵ - ۱۶۳،
[3] ایضاً ص ۱۶۶-۱۷۳، [4] ایضاً ص ۱۷۵-۱۷۶، [5] ایضاً ۲ / ۱۸۱ - ۱۷۸،

کی ادائیگی کا معاملہ سب سے زیادہ اہم ہوتا تھا۔ کبھی کبھی اس کی عدم ادائیگی کی وجہ سے نام خارج ہونے کا اندیشہ ہو جاتا تھا۔ ۱۹۳۳ء میں ان کے ساتھ فارغ ہونے والے طلبہ کی کل تعداد ۲۵ تھی۔ ان میں بیرون ملک کے بھی طلبہ شامل تھے۔[1]

شعبۂ قانون میں تعلیم کے دوران ان کے ساتھ ایک بڑا حادثہ یہ پیش آیا کہ ۱۲ جولائی ۱۹۳۱ء کو ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔[2] ان کا مرض ابتداء میں بہت معمولی محسوس ہوا۔ لیکن والدہ کی طرف سے اپنے مرض کی شدت کو مخفی رکھنے کی کوشش، بچوں کی صحیح صورت حال سے عدم آگہی اور پھر ڈاکٹر کی بے توجہی اور غفلت کی وجہ سے یہ مرض مہلک ثابت ہوا۔[3] والد کے انتقال کے بعد تمام بھائی بہنوں کے لئے ماں ہی واحد سہارا تھیں۔ وہ ایک دیندار اور محنتی خاتون تھیں ابتداء سے لے کر ان کی پرورش و نشو و نما سنجیدہ ماحول میں ہوئی۔ انہوں نے بچوں کا اپنی بساط بھر خیال رکھا اور انہیں باپ کی جدائی کا احساس نہیں ہونے دیا۔[4] ان کے انتقال سے طنطاوی کو بہت شدید دھچکا لگا۔ وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے لیکن پھر موت کو ایک حقیقت سمجھ کر اسے تسلیم کر لیا۔ انہوں نے اپنی ماں کے انتقال اور بعد کے احوال جس طرح قلم بند کئے ہیں وہ ایک طرف ماں سے بیٹے کے والہانہ تعلق کو واضح کرتے ہیں تو دوسری طرف وہ زبان و بیان کے اعلیٰ نمونے ہیں۔[5]

شعبۂ قانون میں تعلیم اور "سلمیہ" گاؤں میں تدریس کے باوجود طنطاوی نے اپنی سیاسی مصروفیات جاری رکھیں۔ وہ فرانسیسی اقتدار کے خلاف سینہ سپر تھے اور طلبہ کی قیادت کا عظیم کام انتہائی خوش اسلوبی سے انجام دے

---

[1] علی طنطاوی ـ ذکریات ص ۱۸۳-۱۸۲ ، [2] ایضاً ص ۱۰۹ ، [3] ایضاً ص ۱۲۲-۱۲۳ ،
[4] ایضاً ص ۱۲۱-۱۲۰ ، [5] ایضاً ص ۱۳۳-۱۲۵ ،

رہے تھے۔ اسی درمیان انہوں نے ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کے طلباء کے لئے کوچنگ کا اہتمام کیا۔ اپنی علمی صلاحیت اور جدید ذرائع کے استعمال کی وجہ سے یہ کوچنگ بہت کامیاب رہی۔ ان کے پاس طلبہ کی ایک بڑی تعداد جمع ہوگئی تھی۔ اس سے انہیں مالی منفعت بھی ہوئی۔[1] ۱۹۳۱ء کا ایک واقعہ مجلہ "البحث" کی اشاعت تھی۔ مختلف دینی مقاصد کے تحت اسے شام کی ایک تنظیم "جمعیۃ التعلیم والتھذیب" نکالتی تھی۔ شیخ طنطاوی اس کے چیف ایڈیٹر تھے۔ اس میں انہوں نے اعزازی خدمات انجام دی تھیں۔[2]

جیسا کہ پیچھے گذر چکا ہے کہ طنطاوی نے مالی مشکلات پر قابو پانے کے لئے ۱۹۳۲ء میں "مدرسہ سلمیہ" میں نوکری کرلی تھی۔ یہاں ان کا زمانہ قیام تین ماہ سے زیادہ نہیں تھا۔ لیکن اس کے پرنسپل، اساتذہ اور طلبہ سے انہیں ایک قسم کا تعلق اور لگاؤ ہوگیا تھا۔ اسکول میں انہیں تاریخ، انشاء پردازی اور خطابت سے متعلق مضامین پڑھانے کے لئے دیئے گئے تھے۔ انہوں نے پوری محنت، لگن اور دلچسپی سے ان مضامین کو طلبہ کے ذہن میں مستحضر کرنے کی کوشش کی۔ اس اسکول میں تدریس کے دوران ان کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ شعبۂ قانون سے اپنی تعلیم کو مکمل کرنے کا تھا۔ اتفاق سے ان دنوں اس علاقے کے مکاتب اور مدارس کی نگرانی کی ذمہ داری ان کے ایک مشفق استاذ ڈاکٹر صبحی راغب کے پاس تھی۔ اس کی وجہ سے انہیں چھٹیاں مل جایا کرتی تھیں۔ امتحان کے بعد گرمائی تعطیلات گذارنے یہ گھر چلے آئے اور پھر ان کا دوبارہ جانا ممکن نہیں ہوا۔[3] کیوں کہ انہیں ستمبر ۱۹۳۲ء میں ایک دوسرے مقام "سقبا" کے اسکول میں منتقل کردیا گیا۔ یہ دمشق کے گرد و نواح میں

---

[1] علی الطنطاوی، ذکریات ص ۱۵۰ - ۱۵۲ [2] ایضاً ص ۱۵۲ - ۱۵۳

[3] ایضاً ص ۲۱۹ - ۲۲۸

سرسبز و شاداب علاقے کے عین وسط میں واقع تھا۔ بعد میں یہ دمشق ہی کا ایک حصہ بن گیا۔ اس مدرسے میں ان کی حیثیت پرنسپل کی تھی۔ وہ پہلی مرتبہ کسی مدرسے کا نظم سنبھال رہے تھے۔ انہوں نے مدرسے کی صفائی ستھرائی اور اس میں شجرکاری کی۔ اسکول کے اسٹاف میں اضافہ کیا۔ بچوں کی اخلاقی تربیت پر ان کی سب سے زیادہ توجہ تھی۔ وہ انہیں دینی، اخلاقی اور علمی اعتبار سے بلند دیکھنا چاہتے تھے۔[1]

مذکورہ بالا دونوں مدارس میں تدریس کے دوران ان کی سیاسی اور سماجی مصروفیات حسب سابق جاری رہیں۔ انہوں نے ملازمت کو اپنی حریت اور حمیت کے لئے خطرہ نہیں بننے دیا۔ وہ مختلف محاذوں پر سرگرم عمل تھے۔ طلبہ کی قیادت، اخبارات میں مضامین کی اشاعت، علماء و مشائخ کی صحبت اور اسلامی تنظیموں سے رابطہ، الغرض بہت سے محاذ تھے جن پر یہ ڈٹے ہوئے تھے۔ وہ جب چاہتے مسجد کے منبر پر تقریر کرنے کے لئے کھڑے ہو جاتے۔ لوگ ان کی آواز سے مانوس ہو گئے تھے۔ اس لئے وہ فوراً گوش بر آواز ہو جاتے تھے۔[2] اس زمانے میں ان کے جو مضامین مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوئے ان میں زیادہ تر وطن کی آزادی سے متعلق تھے۔ لیکن ادبی تنقید، تاریخی قصے، علمی نقد و تبصرے اور ذاتی افکار و خواطر سے بھی یہ خالی نہیں ہوتے تھے۔[3] ان کا ایک پسندیدہ موضوع "فلسطین" تھا۔ جو مغربی طاقتوں کی ریشہ دوانیوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ انہوں نے ۱۹۳۳ء میں اس مسئلے پر کئی ایک مضامین لکھ کر اس کے حقائق اور انجام سے لوگوں کو آگاہ کیا۔ ان مضامین میں بعض ایسے خطرات اور اندیشوں کی نشاندہی کی تھی جو بعد میں صحیح ثابت ہوئے۔[4] اسی زمانے میں انہوں نے حافظ

---

[1] علی الطنطاوی، ذکریات ص ۲۶۳ - ۲۷۲ ج ۲ [2] ایضاً ص ۲۷۳ ج ۲۔

[3] ایضاً ص ۲۷۲ ج ۲ [4] ایضاً ص ۲۷۲ - ۲۸۲

ابراہیم کے انتقال پر ایک مقالہ لکھا تھا۔ دمشق میں اس عظیم عرب شاعر کے انتقال کے دو ماہ بعد تک کوئی تعزیتی جلسہ نہیں تھا۔ انہوں نے اس پر اپنے سخت تعجب اور حیرت کا اظہار کیا۔ ان کے اس مضمون سے دمشق کے علمی و ادبی حلقوں میں ہلچل مچ گئی اور فوراً تعزیتی جلسے منعقد کیے گئے[1]۔

---

[1] علی الطنطاوی، ذکریات ج ۲ ص ۲۳۶ - ۲۴۰

کتاب پر ایک تجزیاتی نظر

شیخ علی طنطاوی کی یہ کتاب جیسا کہ ابتداء میں وضاحت کی جا چکی ہے ان کی منتشر اور بکھری ہوئی یادوں کا مجموعہ ہے۔ یہ کوئی باضابطہ خود نوشت سوانح حیات نہیں ہے۔ اس میں کسی طرح کی ترتیب اور تسلسل کا لحاظ نہیں رکھا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مصنف کے پاس یادوں کا کوئی تحریری ذخیرہ نہیں تھا۔ مختلف واقعات کے تعلق سے جو یادیں ان کے ذہن میں باقی رہ گئی ہیں بس ان ہی کو قلم قلمبند کرنے پر التفا کیا ہے۔ غالباً اسی وجہ سے انہوں نے اس کتاب کا نام "مذکرات" کے بجائے "ذکریات" رکھا ہے۔ ان یادوں کو تحریر کرتے ہوئے مصنف نے کئی بار ان سے دامن بچانے کی کوشش کی کیونکہ ان کے ذہن میں یہ سلسلہ ایک لاحاصل اور بے فائدہ کوشش معلوم ہوتی تھی۔ تاہم اپنی عمر کے لحاظ سے مزید کوئی ٹھوس علمی کام کرنے کی سکت نہ ہونے اور ایک معمر فرد کے تجربات سے نئی نسل کو کچھ فائدہ پہنچنے کی موہوم امید سے وہ یہ سلسلہ پھر شروع کر دیتے تھے۔ وہ ان یادوں کی تاریخی اہمیت کے بارے میں مشکوک ہیں۔ کیونکہ یہ کسی سپہ سالار، امیر کبیر یا بادشاہ وقت کی یادیں نہیں ہیں۔ یہ محض ایک لکھنے پڑھنے والے فرد کی یادیں ہیں۔ اسی وجہ سے وہ اپنے بجائے زیادہ دوسروں کے بارے میں بات کرنا پسند کرتے ہیں[1]۔ انہوں نے اس بات کی بھی وضاحت کر دی ہے کہ یہ یادیں جرح و تعدیل اور تحقیق و تفتیش کے اصولوں پر پوری نہیں اترتی ہیں۔ یہ کام تو مؤرخین اور رواۃ کا ہے۔ انہوں نے صرف اپنے ذاتی احساسات و جذبات کو منتقل کرنے کی کوشش کی ہے[2]۔ وہ یادوں کے اس سلسلے کے طویل ہونے

---

[1] علی الطنطاوی، ذکریات ج ۱ ص ۱۱۶ [2] ایضاً ص ۲۶۵

اور سفرِ زندگی کی روداد لکھنے میں اپنی سست روی پر اظہارِ افسوس کرتے ہیں اور آئندہ تیز چلنے کا عزم کرتے ہیں[1]۔ وہ انسان کے مزاج اور جسم میں واقع ہونے والی تبدیلیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ یادیں فردِ واحد کی نہیں بلکہ بہت سے افراد کی ہیں[2]۔ اپنے حافظہ کی کمزوری اور صفحۂ ذہن سے بہت سی قیمتی یادوں کے محو ہو جانے کی مثال دیتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:۔

"ان یادوں کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کسی آفس میں کچھ کاغذات رکھے ہوں اچانک ان پر پانی پھیل جانے کی وجہ سے ان کے حروف اور سطریں مٹ گئی ہوں بس فقط چند صفحات باقی رہ گئے ہوں۔"[3]

اس کتاب میں بہت کثرت سے اصل مباحث کے ساتھ دوسرے امور و مسائل سے تعرض کیا گیا ہے۔ اسے عربی زبان میں استطراد کہا جاتا ہے۔ انہوں نے اس میں متعدد مقامات پر اپنی اس کمزوری کا اعتراف کیا ہے۔ چنانچہ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں:۔

"میں معذرت خواہ ہوں۔ میری مثال اس آدمی کی طرح ہے جو اپنے کھیتوں کے درمیان پیدل چل رہا ہو بس اسے کسی باغ کا منظر بہت پسند آجائے اور وہ اس میں ٹہلتا ہوا دور نکل جائے۔ اسے یہ بھی نہ معلوم ہو سکے کہ اب اسے کہاں جانا ہے؟ عربی ادب کا جن لوگوں نے بھی بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے استطراد ان کی مجبوری بن جاتا ہے۔ خاص طور سے جاحظ کا مطالعہ کرنے والا تو ضرور اس کا عادی ہو جائے گا۔ وہ استطراد کے بانی ہیں۔ ..... یہ ایک ایسی کمزوری ہے جس سے میں نجات نہیں پا سکتا۔ بس اسے برداشت کیجئے۔ زیادہ سے زیادہ دبیر حضرات سے درخواست کیجئے کہ وہ کچھ کاٹ چھانٹ کر دیا کریں۔"[4]

---

[1] علی الطنطاوی، ذکریات ج ۱ ص ۸۱ [2] ایضاً ص ۱۸۳

[3] ایضاً ص ۱۸۵ [4] ایضاً ج ۲ ص ۷۳۔

اس کتاب میں اگر استطراد کی مثالیں تلاش کی جائیں تو کثیر تعداد میں ملیں گی۔ صورت حال یہ ہے کہ پورے پورے ابواب استطراد کے طور پر موجود ہیں۔ بقیہ بیچ بیچ میں تو یہ ہر صفحے پر موجود ہے۔ جہاں کہیں بھی دمشق، دریائے بردیٰ، اور جبل قاسیون کا نام آتا ہے مصنف بے اختیار اپنے ماضی کی یادوں میں گم ہو جاتے ہیں اور پھر ان کا ایک طویل سلسلہ صفحۂ قرطاس کی زینت بن جاتا ہے۔ ان کے علاوہ مصنف کا یہ معمول ہے کہ وہ ایک یاد سے دوسری یاد اور ایک تذکرے سے دوسرے تذکرے کی طرف منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ مثلاً کسی ایک شاعر کا ذکر ہو رہا ہو تو پھر تمام معاصر شعراء کا ذکر آ جاتا ہے۔ اسی طرح ایک استاذ کا ذکر آیا تو پھر بہت سے اساتذہ یاد آ جاتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

اس کتاب کے مطالعہ سے یہ حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ مصنف کو اسلام، اسلامی تعلیمات، مسلمانوں کے مسائل، مسلم ثقافت اور مسلم قوم کی تعمیر و ترقی اور کردار سازی کی بے حد فکر ہے۔ وہ اپنی یادداشتوں کے دوران جگہ جگہ خدا، رسول، آخرت اور حساب و کتاب کا ذکر کرتے ہیں۔ انہیں عثمانی خلافت کے زوال پر بے حد افسوس ہے۔ وہ اسے یہودیوں، عیسائیوں اور مشرکوں کی سازشوں کے خلاف ایک مضبوط محاذ سے تعبیر کرتے ہیں۔ مصطفیٰ کمال پاشا وغیرہ کو وہ یہودیوں کا ایجنٹ قرار دیتے ہیں[1]۔ انہوں نے عالم اسلام پر عثمانی خلافت کو ایک نعمت قرار دیا ہے۔ اور اسے برا بھلا کہنے والوں کو صحیح نقطۂ نظر کا حامل سمجھا ہے[2]۔

انہوں نے اسلامی تعلیمات کے پیش کرنے کا طریقہ یہ اختیار کیا کہ مختلف افراد، واقعات اور حادثات کا ذکر کرتے ہوئے بیچ میں مناسب موقع پر کوئی ایک دینی تعلیم پیش کر دی ہے۔ مثلاً اپنے ساتھیوں اور اساتذہ میں سے بیشتر کی رحلت کا ذکر کر کے دنیا کی بے ثباتی اور

---

[1] علی الطنطاوی، ذکریات ج ۲ ص ۳۶۔ [2] ایضاً ج ۱ ص ۸۹

اس کے فنا پر روشنی ڈالی ۔ مسئلہ فلسطین کا ذکر کرتے ہوئے جہاد اور اس کی فضیلت سے لوگوں کو آگاہ کیا۔ اپنے زمانے کے سنجیدہ ماحول کا تذکرہ کرکے آج بگڑے ہوئے معاشرے پر لعن طعن کی ۔ وغیرہ ۔ مسلم ممالک کے مسائل میں وہ سب سے زیادہ مغربی استعماریت کو اہمیت دیتے ہیں ۔ چنانچہ اس کے خلاف بہت زیادہ لکھا ہے ۔ انہوں نے انگریزوں کی غداری، فرانس میں شام کی بے جا مداخلت، قدیم شام کی تقسیم، فلسطینی ریاست کے قیام اور فلسطین و لبنان میں یہودیوں کے مظالم پر بڑے جذباتی انداز میں اظہار خیال کیا ہے ۔ یہودیوں کو وہ چنگیز اور ہلاکو خاں سے بڑا ظالم سمجھتے ہیں[1]۔

اسلام اور مسلمانوں سے گہری محبت اور تعلق کا اظہار اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اپنی تمام تر علمی و ادبی صلاحیتوں کو اسلام کی نشر و اشاعت اور قوم کی خدمت کے لیے وقف کر دیا ۔ یہ صرف ان کی ذاتی زندگی تک محدود نہ رہا بلکہ انہوں نے معاصر ادباء اور شعراء کو بھی اس کی طرف متوجہ کیا ۔ اس سے ادب اور ادیب کے بارے میں ان کے مستقل نظریات کا پتہ چلتا ہے ۔ ذیل میں اس سلسلے کے دو تین اقتباسات درج کیے جا رہے ہیں :

"ادیب کو اپنی قوم کے محاسن کا ترجمان، اس کی عزت و آبرو کا محافظ اور اسے مجد و شرف سے ہمکنار کرنے والا ہونا چاہیے ۔ کیا ہمارے پاس کوئی ایسا ادیب ہے جو قوم کی تکالیف اور اس کی امیدوں سے واقف ہو ۔ اور اس نے قوم کی خوشیوں اور مصیبتوں کا جائزہ لیا ہو اور ان کی تصویر کشی کے لیے اپنی تمام صلاحیتیں وقف کر دی ہوں ۔ ہمیں نئی نسل کے ان نوجوانوں

---

[1] علی الطنطاوی ، ذکریات ج ۲ ص ۵۷ - ۵۸

سے امید تھی جو ادب کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور ساتھ ہی وطنی جذبہ سے بھی سرشار ہیں۔ لیکن سخت افسوس ناک بات ہے کہ ہمیں اپنے ہی لوگوں کی طرف سے یہ صدا سنائی دے رہی ہے کہ ادب کو وطن کی خدمت کے لئے وقف نہ کرو۔ اپنے آپ کو اس کی دم سے نہ تھکاؤ۔ بس کھیلو اور تفریح کرو۔ ادب تو محض تفریح کا ایک سامان ہے۔"[1]

"اگر ادب زندگی سے متعلق نہ ہو تو اسے ادب کہنا غلط ہے۔ اور کوئی ادب زندگی سے متعلق ہو ہی نہیں سکتا جب تک وہ اس میں پوری طرح داخل نہ ہو۔ وہ زندگی کے اچھے اور برے پہلوؤں سے واقفیت حاصل کرے اور پھر ان کی طرف لوگوں کو متوجہ کرے یا انہیں دور رہنے کی تلقین کرے۔"[2]

"ادب قوم کو مہمیز دیتا ہے، حوصلوں کو بلند کرتا ہے اور ہمتوں کو یکجا کرتا ہے۔ ادب سے سونے والا بیدار ہو جاتا ہے اور غافل متنبہ ہو جاتا ہے۔ تو اے ادبائے عرب! تم کہاں ہو؟ فلسطین کے مسئلے پر تم کیوں خاموش ہو؟ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ ماضی میں زبان و بیان کی طاقت سے قوموں کی تقدیریں پلٹ گئیں۔ (چند مثالیں) تمہارے فلسطینی قصائد کہاں گئے؟ وہ آزاد اور مومن قلم کہاں گیا جو رضاکارانہ طور پر آگے بڑھے اور معرکۂ فلسطین کا ہراول دستہ ثابت ہو۔"[3]

---

[1] علی الطنطاوی، ذکریات ج ۲ ص ۲۰۴ [2] ایضاً ص ۲۰۶

[3] ایضاً ص ۲۷۵ .

شیخ علی طنطاوی کا ایک بڑا وصف یہ ہے کہ وہ حد سے زیادہ جری اور بے باک ہیں۔ اپنی عزت نفس کا پاس و لحاظ ان کے یہاں سب سے مقدم ہے۔ وہ اگر اسلام یا اسلامی شعائر کے خلاف کوئی بھی بات سنتے ہیں تو ان کی رگ حمیت بھڑک اٹھتی ہے۔ اپنی یادوں کے اس مجموعے میں انہوں نے جا بہ جا اپنے اس وصف کا تذکرہ کیا ہے اور اس کے عملی مظاہر پیش کئے ہیں۔ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں :-

"مجھ پر ایام شباب سے جرأت و بے باکی اور اقدام کا الزام لگایا جاتا رہا ہے واقعتاً میں صاف گو اور تیز زبان واقع ہوا ہوں میں اگر کوئی بات کہتا ہوں تو نتائج کی کوئی پروا نہیں کرتا۔"[1]

انہوں نے ایک مقام پر اس کی مزید تفصیلات بتاتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ زندگی میں ان کی سب سے قیمتی شئی ان کی عزت و کرامت ہے۔ وہ خدا کے علاوہ کسی کے آگے اپنی گردن نہیں جھکا سکتے۔ کسی حاکم اور رئیس کے سامنے جھکنے کا کوئی سوال ہی نہیں۔ ان کا جائز ادب و احترام اپنی جگہ پر لیکن اس سے آگے اور کسی عمل کی کوئی گنجائش نہیں۔[2]

ان کی جرأت و ہمت کا سب سے بہترین مظاہرہ اس وقت ہوا جب کہ ایک فرانسیسی افسر نے ان کے اسکول کا دورہ کرنا چاہا۔ اس موقع سے اس کے استقبال کا ایک پروگرام رکھا گیا۔ لیکن انہوں نے اس کے خلاف ایک پر جوش تقریر کی۔ اس وقت ان کی عمر ۱۴ سال کی تھی۔ مگر یہ تقریر اس قدر مؤثر اور جامع تھی کہ تقریباً تمام طلبہ اور نصف اساتذہ نے استقبالیہ میں شرکت نہیں کی۔[3] اسی طرح دوسری مثال وہ بحث ہے جو انہوں نے اپنے استاذ شفیق جبری کے ایک لکچر پر ان سے کی تھی۔ انہوں نے اپنے اس لکچر میں ادب کو تفریح اور تعیش کا

---

[1] علی الطنطاوی، ذکریات ج ۲ ص ۵۳۔ [2] ایضاً ص ۲۱۰

[3] ایضاً ج ۱ ص ۹۹۔

ایک سامان بنایا تھا۔ ملکی حالات کے تئیں یہ ضرورت شدت سے محسوس ہو رہی تھی کہ علماء و ادباء ان حالات میں اپنا مؤثر کردار ادا کریں۔ اس لئے طنطاوی نے ان کی شدید مخالفت کی اور ان سے کئی روز تک بحث کرتے رہے۔ جب اس سے کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا تو انہوں نے اپنے خیالات کو ایک پمفلٹ کی شکل میں لوگوں کے سامنے پیش کر دیا۔[1] اس طرح کی اور بھی مثالیں اس کتاب میں موجود ہیں۔

کتاب "ذکریات" معلومات کا ایک خزانہ ہے۔ یہ صحیح معنوں میں اپنے دور کی ترجمان ہے۔ شام کے سیاسی اور سماجی حالات سے متعلق بعض بڑی اہم باتیں اس سے معلوم ہو جاتی ہیں۔ شامی انقلاب کے ایک عینی شاہد کی یہ روداد سفر انقلاب سے متعلق بعض ایسے حقائق سے پردہ اٹھاتی ہے اور بعض ایسی شخصیات کے کارناموں سے لوگوں کو واقف کراتی ہے جو اب تک نگاہوں سے اوجھل تھے۔ اس میں اس وقت کے تعلیمی نظام، اساتذہ اور تعلیمی اداروں کا بھی مفید تعارف موجود ہے۔ اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے دمشق اور وہاں کے قدرتی مناظر کا ایک جاذب نظر اور دلکش نقشہ پیش کر دیا۔ ایک ایسا نقشہ جسے پڑھ کر دیکھنے کا بے اختیار دل چاہنے لگتا ہے۔ اس میں دمشق کی آب و ہوا، مکانات، سڑکیں، ندیاں، پہاڑ، رسم و رواج، کھانے پینے کی اشیاء اور اس کے طور طریقے الغرض بہت کچھ تفصیلات موجود ہیں۔ طنطاوی دمشق کے بار بار تذکرہ کو اپنی مجبوری بتاتے ہیں کیونکہ اس کی محبت ان کی رگ و پے میں سرایت کر گئی ہے۔ اس کے حسین مناظر ہر وقت ان کی نگاہوں کے سامنے رقص کرتے ہیں۔ وہ ہر لمحہ غوطۂ دمشق کی خوشبو محسوس کرتے ہیں۔ اس لئے ظاہر ہے وہ اسے بھلا نہیں سکتے۔

---

[1] علی الطنطاوی، ذکریات ج ۲ ص ۲۰۲ - ۲۰۶

أسائل لا أنسى ذكرها فكأنها ÷ تمثل لی لیلی بکل طریق[1]

انہوں نے اس کتاب میں متعدد مقامات پر دمشق اور جامع اموی کی تاریخ بتائی ہے۔ ان کے بیانات کے مطابق دمشق دنیا کا قدیم ترین شہر ہے۔ یہ بنوامیہ اور بنوایوب کا پایۂ تخت رہا ہے۔ دنیا کے ایک تہائی حصے پر اس کی حکومت رہ چکی ہے[2]۔ اگر دار خضراء سے کوئی حکم صادر ہوتا تھا تو مشرق و مغرب میں فوراً نافذ ہو جاتا تھا۔ پھر وہ اس کے انجام بد اور اس کے عواقب پر بھی روشنی ڈالتے ہیں[3]۔ دمشق کے فطری مناظر میں وہ سب سے زیادہ اس کے سرسبز و شاداب علاقوں (غوطۂ دمشق) سے متأثر تھے۔ جبل قاسیون کی خاموش طبعی اور شہر پر اس کے سایۂ عاطفت سے بھی وہ مرعوب ہیں اور ان کا بار بار تذکرہ کرتے ہیں[4]۔ جہاں تک جامع اموی کا تعلق ہے تو یہ دمشق کا قلب ہے۔ اسی طرح جیسے مکہ کا قلب حرم پاک اور قاہرہ کا قلب جامعہ ازہر ہے۔ یہ عالم اسلام کی چار بڑی اور قدیم مساجد میں سے ایک ہے[5]۔ دمشق کا تذکرہ اور اس کا تعارف بہت کثرت سے پیش کرنے کے باوجود مصنف کی جذباتی تسکین نہیں ہوئی۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں :—

"میں ان کی تصویر کشی سے قاصر ہوں۔ صحیح بات یہ ہے کہ الفاظ سے جذبات و خواطر کی تعبیر ممکن نہیں۔ جب ان سے مشاہدات کائنات کی تصویر کشی نہیں کی جا سکتی تو آخر نفس کے احساسات کیسے پیش کئے جا سکتے ہیں[6]؟"

شیخ علی طنطاوی عربی زبان کے ماہر ادیب ہیں۔ انہوں نے جو کچھ تحریر کیا وہ فصاحت و بلاغت کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ صاف، مدلل اور سیدھے انداز میں اپنی بات کہہ دینا ان کا طرۂ امتیاز ہے۔

---

[1] علی الطنطاوی، ذکریات ج ۲ ص ۱۲۵ [2] ایضاً ص ۱۲۵ [3] ایضاً ج ۱ ص ۹۶

[4] ایضاً ص ۹۰ [5] ایضاً ج ۲ ص ۱۲۶ [6] ایضاً ج ۱ ص ۱۱۰۔

وہ صحیح معنی میں جدید عربی ثقافت کے نمائندہ ہیں۔ انہوں نے دینی اور عصری علوم کا بالاستیعاب مطالعہ کیا تھا۔ عربی زبان، ادب اور قواعد کے مسائل پر انہیں پورا عبور حاصل ہے۔ انہوں نے جدید و قدیم قوانین کی عمیق اور ٹھوس معرفت حاصل کی تھی۔ اس پورے سرمایے کا ان کے اسلوب اور طرز تحریر پر براہ راست اثر مرتب ہوا۔ چنانچہ ان کی کتاب "ذکریات" کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو اس میں اگر ایک طرف قرآن مجید کے الفاظ اور اسالیب ملیں گے[1] تو دوسری طرف بے شمار جدید الفاظ اور اسالیب ملیں گے[2]۔ اسی طرح اگر ایک طرف قدیم عربی شاعری سے جگہ جگہ استشہاد ملے گا[3] تو دوسری طرف جدید عامی زبان کے بہت سے الفاظ، تراکیب اور محاورے ملیں گے[4]۔ اس طرح یہ کتاب جدید و قدیم کے درمیان ایک معتدل اور دونوں سے مستفاد اسلوب کی نمائندگی کرتی ہے۔ مصنف جاحظ سے بہت متأثر ہے۔ اس لئے ان کے اسلوب مرسل کی جھلک اس کتاب میں صاف نظر آتی ہے۔ طرز استدلال منطقی ہے۔ اپنی بات پیش کرنے کے لئے تمثیلات اور تشبیہات سے بہت زیادہ مدد لی گئی ہے۔ یہ تمثیلات اور تشبیہات بے حد برمحل معلوم ہوتی ہیں۔ اور ان سے ان کا مفہوم و مدعا بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ بطور مثال ایک دو تمثیلات درج ذیل ہیں۔ وہ اپنے والد محترم کے انتقال کے بعد اپنے اور اپنے گھر کے لوگوں کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"کنا فی خیمة تسترنا عن العیون وتظللنا من الشمس وتدفع عنا لفح الحر ولذع البرد وعصف الریاح فکسر عمود الخیمة فانحطت فوق رؤسنا فلما خلصنا منها إذا نحن مکشوفون معرضون للأخطار، تأکلنا الأخطار ملا تحمینا درع ولا یسترنا ستار"

"ہم ایک ایسے خیمے میں تھے جو ہمیں لوگوں کی نظروں سے بچاتا تھا۔ سورج کی گرمی سے سایہ

---

[1] بطور مثال ملاحظہ ہو۔ ذکریات ج ۱ ص ۱۵۱، ج ۲ ص ۵۸ [2] مثلاً، ذکریات ج ۱ ص ۸۹، ج ۲ ص ۲۰۹ [3] مثلاً: ذکریات ج ۱ ص ۹۱، ۹۹، ۱۰۷ [4] مثلاً: ذکریات ۱/۸۸، ۱/۱۹۲،

فراہم کرتا تھا۔ اور ہمیں سرماں گرماں اور تند ہوا کے مضر اثرات سے محفوظ رکھتا تھا پس اچانک اس خیمے کا اصل ستون ٹوٹ گیا اور وہ ہمارے سروں پر گر پڑا۔ جب ہم اس سے بچ بچا کر نکلے تو اچانک اپنے کو برہنہ اور خطرات میں گھرا ہوا پایا۔ لوگوں کی نگاہیں ہماری طرف اٹھ رہی ہیں لیکن وہاں ہماری حفاظت اور ستر پوشی کے لئے کوئی زرہ یا پردہ نہیں ہے۔"[1]

ایک دوسرے مقام پر انہوں نے امت مسلمہ کے خلاف مغربی طاقتوں کی پیہم سازشوں، امت کی غفلت، بعد میں اس کے اندر بیداری کی ہلکی سی لہر اور پھر گہری نیند کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"کنا کالأسد فی غابة لما سار الخاب وتوارت منه الذئاب ولم یصمد له ظفر ولا ناب، المأن وسکن واسترخی فأدرکه النعاس وغلبه الوسن فلما استغرقه المنام استیقظت الذئاب وطمعت فیه الثعالب ولکن الاسد یبقی اسدا ولو نام والجوهر لا یصیر زجاجا ولو رمیته فی الوحل..... لقد اخذ الاسد یستیقظ، إنه یمد یدیه ثم یسترخی فیعاود المنام۔"[2]

ہماری مثال جنگل کے اس شیر کی طرح ہے جس کی سیادت کا جب جنگل میں ڈنکا بج گیا اور بھیڑیئے اس سے چھپ گئے اور وہاں کوئی اس کا مدمقابل نہیں بچا تو وہ آرام سے مطمئن ہو کر بیٹھ گیا پھر اسے نیند آئی اور سو گیا۔ اس کی گہری نیند کے دوران بھیڑیئے اور لومڑیاں بیدار ہو گئیں اور انہوں نے اپنا اپنا کام کیا۔ لیکن شیر بہرحال شیر رہتا ہے خواہ وہ کتنی ہی گہری نیند سو جائے۔ جوہر کبھی اپنی تاثیر اور اصلیت بدل نہیں سکتا خواہ اسے کتنے ہی کیچڑ میں پھینک دیا جائے.....

بلاشبہ یہ شیر بیدار ہوا چاہتا ہے وہ انگڑائی بھی لیتا ہے لیکن اس پر دوبارہ نیند طاری ہو جاتی ہے۔ اور وہ سو جاتا ہے۔

---

[1] علی الطنطاوی، ذکریات ج ۱ ص ۱۷۷

[2] ایضاً ص ۲۰۹ ج ۱

اس کتاب کا ہر صفحہ فصیح عربی زبان کا اعلیٰ نمونہ پیش کرتا ہے۔ بعض صفحات اور بعض عبارتیں تو کئی کئی بار پڑھنے کی طبیعت چاہتی ہے۔ یہ امر انتہائی قابل افسوس ہے کہ انسانی، اخلاقی اور دینی اقدار کے حامل ادباء کو اور زبانوں کی طرح عربی زبان وادب میں بھی وہ اہمیت نہیں دی گئی جس کے وہ مستحق تھے۔ ان کے بجائے مخرب اخلاق، منحط ذہن اور مادہ پرست ادباء کو یہاں بھی داد و دہش اور انعام واکرام سے نوازا جاتا ہے۔ شیخ علی طنطاوی کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ ورنہ ان کی شگفتہ اور شستہ زبان وبیان کی آج ہر طرف سے ستائش کی جاتی۔ بہرحال اگر آج کا زمانہ ایسے باضمیر اور غیور ادباء کی قدر نہیں کر پا رہا ہے تو امید کی جاتی ہے کہ آئندہ آنے والی نسلیں اس کا اعتراف کریں گی اور تاریخ ادب وتنقید میں اس کو اعلیٰ مقام دیں گی۔ جیسا کہ کے ساتھ ہوا۔ ان کی زندگی میں ان کی عظمت سامنے ابھر کر نہیں آئی

یہ کتاب چونکہ مکمل خود نوشت سوانح حیات نہیں ہے اس لئے اس پر آپ بیتی کی حیثیت سے فنی گفتگو کرنا بے سود اور لاحاصل ہے۔ یہ کتاب تو کچھ منتشر یادوں کا مجموعہ ہے۔ اسے تحریر کرنے کا کوئی منصوبہ، لائحہ عمل اور پروگرام پہلے سے ذہن میں نہیں تھا۔ اس لئے اس کے بارے میں یہ بتانا کہ یہاں زمانی ترتیب اور تسلسل ملحوظ رہا ہے یا نہیں؟ اس طرح مصنف نے وراثت، ماحول، عہد طفولیت، ایام شباب اور عہد کہولت کے تمام تجربات بیان کئے ہیں یا نہیں؟ میرے خیال میں وقت کے ضیاع کے علاوہ

اور کچھ نہیں۔ اس لئے میں قصداً ان امور سے اجتناب کر رہا ہوں۔ البتہ اخیر میں میں اپنے اس احساس کو منتقل کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ مصنف نے اس کتاب میں صرف اپنے حسین تجربات اور عمدہ حکایات کو پیش کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ ان کی زندگی کے بعض دوسرے پہلو جو ان کی شخصیت کے منفی گوشوں کو نمایاں کرتے اس کتاب میں سرے سے ناپید ہیں۔ مصنف نے اپنی اس کتاب میں زندگی کے مثبت پہلوؤں کے پیش کرنے پر کچھ اس قدر زور دیا ہے کہ کہیں کہیں غیر شعوری طور پر وہ فخر و غرور میں مبتلا نظر آتے ہیں[1]۔ لیکن بہرحال ایسا بہت کم مقامات پر ہوا ہے۔ اور بالعموم انہوں نے خود اسے محسوس کرکے اس سے برأت کا اظہار کر دیا ہے۔ مثلاً ایک مقام پر وہ لکھتے ہیں:۔

"مکتب عنبر سے سب سے بڑا فائدہ مجھے یہ پہنچا کہ میں نے عربی زبان اور عربی علوم پر مکمل دسترس حاصل کر لی۔ میں معذرت خواہ ہوں۔ میں نے یہ بات فخر کے باعث نہیں کہی ہے، بلکہ میں اس کا بطور تحدیث نعمت ذکر کر رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے "وأما بنعمة ربك فحدث"۔[2]

ماشاء اللہ مصنف ابھی تک باحیات ہیں اور کبر سنی کے باوجود ان کا قلم رواں دواں ہے۔ اگر انہوں نے "ذکریات" کے سلسلے کو اس دور تک مکمل کر لیا تو ہماری نظر میں یہ سلسلہ شام ہی نہیں بلکہ تمام عرب ممالک کے سیاسی، تعلیمی، ادبی اور دینی تحریکوں کی عظیم الشان دستاویز ہوگی۔ جس میں حقائق کے ساتھ ساتھ مصنف کا فکر پوری طرح سے جلوہ گر ہوگا۔ استاذ علی طنطاوی رافعی اسکول کے روشن چراغ تھے۔ وہ اپنے ماموں محب الدین الخطیب کی فکر کے علمبردار تھے، کرد علی

---

[1] بطور مثال ملاحظہ ہو، علی الطنطاوی، ذکریات ج ۲ ص ۱۱۲، ۵۴، ۶۶

[2] ایضاً ج ۱ ص ۱۵۳۔

کے تاریخی افکار و نظریات کے مبلغ اور خود ایک نئے طرز بیان کے موجد ہیں۔ اس لئے "ذکریات" کے اس سلسلے میں اگر فنی لحاظ سے کوئی سقم پایا بھی جاتا ہو تو ادبی اعتبار سے یہ اساتذہ و طلباء کے لئے سنگ میل کی حیثیت رکھے گا۔

مراجع ومصادر

كتابيں

(١) ابراهيم عبد القادر المازنى — ابراهيم الثانى — دار المعارف القاهرة ١٩٤٣

(٢) ابراهيم عبد القادر المازنى — ابراهيم الكاتب — مكتبة الشعب القاهرة ١٩٧٠

(٣) ابراهيم على الجنشب — تاريخ الأدب العربى الحاضر — الهيئة المصرية ١٩٨٤

(٤) أحمد أمين — حياتى — مكتبة الآداب القاهرة ١٩٥٢

(٥) أحمد أمين — فيض الخاطر — مكتبة النهضة المصرية القاهرة ١٩٤٩

(٦) احمد احمد بدوى — رفاعة الطهطاوى بك — لجنة البيان العربى القاهرة ١٩٥٠

(٧) احمد الشائب — دراسات فى آداب اللغة — القاهرة — ١٩٧٦م

(٨) احمد شفيق — مذكراتى فى نصف قرن أربعة اجزاء — القاهرة ١٩٣٤م

(٩) احمد عرابى باشا - كشف الستار عن سر الأسرار - مكتبة الهلال - القاهرة (ب ت)

(١٠) احمد لطفى السيد - قصة حياتى - سلسلة كتاب الهلال رقم ١٢١ القاهرة ١٩٦٢

(١١) ابن ابى اصيبعة - عيون الإنباء فى طبقات الاطباء — الهيئة ١٨٨٢م

(١٢) ابن حزم — طوق الحمامة فى الألفة والالفاف — ليدن ١٩١٤

١٣ - ابن خلدون - التعريف بابن خلدون ورحلته شرقا وغربا - مكتبة اللجنة مصر - ١٩٥١م

(١٤) اسامة بن منقذ - كتاب الإعتبار — ط برنستون مطبعة جامعة برنستون ١٩٣٠ -

(١٥) اسماعيل موسى - وحي الادباء منشورات دار بيروت ١٩٥٨م

(١٦) انور الجندي - أضواء على الأدب العربي المعاصر - مكتبة دار الكاتب العربي القاهرة ١٩٦٩م

(١٧) انور الجندي - المحافظة والتجديد في النثر العربي المعاصر - مطبعة الرسالة القاهرة ١٩٦٢م

(١٨) انور الجندي - المعارك الأدبية والاجتماعية في الادب العربي المعاصر دار الفكر القاهرة ١٩٦٠م

(١٩) انيس المقدسي - الاتجاهات الأدبية في العالم العربي الحديث دار العلم للملايين. بيروت ١٩٨٨م

(٢٠) انيس المقدسي - الفنون الأدبية دار الكاتب العربي. بيروت ١٩٦٣م

(٢١) انيس المقدسي - تطور الأساليب النثرية في الأدب الحديث - دار العلم بيروت ١٩٦٠م.

(٢٢) احسان عباس - فن السيرة - دار بيروت للطباعة والنشر بيروت ١٩٥٦م.

(٢٣) احمد فارس الشدياق - الساق على الساق فيما هو الفارياق - ط - باريس ١٨٥٥م -

(٢٤) ابن الجوزي - صيد الخاطر - دار الكتب الحديثة القاهرة - (ب ت)

(٢٥) توفيق الحكيم - زهرة العمر - مكتبة الآداب بالقاهرة ١٩٤٧م

(٢٦) توفيق الحكيم سجن العمر - مكتبة الآداب - القاهرة (ب. ت)

(٢٧) توفيق الحكيم - عصفور من الشرق - مكتبة الآداب القاهرة ١٩٣٨

(٢٩) توفيق الحكيم - عودة الروح - مكتبة الآداب القاهرة ١٩٥٧م

(٣٠) توفيق الحكيم - يوميات نائب في الأرياف مكتبة الآداب القاهرة (ب ت)

(٣١) جرجي زيدان - تاريخ آداب اللغة العربية - (ج ٣-٤) مكتبة الهلال ١٩٥٧م

(٣٢) جمال الدين الشيال - التاريخ والمؤرخون في مصر لجنة التأليف القاهرة ١٩٥٨

(٣٣) جميل صليبا - الاتجاهات الفكرية في بلاد الشام - مكتبة جامعة الدول العربية ١٩٥٨م

(٣٤) جورنيبام - حضارة الإسلام - مكتبة مصر - ١٩٥٦م

(٣٥) خليفة التونسي - العقاد دراسة ونقد مكتبة الأنجلو المصرية القاهرة (ب ت)

(٣٦) خير الدين الزركلي - الأعلام - دار العلم للملايين - بيروت ١٩٨٠م

(٣٧) أحمد حسن الزيات - وحي الرسالة - ج ٣-٤ مكتبة النهضة المصرية القاهرة ١٩٥٥م -

٣٨ - حسين الغوزي - سندباد في رحلة الحياة - دار المعارف القاهرة ١٩٦٨م

(٣٩) حسين الغوزي - لطفي السيد القاهرة ١٩٦٥م -

(٤٠) رشيد رضا المصري - تاريخ الأستاذ الإمام - مطبعة المنار القاهرة ١٩٣١م

(٤١) رفاعة الطهطاوي - تخليص الإبريز في تلخيص باريس - دار الثقافة والإرشاد القاهرة - ١٩٥٨م

(٤٢) روزنتال - علم التاريخ عند المسلمين - مكتبة المثنى - بغداد ١٩٦٣م

(٤٣) زكي المحاسني - النظرات في أدبنا المعاصر - دار القلم القاهرة ١٩٥٨م

(٤٤) سلامة موسى - تربية سلامة موسى - مؤسسة الخانجي القاهرة ١٩٥٨م

(٤٥) الشابي - مذكرات الشابي - دار التونسية للنشر ١٩٦٦م

(٤٦) شوقي ضيف - الأدب العربي المعاصر في مصر - دار المعارف القاهرة ١٩٦٨م

(٤٧) شوقي ضيف - الترجمة الذاتية - دار المعارف القاهرة ١٩٥٦م

(٤٨) شوقي ضيف مع العقاد دار المعارف بمصر - ١٩٦٤م

(٤٩) شوقي ضيف معي - دار المعارف بمصر - ١٩٨٦م

(٥٠) طاهر الجبلاوي - في صحبة العقاد - مكتبة الأنجلو المصرية القاهرة (ب ت)

(٥١) طاهر الطناحي - عصاميون عظماء من الشرق والغرب - دار الهلال ١٩٤٤م

(٥٢) طه حسين الأيام - دار المعارف بمصر - ١٩٥٥م

(٥٣) طه حسين حديث الأربعاء - دار المعارف بمصر ١٩٥٧م

(٥٤) طه حسين على هامش السيرة - دار المعارف بمصر - ١٩٦٢م

(٥٥) طه حسين - مستقبل الثقافة - دار المعارف بمصر ١٩٥٨م

(٥٦) طه حسين - الوعد الحق - دار المعارف بمصر - ١٩٥٩م

(٥٧) عامر العقاد - آخر كلمات العقاد - دار المعارف بمصر ١٩٦٥م

(٥٨) عبد الرحمان البدوي - المعث والعبقرية - مكتبة النهضة المصرية ١٩٤٥م -

(٥٩) عبد الرحمان البدوي - مؤلفات الغزالي - المجلس الأعلى القاهرة ١٩٦١م

(٦٠) عبد الرحمان الجبرتي عجائب الآثار في التراجم والأخبار - المطبعة الشرقية القاهرة ١٣٢٢م -

(٦١) عبد الرحمان الرافعي - مذكراتي - دار الهلال القاهرة - ١٩٥٢م

(٦٢) عباس محمود العقاد - أنا دار الهلال القاهرة - (ب - ت)

(٦٣) عباس محمود العقاد - سارة - دار الهلال القاهرة (ب ت)

(٦٤) عباس محمود العقاد - حياة قلم - دار الهلال القاهرة - (ب ت)

(٦٥) عبد الرحمان شكري اعترافات - الإسكندرية - ١٩١٦م

(٦٦) عبد العزيز فهمي - هذه حياتي دار الهلال القاهرة ١٩٦٣

(٦٧) عبد الغني حسن التراجم والسير - دار المعارف - مصر - ١٩٥٥م

(٦٨) عبد الكريم الأشتر - النثر المجري - مطبعة اللجنة - القاهرة ١٩٥٥م

(٦٩) عبد الكريم الأشتر - فنون النثر المجري - دار الفكر الحديث لبنان - ١٩٦٥م

(٧٠) عبد اللطيف حمزة - أدب المقالة الصحفية في مصر - دار الفكر العربي - القاهرة - ١٩٦١م

(٧١) عبد الله بن بلقين - مذكرات الأمير عبد الله - دار المعارف بمصر ١٩٥٥م -

(٧٢) عبد المحسن طه بدر - تطور الرواية الأدبية الحديثة في مصر - دار المعارف بمصر - ١٩٧٧م -

(٧٣) عبد الوهاب - التجديد في الأدب المصري الحديث - دار الفكر العربي القاهرة - ١٩٦٠

(٧٤) عثمان أمين - نظرات في فكر العقاد - المكتبة الثقافية القاهرة ١٩٦٦م .

(٧٥) عز الدين اسماعيل - الأدب وفنونه - دار الفكر العربي - القاهرة ١٩٨٣م -

(٧٦) علي أدهم - على هامش الأدب والنقد - دار الفكر العربي (ب ت)

(٧٧) علي الراعي - دراسات في الرواية العربية - المؤسسة المصرية (ب ت)

(٧٨) علي الطنطاوي - ذكريات - دار المنارة للنشر - المملكة العربية السعودية ١٩٨٥م

(٧٩) علي مبارك - الخطط التوفيقية المطبعة الأميرية ببولاق القاهرة ١٣٠٥هـ -

(٨٠) علي مبارك - علم الدين - القاهرة ١٨٨٣م -

٨١ - عمارة اليمني - النكت العصرية - القاهرة ١٩٥٥م -

٨٢ - عمر الدسوقي - دراسات ادبية - مكتبة النهضة المصرية (ب ت)

(٨٣) عمر الدسوقي - نشأة النثر الحديث وتطوره - القاهرة ١٩٧٥م

(٨٤) عمر الدسوقي في الأدب الحديث - دار الفكر القاهرة ١٩٨١م

(٨٥) الغزالي - المنقذ من الضلال - مكتبة الإنجلو - القاهرة ١٩٥٢م

(٨٦) فاطمة يوسف - ذكرياتي - دار روز اليوسف القاهرة ١٩٥٣م

(٨٧) الفيروز آبادي - مجد الدين محمد - القاموس المحيط - مصر - ١٣٤٤هـ .

(٨٨) كارل بروكلمان - المنتقى من دراسات المستشرق - لجنة التأليف - القاهرة ١٩٥٥م

(٨٩) كامل حسين محمد - في أدب مصر الفاطمية - دار الفكر العربي القاهرة (ب ت)

(٩٠) كراتشكوفسكي - حياة الشيخ محمد عياد الطنطاوي القاهرة ١٩٦٤

(٩١) محمد كرد علي - خطط الشام - مطبعة الجبل بدمشق ١٩٢٨م

(٩٢) محمد كرد علي - مذكرات - مطبعة الترقي بدمشق ١٩٤٨م

(٩٣) محمد قطب - كتب وشخصيات - مطبعة الرسالة بمصر ١٩٤٦م

(٩٤) لويس عوض - دراسات في أدبنا الحديث - دار المعرفة - القاهرة ١٩٦١م

(٩٥) لويس عوض : المؤثرات الأجنبية في الأدب العربي الحديث - القاهرة ١٩٦٢

(٩٦) مارون عبود - جدد وقدماء - دار الثقافة بيروت ١٩٥٨م

(٩٧) محمد احمد خلف الله - احمد فارس الشدياق وآثاره اللغوية
القاهرة ١٩٥٥م

(٩٨) محمد بن طولون - الفلك المشحون في احوال محمد بن طولون - مطبعة احمد عبيد
دمشق (ب ت)

(٩٩) محمد حسين - الإتجاهات الوطنية في الأدب المعاصر - دار الإرشاد بيروت
-١٩٧٠

(١٠٠) محمد حسين هيكل: مذكرات في السياسة المصرية - مكتبة النهضة
المصرية القاهرة ١٩٥١م

(١٠١) محمد حسين هيكل: زينب مكتبة النهضة المصرية القاهرة
١٩٥٩م -

(١٠٢) محمد شرقاوي - سلامة موسى المفكر والإنسان - دار الهلال القاهرة ١٩٩٨م

(١٠٣) المؤيد في الدين - ديوان المؤيد القاهرة ١٩٤٩م

(١٠٤) المؤيد في الدين - السيرة المؤيدية - دار الكاتب العربي لمصر ١٩٤٩م

(١٠٥) ميخائيل نعيمة - البعوث - دار صادر بيروت ١٩٥٩م

(١٠٦) نعمات فؤاد - دراسات في ادب الرافعي دار الفكر العربي القاهرة ١٩٥٢م

(١٠٧) ياقوت الحموي: معجم الأدباء - عيسى البابي الحلبي - القاهرة (ب ت)

(١٠٨) يحيى ابراهيم عبد الدائم: الترجمة الذاتية في الأدب العربي الحديث.
دار احياء التراث العربي بيروت (ب ت)

(١٠٩) يحيى حقي - خليها على الله - دار الكاتب العربي القاهرة (ب ت)

(١١٠) يوسف كوكن - اعلام الشعر والنثر في العصر العربي الحديث - دار حافظ
الدار البيضاء - ١٩٨٤م

(١١١) يوسف مراد - مبادئ علم النفس - دار المعارف القاهرة - ١٩٥٤م

(۱۱۲) احتشام احمد ندوی ـــــ جدید عربی ادب کا ارتقاء، فیض المصنفین حیدرآباد ۱۹۴۹ء

(۱۱۳) احمد رائف ـــــ رودادِ ابتلاء مکتبہ مرکزی اسلامی دہلی ۱۹۸۲ء

(۱۱۴) بدرالدین الحافظ ـــــ چند مصری ناول اور افسانے، مکتبہ جامعہ نئی دہلی ۱۹۸۶ء

(۱۱۵) زینب الغزالی ـــــ زندان کے شب و روز مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی ۱۹۸۸ء

(۱۱۶) صبیحہ النور ـــــ اردو زبان میں خودنوشت سوانح حیات، لکھنؤ نامی پریس ۱۹۸۲ء

(۱۱۷) عبدالحق ـــــ جدید عربی ادب، تحلیلی جائزے جواہر لال نہرو یونیورسٹی نئی دہلی ۱۹۸۶ء

(۱۱۸) عمر تلمسانی ـــــ یادوں کی امانت مدینہ پبلشنگ کمپنی نئی دہلی ۱۹۹۲ء

(۱۱۹) وہاج الدین علوی ـــــ اردو خودنوشت ـ فن و تجزیہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی ۱۹۸۶ء

(۱۲۰) اردو دائرہ معارف اسلامیہ ـ دانش گاہ پنجاب لاہور ج ۱۱ طبع اول ۱۹۷۵ء

---

(121) (1) Modern Arabic Literature 1800–1970

Joh A. Haywood Irst Edition Lund Hum.

London 1971

(122) (2) Studies in Modern Arabic Literature,

Edited by R.C. Ostle University of London 1975

(123) (3) Cassell's Encyclopaedia of Literature,

By S.H. Steinberg London Cassell (1953)

(124) (4) The New Encyclopaedia Britannica,

15th Edition University of Chicago

(125) (5) The Oxford English Dictionary,

IInd Edition V.1 Clarendon Press Oxford 1989

مجلات ورسائل

(۱) مجلۃ الرسالۃ ربیع الاول ۱۳۵۴ھ

(۲) مجلۃ "العربی" اغسطس - ۱۹۶۶ء

(۳) مجلۃ "الکتاب" ابریل ۱۹۴۹

(۴) مجلۃ المجمع العلمی الھندی - اکتوبر - ۹۱ — ۱۹۹۰

(۵) مجلۃ مجمع اللغۃ العربیۃ بدمشق ابریل - ۱۹۶۳م

(۶) مجلۃ "المجلۃ" مایو - ۱۹۶۳م

(۷) مجلۃ "الھلال" ابریل ۱۹۶۲م

(۸) مجلۃ "الھلال" یونیو - ۱۹۶۳م

(۹) فکر ونظر علی گڑھ اکتوبر ۱۹۷۰ء

(۱۰) نقوش آپ بیتی نمبر لاہور پاکستان ۱۹۶۴ء